تاریخِ الٰہ آباد

کے باتصاویر سلسلہ کی

پہلی جلد

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی

مصنفِ حیاتِ جلیل۔ آزادِ بلگرامی۔ تاریخِ قنوج۔ شاہزادہ خسرو۔
حضرتِ شہربانو۔ ہدیۂ مقبول۔ استامبول کا داستان گو۔ یا فیلسوف وغیرہ۔

۱۹۲۸ء

اسٹار پریس الٰہ آباد میں چھپی

اشاعت اول۔ دو ہزار .... قیمت چار روپیہ

الف

نواے وفا
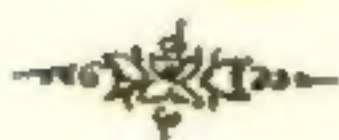
ایک الٰہ آبادی شاہزادی کے لئے

اُس کے غریب الدیار رفیق کی یادگار
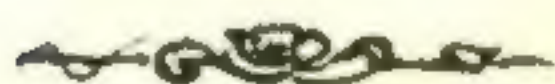
مانہ مانیم وبہ گیتی سخن از ما ماند
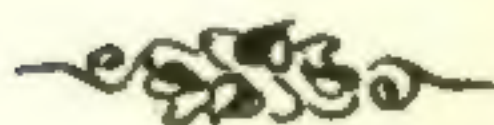
مقبول

جمعہ ۱۵ جمادی الاخری سنہ ۱۳۵۷ھ

فہرستِ اوّل

مضامین و مطالب۔ مقالات۔ نقشہ جات

(۱)

مقبول احمد

بڑے ھیں ہم - مگر ایسے بڑے بھی کم ھوں گے
کسی زمانہ کے اچھے ھمیں کریں گے یاد

الہ آباد

ہمنے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

یاد باد الہ آباد، پایندہ باد الہ آباد۔

انجام بخیر، مقبولِ نامہ سیاہ نے سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں پریاگ کی مقدس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ میں ایک نوعمر طالب علم تھا اور وہی ضرورت یا امتحان میں کامیابی کی سعی و آرزو مشرقِ ادنیٰ سے مجھے کشاں کشاں لائی تھی۔ کامیابی و ناکامی تو ایک غیر اختیاری بات تھی جس کی خوشی یا رنج اپنے اپنے وقت پر منحصر ہے۔ مگر میں اپنی ناکامی ہی کا احسان مند ہوں، جس کی بدولت مجھے ایک سال اور پڑھنے اور رفقائے قدیم و جدید کے ساتھ چندے اور بسر کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور آج بھی

چوہم عمرے بہم عمرے زمکتب شادی آید مرا بے اختیار ایام طفلی یاد می آید

تیس برس بعد، الٰہ آباد کا آب و خور اس بے نوا کو پھر یہاں کھینچ لایا۔ یہ مارچ ۱۹۱۹ء کا تیسرا ہفتہ تھا۔ موسم معتدل۔ بہار کی آمد۔ اسی ۱۸۵۹ء کے بنے ہوئے، بلند و وسیع اسٹیشن نے اپنے نئے آنے والے مہمان کے لئے دامنِ کرم پھیلایا۔ مرتفع سنگین پلیٹ فارم نے قدم چومے۔ اور بالآخر اس کو اس کی منزلِ مقصود یا مستقرِ ہنگامی تک پہنچا دیا۔ یاد ہے کہ دو تین دن بعد،

اجنبیت، تنہائی اور اپنے توحش سے متاثر ہو کر میں نے جب ایک دردمند دوست کو اپنی حالت کی اطلاع دی تھی، تو بہ تصرف مصرع اول اقبال کا یہ شعر لکھا تھا۔

کوئی ستدوں کو پوچھے تو یہ کہنا ناطق[1] نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

آباد باد الہ آباد۔ شاد باد الہ آباد۔

تو نے مجھ سی نوواردِ اجنبی کی مواسات و مدارا کی۔ بیگانہ کو یگانہ بنا لیا۔ وہ، جو کبھی مسافرانہ وارد ہوا تھا آج تیرا مہمان ہے اور عزیز۔ سولہ سترہ برس گذر جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ محض تیری عنایت و الفت کے اقتضا سے۔ وہ تیری آغوش شفقت کو اپنا موطن ثانی سمجھتا ہے۔

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب رخصت و جدائی کی گھڑی قریب آتی ہے تو جذباتِ انس و الفت اور بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ زبان تفسیدہ ہو جاتی ہے اور آنکھیں نمدیدہ۔ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا ہے پورا نہیں کہہ سکتا۔ اور جو کچھ کہہ جاتا ہے، سرگرم وداع سننے والا اُتنا بھی سننا اور سمجھنا گوارا نہیں کرتا۔

الہ آباد کے ایک قرن مسرت کے قیام میں میں نے بہت کچھ دیکھا بلکہ سب کچھ دیکھا تھا۔ بھول جانے کی باتیں تھیں، طاق نسیاں پر رکھ دیں۔ حافظہ مدد کرے گا اور یاد آ جائیں گی، تو کبھی حوالۂ قلم کر دوں گا، ورنہ، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

حسرت ہے کہ الہ آباد کی خاکِ پاک اس ازلی کوتاہ بیں کے لئے سرمۂ چشم عبرت و حیرت ثابت ہوئی۔ دانشوروں کا مقدس دامن سجادۂ عزت و امتیاز بنا۔ جزائے احسان ہو گی اگر الہ آباد کے (غیر فانی نہ سہی، لیکن) دیرپا صنادید کی کیفیت قلمبند کر جاؤں۔ عزیزانِ محترم مقبول نامقبول کا سلام لیں اور اپنے عقیدت کیش و وفاکوش کی محقر نذر یا مختصر تاریخ شہر قبول فرمائیں۔ مل لیجئے پھر ہم سے ملاقات نہ ہوگی۔

---

[1] منشی محمد عبدالغفار خان مرحوم، ناطق تخلص، رئیس تالم گنج۔

انگلستان کا فاضل زباندانِ مشرق ڈبلیو رائٹ William Wright ایک کمیاب کتاب[1] کی تصحیح و تحشیہ کے بعد جب ہولانڈ[2] اور جرمنی سے رخصت ہوا ہے تو رمز شناسِ فطرتِ عرب کا ایک شعر اس کی زبان پر تھا۔ تاریخ الہ آباد لکھنے کے بعد آج میں بھی خلوص و وداد کی اُس پرستش گاہ سے جُدا ہو رہا ہوں: جہاں عشق و محبت کے دو دریا کا ملتے ہیں۔ نہیں، جہاں مہر و وفا کے دو دریا زور سے ٹکر کھاتے اور چپہ چپہ زمین کو سیراب رکھتے ہیں۔ جہاں تازہ جان ڈالنے والی سعادت و برکت کی ہوائیں چلتی ہیں فیض و معدلت کے بادل برستے ہیں۔ علم و ادب کے چشمے بہتے ہیں۔ اس خدمت سے سرانجام ہونے سے میرا دامنِ خاطر مسرت و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہے اور میرا دل تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہے۔ اس کے ساتھ ہی فرقت و جدائی کے صدمے سے بے چین ہے۔ اور آج میری زبان پر بھی وہی شعر ہے، جو یک علمی خدمت کے انجام دینے کے بعد زندۂ جاوید رائٹ نے چلتے وقت پڑھا تھا۔

أرض يطيب فؤادي من تربتها　　شوقا لها و من فيها من الناس

[وہ سرزمین، جس کے شوق میں اور جس کے رہنے والوں کے لئے میرا مرغِ دل اپنی آرام گاہ (نشیمن) سے پرواز کے لئے تیار ہے۔]

خسرو باغ۔ اس مبارک زنجیر کی پہلی کڑی ہے۔ آپ بیان **خسرو باغ** کہہ سکتے ہیں کہ اس تاریخ کی ابتدا کی تاریخ (۱۳۵۳ھ) اسی نام سے نکلتی ہے۔ شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم۔

اوقاتِ فرصت میں میں نے یہ مضامین متفرق طور پر لکھے، اور قلمرو ہند کے دو ممتاز و موقر رسالوں "معارف" اور "ہندستانی" میں شائع کئے تھے۔ اب ان پر پھر نگاہ ڈالی اور کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ نظرِ ثانی میں بقدرِ مناسب اضافہ ہو جانا لابد تھا۔ ہوا۔

---

[1] رحلہ ابن جبیر۔

[2] ہمارے یہاں ہالینڈ بولا جاتا ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں بھی۔ مگر اہلِ زبان و اہلِ علم ہولانڈ بولتے اور لکھتے ہیں۔

ان[1] ناچیز صفحات میں اس گلزارِ ہمیشہ بہار، شاہ بیگم اور اُس کے مدفن، شاہزادہ خسرو اور اُس کے مقبرے، سلطان بہار بانو کے روضے اور تمبولن بیگم کے گنبد کے گزشتہ و موجودہ حالات یکجا ملیں گے۔ جن کی فراہمی، تلاش و تحقیق میں سعی و کاوش سے کام لیا گیا، اور حتی الوسع کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ تاخیرِ اشاعت و تکمیل مجبورانہ تھی۔

أُكَمِّلُ كُلَّ سَطْرٍ بَعْدَ شَهْرٍ　　　وَأَبْنِي كُلَّ بَيْتٍ بَعْدَ عَامٍ

طوالت و تفصیل کے لئے بھی عذرخواہی کی ضرورت نہیں۔ مسٹر ای اے ڈنکن نے کین صاحب[2] کی آگرہ ہینڈبک کے "پیش کلمہ" میں ایک امریکن سیاح کا ذکر فرمایا ہے۔ جس نے آگرہ اور دہلی کی جی بھر کر سیر کر لی تھی۔ پھر بھی اس کو شکایت تھی کہ کوئی پسندیدہ گائیڈ بک نہیں ملتی۔ اُس نے اپنا خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کی تو مجھے چنداں پروا نہ ہوگی کہ جو کچھ لکھا ہو میں سب ہی پڑھ جاؤں، لیکن اگر پڑھوں تو ضرور ہے کہ اس میں سب کچھ پاؤں۔" مجھے ندامت ہے اور افسوس ہے کہ میں اس زیرک سیاح کی آرزو اور اپنے ارادہ کو پورا نہ کر سکا۔ بہت سے حالات و واقعات و خیالات تھے جو حوالۂ قلم ہونے سے رہ گئے۔ ہر ہر قدم پر دلِ ناقہم اور دامانِ تنگ یہی سبق دیتے تھے کہ

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوز و دم درکش　　　حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

---

[1] دونوں کے یکجا ہو جانے سے تنافر کا پہلو نمایاں تھا، اس لئے مجھے اس کی ترتیب لفظی کو صحیح اور اس ترکیب کو مانوس و پسندیدہ ماننے میں تامل تھا۔ دربار فصاحت اور علمِ معانی کا یہی آئین ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جو فصیح ترین کتب آسمانی ہے الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ (آیت ۲۳۔ سورہ حشر پارہ ۲۸) دیکھ کر اطمینان ہو گیا۔ جہاں ایک جنس کے تین حرف (سین) جمع ہیں۔ اب ثقل و بے لطفی کا اعتراض یا قانونِ خوشگوئی کی خلاف ورزی کا الزام کون لگا سکتا ہے۔

[2] Keene's Hand-book for Visitors to Agra – By E. A. Duncan, C.E., F.G.S – 1909 – Calcutta.

پریاگ کی تحسین و تکریم اور سنگم کی حرمت و عظمت کے اعتراف پر مجبور ہوں۔ میرے دیندار بزرگ اور خانہ نشین طالب مجھے معذور رکھیں۔ سنگم کیسے دلپذیر و دلکش مقام کی دل آویزیوں اور دلنوازیوں کو تو اہل دل سے پوچھنا چاہئے۔ چھیڑتا ہے کوئی رہ رہ کے رگِ جاں اب تک انسانی آبادی سے دور، نور اور پرتو نور سے معور جگہ۔ ہو اور اللہ ہو کا عالم۔ جہاں نہ اذان کی آواز پہنچتی ہے نہ نعرۂ دیر کی صدا۔ کیف آور وجدبات آفریں فضا۔ انسان فریب وجد افزا تیں۔ ذوق و شوق کی گھاتیں۔ سوز و گداز، درد و نیاز کی سوغاتیں۔ حضرت عشق کی مداراتیں، ریاضت و عبادت کی گھڑیاں، دل کی چوٹیں، آنسوؤں کی لڑیاں۔ تسبیح و تہلیل کے ازلی ترانے۔ تقدیس و تمجید کے سرمدی نعرے۔ روح کی تڑپ، بیقراری۔ دل کی بے چین تمنائیں۔ جلوۂ دیدار کے لئے بے تابیاں۔ مشاہدۂ جمالِ لاہوتی کی آرزوئیں۔ اور ان سب کا وہ برق افگن "ایک" جواب جادۂ عرفان و ایقان کے ایک باخبر رہ نورد نے اسی کیف و بے خودی کی منزل پر پہنچ کر حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

اب نہ کہیں نگاہ ہے اب نہ کوئی نگاہ میں — محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی بارگاہ میں[1]

یہ کاوشیں اور کاہشیں نہیں نعمتیں ہیں اور برکتیں۔ جن کی اہمیت کا اندازہ کچھ بصیرت والے ہی کر سکتے ہیں۔ مبادا کہ ان بے معنی کلموں اور بے جوڑ فقروں سے کسی دانشمند کو یہ گمان پیدا ہو کہ میں اوروں کو بھی متاثر کرنا چاہتا اور اپنا سا خوش عقیدت بنا رہا ہوں۔ نہیں حاشا کہ نہیں۔ جانتا ہوں کہ فلاسفۂ فرنگ بھی ان کو نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ "اس قسم کا تخیل عدم کمال پر دلالت کرتا ہے" اور یہ کہ "ناقابل فہم باتوں میں ایک طرح کا تقدس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔" ہمارے مجتہدین اور فقہائے کرام کا بھی مشہور عمل اور ارشاد یہی ہے کہ کیف و کشف کی باتیں حجت قاطع اور قابلِ تقلید نہیں ہوتیں۔

اس لئے اہلِ علم و فضل کے اطمینان خاطر اور اپنے فہم و ادراک کی تقویت کے واسطے سورہ رحمٰن (پارہ ۲۷) کی انتیسویں آیت کا پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جس میں قادرِ مطلق تبارک و تعالےٰ نے ہم ناچیز بندوں کے لئے اپنے انعام اور کارآمد چیزوں اور ان پر اپنی قدرت و حکومت کا بیان فرمایا ہے۔

---

[1] سرود زندگی۔ از حضرت اصغر مرحوم صفحہ ۲۶۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ

[ترجمہ] اسی نے (اس طرح کے) دو دریا بہائے کہ آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اس سے) ایک دوسرے کی طرف بڑھ نہیں سکتے۔ تو اے جن و آدمیو! تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرو گے۔

دوسری دشواری جو مفسرین نے دو دریاؤں سے مرادیں مختلف لی ہیں اور ہر ایک کو اپنی اپنی تعبیرات و تحقیقات کے ساتھ چسپاں اور برمحل ثابت کرنا چاہا ہے۔

متقدمین کو لیجئے۔ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری[1] محدث و مورخ، جن کی تفسیر جامع البیان نہایت مستند مانی گئی ہے اور جس کو انھوں نے سو جلدوں میں پورا کیا تھا، ائمہ فن کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ دو میں سے ایک دریا تو زمین پر ہے، دوسرا آسمان پر، اور سال بھر میں ایک بار یہ دونوں مل جایا کرتے ہیں۔ ابن جریر خود بھی اسی رائے کو پسند کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ (جلد ۲۷۔ صفحہ ۷۰)۔ علمائے کرام کے ایک دوسرے طبقے کا ارشاد ہے کہ ان دو دریاؤں سے مراد بحر فارس اور بحر روم ہیں۔ اس کی تائید بھی متعدد جلیل القدر حضرات نے فرمائی ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی[2] جو مشہور متکلم اور صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، یہ مانتے ہیں کہ ایک دریا تو آب شیریں کا ہے دوسرا شور کا۔ پھر بعض وجوہ سے اس پر اعتراض بھی فرماتے ہیں۔ (تفسیر کبیر موسوم بہ مفاتیح الغیب۔ جلد ۸۔ صفحات ۱۴ و ۱۵)۔

سب سے پیشتر امام شہیر ملک ابو خالد ابن جریج[3] کی، جو تابعین، محدثین و متقدمین و فقہائے اسلام سے ہیں اور جنہوں نے اسلام میں سب سے پہلے کتابیں تصنیف کیں، اور ان کے ہم زبان و تبعین اس [illegible] کی [illegible] قائل ہیں۔ دو مختلف [illegible] ساتھ دو [illegible] جاتے ہیں۔ ایک ملکیت کا [illegible] تھا جب دوسرا [illegible] کا، جو کھاری ہے۔

---

[1] ولادت ۲۲۴ھ = ۸۳۹ء۔ وفات ۳۱۰ھ = ۹۲۳ء۔ مدفن بغداد [illegible] (۱)

[2] [illegible] وفات [illegible]۔ ولادت سنہ [illegible] = ۱۱۴۹ء۔ وفات [illegible] ۶۰۶ھ = ۱۲۰۹ء۔ [illegible] ۵۵ [illegible]۔

[3] تاریخ اسلام، جلد [illegible] موسوم بہ [illegible] اسلام صفحہ [illegible]۔ کشف الظنون از حاجی خلیفہ، جلد اول صفحہ [illegible]۔ [illegible] خطیب بغدادی [illegible]۔ [illegible] ابن قتیبہ۔

یہ اقوال جو نقل کیے گئے ہیں ذہانت وذکاوت کے کارنامے تھے یا الہامات ربانی کا پرتو۔ یہ بھی محتمل ہے کہ روم وایران کے ساتھ اُس زمانہ کے تعلقات ہمسائگی اور معلومات قرب سیبوں کا مقتضیٰ رہے ہوں۔ ورنہ اس وقت یہ سب تعبیریں یا توجیہیں جیسی دل نشین وسہل الفہم ہو سکتی ہیں ظاہر ہے۔ عجائب پسندی ونازک خیالی میں ہم کیوں پڑیں۔ جس کی تحدید وتعیین خالق کائنات وسرور موجودات نے نہ فرمائی ہو، اُس پر بحث ورائے زنی اور اپنے ناقص علم وعقل سے ہنگامہ آرائی ہم کو مناسب نہیں۔ مسلم ہے کہ ہمارے بزرگ وبرگزیدہ پیشواؤں کی نظر اپنے ہی وقت تک کی تاریخ وجغرافیہ پر تھی۔ امتدادِ زمانہ ومرورِ دہور کے ساتھ خدائے برتر ودانا کی موہبت وکرم سے تمامی علوم خصوصاً ان دونوں نے خاصی ترقی کی ہے۔ عصر حاضر کے ہم قرآن پڑھنے والوں کو بھی موجودہ جغرافیے اور اطلس پر نگاہ رکھنا لازم ہے۔ ورنہ (عبور نہ ہونے سے) قرآن حکیم کے تفکر وتدبر میں بہت سے اختلافات ومشکلات کا سامنا پڑ جائے گا۔

آلاء کے معنی عموماً 'نعمت' کے لیے جاتے ہیں لیکن علامہ ابن جریر نے بعض سلف سے 'قدرت' کے معنی بھی نقل فرمائے ہیں۔ اس لئے جس مقام پر جو معنے زیادہ چسپاں ہوتے ہوں وُہی اختیار کئے جانا چاہئے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم کیا اور ہماری استعداد وعلمی قابلیت کیا۔ کسی نوآموز طالب علم کو 'عجب العجاب' یا 'جلالین' کا سبق دے کر بہلا لینا یا بہکا دینا ہمارا بڑے سے بڑا کارنامہ ہے۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ عربستان وحجاز سے دُور بلادِ ہند کے ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے کتب بینی یا چند رسائل وصحائف کی ورق گردانی ہم کو علم وحکمت اور وقوف وخبرت کی دُنیا میں کس مرتبہ پر پہنچا سکتی ہے۔ پھر بھی کون سی آنکھ اس کو نہیں دیکھتی کہ پریاگ (الٰہ آباد) کے نیچے دو پُر زور دریا گنگا اور جمنا رواں ہیں۔ دونوں ایک ملتقے (سنگم) پر ملتے ہیں۔ مل جاتے ہیں اور پھر بھی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ایک برزخ [فصل یا آڑ] حائل رہتا ہے۔ انتہائے اختلاط واتصال پر بھی ایک دوسرے سے امتیاز وافتراق کی شان آشکار رہتی ہے۔ کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کا دسترس نہیں ہونے پاتا۔ قرآن پاک جو برکات ورحمت ایزدی کا یاد دلانے والا اور اُس کی قدرتوں کا جتانے والا ہے، اُس کے نزول کے وقت یہ انوکھی اور اچھی جگہ روئے زمین پر موجود تھی اور علم الٰہی نامتناہی اُس پر محیط تھا۔ اس لئے اُس کا ذکر فرما دیا گیا۔ مقصود اللہ جل شانہٗ کی عظمت وجبروت

اور اس عالم سفلی میں اُس کے ایک اعجوبۂ قدرت کا اعلان و اعلام تھا۔ اور ظاہر ہے کہ انسانی جبلّت ایسی چیزوں کی اطلاع و آگاہی کی طرف کس قدر راغب و مائل رہتی ہے۔

ہمارے دَور کے مشہور مفسر و فقیہ مولانا ابو محمد عبد الحق[1] دہلوی نے تفسیر فتح المنان معروف بہ تفسیر حقانی (جلد ہفتم، صفحہ ۶۰) میں میٹھی ندیوں کے ذیل میں نیل و جیحون اور دجلہ و فرات کے ساتھ ساتھ "گنگ وغیرہ" کا بھی نام لیا ہے۔ جو میرے خیال یا اس معنیٰ کا مؤید ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن[2] دیوبندی نے اس کریمہ کا ترجمہ فرمایا ہے "چلائے دو دریا چلنے والے۔ ان دونوں میں ہے ایک پردہ۔ جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے[3]"

اس آیت سے پہلے بھی کلام پاک میں بحرین کا لفظ کئی جگہ وارد ہوا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے شیخ کے ترجمہ پر فاضلانہ حواشی لکھے ہیں۔ [لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ۔ سورۂ کہف۔ پارہ سبحٰن الذی (۱۵)] کے البحرین کی نسبت فرماتے ہیں کہ بعض افریقہ کے دو دریا مراد لیتے ہیں۔ بعض بحرِ فارس اور بحرِ روم تجویز کرتے ہیں۔ مجمع البحرین کو وہ جگہ بتاتے ہیں جہاں دجلہ و فرات خلیج فارس میں گرتے ہیں[4]۔ حضرت موسیٰ کے قرب اور تعلقات کے لحاظ سے یہ موقع زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آگے چل کر وَهُوَ الَّذِىْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ (سورۂ فرقان، پارہ ۱۹) کے بارہ میں دو معتبر عالمانِ بنگالہ کی شہادت پر بحوالۂ بیان القرآن نقل فرماتے ہیں کہ "اراکان سے چاٹ گام تک دریا کی شان یہ ہے کہ اس کی دو جانبین بالکل الگ الگ نوعیت کے دو دریا نظر آتے ہیں۔ ایک کا پانی سفید ہے ایک کا سیاہ..... دونوں کے بیچ میں ایک دھاری سی برابر چلی گئی ہے جو دونوں کا ملتقیٰ ہے۔" اسی طرح باریسال کے بعض طلبہ کے حوالہ سے ضلع مذکور میں دو ندیوں کا ایک ہی دریا سے نکلنا "ایک کا پانی کھاری اور کڑوا، دوسرے کا شیریں و لذیذ ہونا" بیان کرتے ہیں۔ خود اپنے سفرِ ڈابھیل سملک ضلع سورت (ملکِ گجرات) کے قریب بروایت ثقات دس بارہ میل کے فاصلہ پر سمندر کے ایک عجیب و غریب قسم کے جوار بھاٹے کا حال تحریر فرماتے ہیں[5]۔

---

[1] ولادت ۱۲۶۷ھ = ۱۸۵۰ء۔ وفات ۱۳۳۳ھ = ۱۹۱۵ء۔ [2] متوفی ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ۔

[3] مطبوعہ مدینہ پریس بجنور، صفحہ ۸۴۹۔ [4] صفحہ ۹۷۴۔ [5] صفحہ ۵۸۱۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض تقلیدی تعبیریں متصور ہوں گی، بعض شخصی رائیں کہی جائیں گی، جن کا ماحصل تمام تر تمثیل و تشبیہ یا عوام کی سہولت فہم کے لئے نظائر و امثال کا فراہم کرنا ہے۔ لیکن میرا مقصود ان اقتباسات کے پیش کرنے سے اسی قدر ہے کہ جب ہمارے بیش آگاہ وسیع النظر روشن خیال علمائے حال نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے دریاؤں اور مقاموں کا نام لینا شروع کر دیا ہے تو عجب نہیں کہ کسی وقت سنگم بھی وہی ملتقی البحرین مان لیا جائے۔

یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ جو حضرات خارزار علم و خبرت میں اپنی آبلہ پائی کے شاکی ہوں یا تحقیق و تدقیق کے وادی میں قدم رکھنے سے ڈریں براہ کرم دخل در معقولات نہ فرمائیں۔ اُن کے لئے یہی سبق کافی ہے۔

آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ حاملِ فقہ نہیں، واقفِ تفسیر نہیں

ابوالفضل علامی نے قلعۂ آگرہ کی نسبت جو کچھ لکھا تھا وہ الٰہ آباد کی شان میں حرف بہ حرف بلکہ دو دریاؤں کے جمع ہونے سے دوگونہ صادق آتا ہے یعنی "واز دریائے جون کہ باب و ادب پائے قلعہ بوسیدہ می گزرد چہ نویسد کہ آبروئے ہفت اقلیم است۔

بادِ وے از آب نگارندہ تر آبِ وے از باد گوارندہ تر"

ہندوستان کے آثار، خصائص و فضائل اور محاسن و شرائف، نیز یہاں کی اکثر نعمائے الٰہیہ کے متعلق علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی[1] نے ایک مبسوط و مدلل کتاب سُبحَۃُ المَرجَان عربی میں تحریر کی تھی[2] جس کا اُردو ترجمہ کسی ہندو والی ریاست کی فرمائش سے مولوی شمس الدین کے قلم اور منشی نولکشور کے مطبع سے ہو کر ۱۸۷۰ء میں مظہرِ آدم کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور قابل مطالعہ ہے۔

اہل مصر نے بھی گنگا کی بزرگی اور اُس کے منافع و فوائد کا ذکر کیا ہے[3]۔ امہات مدن الھند کے ذیل میں الٰہ آباد کی نسبت تحریر ہے[4]: علی ملتقی الگنج بالجمنا و ھما نہران مقدسان ولذالک یؤمھا کثیرون الحجیج۔ (الٰہ آباد جمنا کے ساتھ گنگا کے ملنے کی جگہ پر واقع ہے۔ اور یہ دونوں دریا مقدس ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں حاجی بہت آتے ہیں۔

---

[1] ولادت، صفر ۱۱۱۶ھ مطابق جون ۱۷۰۴ء۔ وفات ۱۲۰۰ھ یعنی ۸۶ سال۔ مدفن روضہ، خلد آباد دکن۔
[2] مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۳ھ۔ [3] دروس الجغرافیہ جزو اول، مؤلفہ پروفیسر محمد ثابت، مطبعۃ الرحمانیہ مصر، صفحہ ۵۰۔ [4] ایضاً صفحہ ۹۷۔

تعارُف

مغلوں کے زمانہ میں بادشاہ زادے عموماً سلطان کہلاتے تھے۔ اسی لئے شاہزادہ خسرو بھی "سلطان خسرو" کہلاتا ہے۔ وہ شہنشاہ جہانگیر کا بڑا بیٹا ہے۔ پورامبیر کی راج دولاری راج کماری رانی مان بائی (مخاطب بہ "شاہ بیگم") کے بطن سے تھا۔ اکبر اعظم کے سے نامور دادا کے سایۂ شفقت میں پرورش و تربیت پائی تھی۔ دربار شاہی میں مرزا راجہ مان سنگھ اُس کا ماموں، اور خان اعظم مرزا کوکلتاش اُس کا خُسر، دو زبردست حامی و معاون موجود تھے۔ جہانگیر کو محروم کر کے خسرو کو تاج و تخت دلانے کا ولولہ دونوں کے دلوں میں موج زن تھا۔ یہ تو اکبر کو بھی کبھی کبھی ماننا پڑتا تھا کہ باپ سے زیادہ بیٹا فرماں روائی کی استعداد و قابلیت رکھتا ہے[1]۔ اس کے فیصلہ قطعی اور اعلان کے موقعے بارہا پیش آئے مگر ٹلتے رہے۔ بالآخر تقدیر آلہی نے کارفرمائی فرمائی۔ جب وقت آیا تو جہانگیر آگرہ میں تخت پر بیٹھا۔ اُس نے شاہزادہ اور اُس کے واسطہ داروں کی استمالت و دلداری اور عزت افزائی میں حتی الوسع دریغ نہیں کیا مگر جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ خسرو اپنے بندی خانہ یعنی قلعۂ آگرہ کے شاہ برج سے بھاگا۔ بغاوت کی۔ بادشاہی فوجوں نے تعاقب کیا۔ لاہور پہنچ کر مقابلہ ہوا۔ بیٹے نے شکست کھائی۔ گرفتار ہوا۔ مدۃ العمر قید و بند میں رہا۔ کبھی پدری شفقت کا دریا لہرانے لگتا۔ کبھی سیاست کا جذبہ غالب آجاتا۔ انھیں شدائد و مصائب میں وہ اپنی زندگی اِس حبس میں گزارتا رہا۔ چھوٹے بھائی شاہجہاں کی تمام تدبیریں اور سازشیں خسرو کو پامال کرنے اور راستہ سے ہٹا کر تخت پر پہنچ جانے کی کارگر و کامیاب نظر آنے لگیں۔ خرم مہم دکن پر بھیجا گیا۔ خون کے جوش اور مہر و محبت کے دعوے اور دردسری و برداشت

---

[1] میر غلام حسین خان طباطبائی، سیر المتاخرین میں لکھتے ہیں۔ "اکبر در زمانِ رحلت ہم فرمودہ بود کہ شاہزادہ سلیم عیش دوست است، قابلیت سلطنت ندارد۔ سلطان خسرو پسرش بجمیع خوبی آراستہ و قابل سلطنت است" (صفحہ ۱۷۹) ٹیرو ڈیلاویلی کے سفرنامۂ ہندوستان، شائع شدہ ۱۶۶۳ء، جلد اول صفحہ ۵۵ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

کے حیلے سے پابزنجیر بڑے بھائی کو ساتھ لے کر چلا۔ خسرو کا انجام سب کے پیش نظر تھا۔ محلات شاہی اور بیگمات میں کہرام برپا ہوا۔ اُمرائے دربار و اراکین سلطنت حزین و غمگین خاموش کھڑے تھے۔ بیست جہانگیر کی صرف آنکھیں نہیں، کان بھی نہ تھے۔ بے کس و بے بس، اسیر قفس خسرو دکن میں اپنے صاحب تقدیر باتدبیر، قوت بازو، شاہ جہاں کے حکم و اشارہ سے ہلاک کر دیا گیا۔ زمانہ ساز و زمانہ شناس مورخ قولنج کا درد اور قضائے الٰہی کی مشیت بتاتے ہیں۔ ممالک غیر کے سیاح کچھ اور لکھتے ہیں۔ مجھ سے جو کچھ تحقیق ہو سکا، شاہزادۂ خسرو کے تذکرہ میں مفصل حوالہ قلم کر دیا ہے۔ نعش برہان پور (دکن) میں سپرد خاک کر دی گئی۔ چھ مہینہ بعد جہانگیر کے حکم سے نکالی گئی۔ نتیجۂ تحقیقات و تفتیش کے بارہ میں سب خاموش ہیں۔ الزامات و شبہات ثابت ہوئے، یا رفع کر دیے گئے۔ دیکھ بھال کی گئی، جراحی اور تشریح اعضا بھی عمل میں آئی ہوگی۔ پھر براہ آگرہ جنازہ الہ آباد بھیج دیا گیا۔ فرسودہ و بوسیدہ ہڈیوں نے ماں (شاہ بیگم) کی آغوش محبت یا قبر کے قریب جگہ پائی۔ خسرو باغ آج بھی انھیں دونوں کی بدولت آباد ہے اور مظلوم شاہزادہ کا نام روشن کر رہا ہے۔

مرحوم دل بھی کیا تھا، کیا حسرتیں تھیں اُسمیں اب تک کچھ اُس کی باتیں میری زبان پر ہیں

خسرو باغ

بیابانِ محبت، دشتِ غربت بھی، وطن بھی ہے ۔۔۔ یہ ویرانہ قفس بھی، آشیانہ بھی، چمن بھی ہے

اس گرۂ آب و گِل کے جس زندان خانہ میں شاہزادہ خسرو کا پیکرِ خاکی اس وقت محفوظ ہے، وہ اکبر کے مشہور و بے نظیر قلعہ سے ایک کوس پچھم واقع ہے۔ شہر الٰہ آباد میں آبادی سے بعض سمت ملا ہوا اور بعض سمت جُدا، ایک نہایت وسیع و پُر فضا فرحت افزا باغ ہے، جس کو جاننے والے "خسرو باغ" کے نام سے جانتے اور پکارتے ہیں۔ وجہ تسمیہ کسی اہلِ قلم نے نہیں لکھی۔ خواہ اس وجہ سے کہلاتا ہو کہ خسرو کی ماں وہاں دفن ہوئی، یا خسرو نے اپنی غمناک واندوہگیں زندگی کے کچھ دن کبھی یہاں کاٹے ہوں، یا اس سبب سے کہ سوا تین سو برس سے یہ باغ خسرو کی دائمی خوابگاہ ہے۔

اونچاس سال ہوئے جب میں اس باغ کو پہلے پہل دیکھنے گیا تھا۔ اس کے متعلق تاریخی سرمایہ فراہم کرنا چاہا تو ان پیرانِ گم راہ سے بھی، جو پنڈا یا گائڈ کہلاتے ہیں، معلومات حاصل کرنا چاہیے۔ ارشاد ہوا کہ یہ جگہ بہت پُرانی ہے، پراچین زمانہ کی۔ پہلے یہاں پراگ جی مہاراج کا مندر تھا، جنھوں نے یہ شہر بسایا ہے۔ ایک طالب علم کی تشفی و طمانیت کسی کتابی سند کے بغیر دشوار تھی۔ دوسرے یہ تو اُن برگزیدہ لوگوں کی جماعت تھی، جن کی فضول گوئیوں اور حاضر جوابی کے مسٹر فنچ بھی سو برس پہلے شاکی نظر آچکے تھے[1]۔ اس لئے ورق گردانی شروع ہوئی۔

مطالعہ و تحقیق کے دوران میں جنرل کننگھم General A. Cunningham کی رپورٹ محکمۂ آثار قدیمہ[2] سے پتہ چلا کہ پراگ دراصل ایک برہمن کا نام تھا، جو اکبر بادشاہ کے عہد میں گزرا ہے۔ وہ ایک بے حقیقت و کم مایہ شخص تھا۔ اس کی یا اُس کے نام کی شہرت کا راز صرف اس قصے میں مرکوز و مذکور ہے کہ جب اکبر نے حکم

۱؎ سفرنامہ بالائی ہند، ۳۸ اور ۳۹ صفحہ ۔ نیز ڈکنن وکین صاحبان کی آگرہ ہینڈ بک، صفحات ۲۳، ۲۱۹، ۱۳۳ و ۱۳۵ ۔

۲؎ ڈاکٹر فوہرر صاحب کے آثار قدیمہ صفحہ ۷۰، محکمۂ آثار قدیمہ کا اب ان قدیم مدعیانِ خدمت گزاری کو خسرو باغ سے برطرف کردینا ایک مستحسن کارنامہ ہے ۔ ۳؎ صفحۂ آئندہ پر ۔

سے قلعہ کی تعمیر شروع ہوئی تو سمتِ دریا کی دیواریں بار بار بنائی جاتیں اور گر جاتی تھیں تمام تعمیرات کی کوششیں بے کار ثابت ہوئیں، تو بعض واقف کار و دانشمند لوگوں کے مشورہ و صوابدید سے بادشاہ کو اطلاع کی گئی کہ جب تک بنیاد میں کسی انسان کا خون بھرا نہ جائے گا بنیادیں قائم نہیں رہ سکتیں۔ چنانچہ اعلان عام کیا گیا۔ اور ایک برہمن جس کا نام پریاگ تھا، بخوشی خاطر از خود سامنے آیا، اور اپنی جان اس شرط پر نذر کی کہ قلعہ کا نام اُس کے نام پر رکھا جائے۔

آیندہ سلسلۂ روایات و تحقیق میں یہ بھی کھل جائے گا کہ پریاگ کی آبادی یا تیرتھ گاہ، اکبر اعظم کی آمد اور قلعۂ الہ آباد کی تعمیر بلکہ تجویز سے بہت پہلے سے موجود تھی۔

سر ہنری ایلیٹ کی بحث و تحقیق جو الہ آباد کی قدامت کے متعلق اُن کی کتاب "سپلی منٹل گلاسری" Elliot's Supplemental Glossary میں مندرج ہے، [۱] مندرجہ اس واقعہ کی تردید کرتی ہے۔

انگلستان کا مشہور جوہری اور جہاندیدہ سیاح ٹیورنیر Tavernier جو دسمبر ۱۶۶۵ء میں الہ آباد آیا تھا[۲] اور یہاں کی بہت سی باتیں، اچھی بری کہہ گیا ہے "اس بارہ میں کیوں خاموش ہے؟ مسٹر فرگوسن Fergusson اس تردید کی تردید کیوں نہیں فرماتے؟

اس قسم کی زبانی روایات کی لغویت کا ثبوت ایک اور ملتا ہے:۔

سر ولیم سلی مین Sir William Sleeman نے ایک موقع[۳] پر دعویٰ کیا تھا کہ "اس ملک میں مسلمانوں نے جیسے ہی قدم رکھا اور اپنی وسیع فتوحات کا دائرہ پھیلایا تو ہندوؤں کے شہر ویران اور اُجاڑ ہونے لگے"۔ مگر اس کا شافی جواب خود انھیں کی کتاب کے مرتب اور مصحح ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ

صفحۂ گذشتہ کا عـــ ذکر تریبونی کی رپورٹ بابت ۱۸۶۲-۶۳ء، حصہ اول، صفحہ ۳۰۰۔ Archaeological Report, Part I, by Major. General A. Cunningham, C.S.I

ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، جلد ہشتم، صفحہ ۱۴۱۔ [۱] صفحہ ۲۴۹۔ [۲] بحوالہ سیاحت نامہ و تذکرہ سلی مین، حصہ دوم، صفحہ ۲۲۵۔ [۳] ریبلس اینڈ ری کلکشنس، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱۔ Rambles and Recollections

Vincent Smith نے اُسی جگہ دے دیا تھا۔ وہ اپنے نوٹ[1] میں لکھتے ہیں کہ "یہ بیان بہت زیادہ عمومیت رکھتا ہے۔ بنارس، الٰہ آباد (پریاگ) اور بہت سے اور بڑے بڑے قصبے اور اہم شہر ہندوؤں کے تو کبھی ویران نہیں ہوئے، باوجود تمام انقلابات کے آباد و بارونق، قائم رہے ہیں۔ صحیح اسی قدر ہوگا کہ خاص خاص مندر اکثر مقامات پر ضائع یا خراب کر دیے گئے اور زیادہ تر مسجد بنا دیے گئے تھے۔"

بہ ہیں کرامتِ بُت خانۂ مرا اے شیخ　　　کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

اس جگہ مندر یا کسی پرانی عمارت کا کوئی نشان پایا نہیں جاتا۔ بخلاف اس کے یہ واقعہ پیشِ نظر آجاتا ہے کہ یہ عہد تو اکبر کا تھا، جس نے مسٹر نویل Mr H R Nevill. I.C.S اور اُن کے گزیٹیر (سلسلۂ جدید، ۱۹۱۱ء[2]) کی روایت کے بموجب "الٰہ آباد کے پرانے مندروں کو بھی قائم رکھا، کوئی دست اندازی نہیں کی، اور قلعہ بھی تعمیر ہوگیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی نمایاں اور قابلِ تقلید مثال اس نیک نفس بادشاہ کی مذہبی رواداری اور اعتدال پسندی کی کیا ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر فوہرر Dr. A Führer کی روایت سے بھی اس کی پتہ اصلیت پائی نہیں جاتی۔ وہ لکھتے ہیں[3] کہ "اکبر نے یہاں قلعہ بنایا، شہر بسایا، الٰہ آباس نام رکھا، جو بعد کو الٰہ آباد ہوگیا۔ ورنہ پریاگ پرانا نام اور پرانا مقام ہے۔ مشہور سیاح ہیون تسانگ[4] Hiouen Thsang جو ساتویں صدی میں آیا تھا، یہی نام لکھتا ہے[5] جو بگمان غالب اشوک[6] کے وقت سے چلا آتا ہے۔"

---

[1] نوٹ ذیلی، صفحہ بالا۔ [2] صفحہ ۲۱۱۔ [3] District Gazetteer, Allahabad ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے صنادید قدیمہ اور ان کے کتابے صفحہ ۱۲۰۔ [4] اس نامور شخص کی سیاحت ۶۲۹ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس نے ہمارے ملک کی ہر چیز کو غور و احتیاط سے دیکھا ہے۔ اور اُس زمانہ کے زاویہ نظر اور نقطۂ نگاہ کے مطابق ضروری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ فاضل مورخ الفنسٹن Elphinstone نے اپنی تاریخ کے ضمیمہ ۹، جلد چہارم میں اس کے مفصل حالات تحریر کیے ہیں۔ نیز اکثر اہلِ قلم نے۔ پرانے ڈسٹرکٹ گزیٹیر کا صفحہ ۱۳۲ بھی قابلِ طلب ہے۔ [5] مختصر تاریخ اہلِ ہند، مولفہ ڈاکٹر ہنٹر، صفحہ ۲۰۔ [6] ہندوستان کا مشہور منتظم فرمانروا اشوک جنابِ مسیح سے دو سو چالیس سال بیشتر گزرا ہے۔ اس کا ہم عصر انطاکیوس (انٹی اوکس Antiochus) تھا۔ (صفحہ ۱۳۲ مذکورہ)۔

مسٹر سی ڈی اسٹیل C. D. Steel پرانے ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں تحریر فرماتے ہیں[۱] کہ "الہ آباد کا موجودہ نام اکبر نے رکھا تھا اُس وقت تک اس کا نام پریاگ چلا آتا تھا۔ یہ نام غالباً پورو نے رکھا تھا، جو بودھ کی نسل سے چھٹویں پیڑھی میں تھا۔ مشہور ہے کہ اسی نے پُرانے شہر کی بنیاد حضرت عیسٰی سے اکیس صدی پیشتر ڈالی تھی۔" اور یہ کہ "الہ آباد کی سب سے پُرانی تاریخ پریاگ مہاتم Prayag Mahatmya آج بھی موجود ہے۔[۲]"

بایں ہمہ مسٹر ولسن Wilson کو اختلاف ہے۔ اپنی کتاب "ہندوستان[۳]" میں فرماتے ہیں کہ "جب تک اکبر نے اس کو شہر نہیں بنایا، الہ آباد یا پریاگ کوئی شہر نہ تھا۔" موصوف کا خیال شاید اکبر نامہ کی طرف نہیں گیا، جس سے "قصبۂ پیاگ" کی موجودگی ثابت ہوتی ہے[۴]۔ طبقات اکبری نے، جو اکبر کے عہد اور اُس کے جلوس کے اڑتیسویں سال تک کی نہایت معتبر و چشم دید تاریخ ہے، کم از کم دو جگہ پیاگ کا نام لیا اور جائے وقوع بتائی ہے[۵]۔ اور پریاگ تو وہ مشہور تاریخی مقام ہے جہاں قنوج کا مہاراجہ ہرش وردھن مذہبی میلے اور اجتماع کیا کرتا تھا۔ یہاں کی کانفرنس مصالحت (۱۹۳۲ء) میں مہاراجہ صاحب اُوڑ نے اپنی اسپیچ (تقریر) میں فرمایا تھا کہ "الہ آباد کا پُرانا نام 'پریاگ' ہے وہ سنسکرت کے لفظ پراگ سے نکلا ہے، جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ اس سے پہلے اس شہر کا نام کوسم نگری تھا۔ رام کے سب سے بڑے بیٹے کُش نے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔" شیخ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "پیاگ۔ امروز بہ الہ باس روشناس واز ہر عرف نا بست کردہ نیایش گاہ داند عنوان بزرگ پرستش کدہ است[۶]۔"

ان سب سے قدیم تر، جہانگرد و نامور فیلسوف و حکیم، ابوریحان محمد بن احمد بن محمد بیرونی خوارزمی [مابین ۳۶۲ و ۴۲۹ھ مطابق ۹۷۳ و ۱۰۳۸ء] گزرا ہے۔ جس کی جامع علوم و فنون کتاب "عجائب الہند" کا زمانہ نو سو برس سے زائد (۱۰۳۰ء کے قریب کا) قرار دیا جاتا ہے، پریاگ اور اس کے قدیم و عظیم درخت

---

[۱] مطبوعہ ۱۸۸۱ء جلد ہشتم، صفحہ ۱۶۱۔ [۲] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۰۰۔ [۳] تھیٹر اول، Theatre I صفحہ ۲۰۷۔ [۴] جلد دوم، صفحات ۳۲۵ و ۳۷۳۔ [۵] صفحات ۳۵۹ و ۲۸۰۔ [۶] آئین اکبری مطبوعہ نولکشور، صفحہ ۱۴۷، جلد سوم۔

"وٹ" کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اس درخت کو مرکز مستقل مان کر بعض مقامات کا فاصلہ فرسخ کے حساب سے (فرسخ چار میل یا ایک کروہ) بتاتا ہے۔ اُس جگہ کا بھی حوالہ دیتا ہے جہاں جون (جمنا) کا پانی گنگا سے مل جاتا ہے۔ اور جہاں ہندو طرح طرح کی ریاضتیں اور مشقتیں خود برداشت کرتے ہیں۔ اُن کا کسی قدر صراحت کے ساتھ اُس نے ایک باب میں بیان فرمایا ہے۔ اس بڑے درخت "وٹ" اس کی ٹہنیوں اور زمین بوس شاخوں کی نسبت بھی لکھا ہے۔[1]

کچھ دن ہوئے ایک ممتاز دانش آموز نے الہ آباد اور الہ باس کی بحث ایک کثیر الاشاعت مقامی اخبار میں چھیڑی تھی[2]، اور اپنی نازک خیالی اور بلند نظری کے ساتھ اس کو بڑھانا چاہا تھا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، اہل علم نے اعتنا نہیں فرمایا اور ساکت رہے ہیں بھی اس کو ترد دیا سمجھتا رہا ہوں۔ تاہم یہ قضیہ رہ رہ کر سامنے آجاتا ہے۔ کئی سال ہوئے ایک خوش طبع انشا پرداز نے الہ آباد کے متعلق کچھ شذرات لکھتے ہوئے ظریفانہ انداز میں یہ فرمایا تھا کہ "ان حضرات (عمائد شہر) نے بادشاہ (راجا؟) الا کا ذکر نہیں کیا، جو الہ آباد ALLAHABAD کا داستانی بانی ہے۔ وہ جس کو مسلمانوں کی فتح کے بعد بگاڑ کر اللہ آباد بنالیا گیا ہے۔[3]

یہ قصہ آج کا نہیں، بہت پرانا ہے۔ خلاصۃ التواریخ[4] میں مرقوم ہے کہ اکبر نے قلعہ تعمیر کرایا الہ باس نام رکھا۔ شاہ جہاں نے الہ آباد کر دیا۔ مسٹر بیل Beale اکبر نامہ شیخ ابوالفضل کے حوالے سے مفتاح التواریخ میں راوی ہیں کہ یہ شہر الہ آباد، آباد ہو گیا تو الہ باس[5] نام رکھا گیا۔ دوسرے موقع پر نقل کرتے ہیں[6] کہ قلعہ الہ آباد کی بنیاد رکھی گئی۔ الہ باس نام قرار پایا، شاہجہاں کے عہد میں الہ آباد مشہور ہوا۔ غالباً ان کی سند خلاصۃ التواریخ کی تحریر ہے۔ میر غلام حسین خان طباطبائی کے الفاظ "شہرے بتازگی

---

[1] اصل عربی مطبوعہ لندن ۱۸۸۷ء، صفحات ۹۰ و ۲۴۰ و ۳۱۶۔ ترجمہ انگریزی از ڈاکٹر ایڈورڈ سخاو (جرمنی) مطبوعہ لندن ۱۹۱۰ء، جلد اول، صفحہ ۹۰۔ و جلد دوم، صفحات ۲۴۰ و ۳۱۶۔ [2] اخبار لیڈر مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔ [3] اخبار لیڈر مرقومہ ۳ اگست ۱۹۳۵ء روز شنبہ، صفحہ ۸۔ [4] قلمی موجودہ کتب خانہ مولوی حکیم سید منظور احمد مرحوم، واقع قصبہ صمدن، ضلع فرخ آباد۔ [5] صفحہ ۲۵۲، طبع اول ۱۸۶۸ء۔ [6] صفحہ ۲۸۵ طبع اول۔

احداث فرمودہ الہ باس نام گزاشت"[1] اسی کی صدائے بازگشت ہیں۔

شمس العلما آزاد دہلوی دربار اکبری میں فرماتے ہیں کہ "خلاصۃ التواریخ کا لکھنے والا ہندو ہے" (صفحہ ۵۱۹)۔ پھر لکھتے ہیں کہ "بٹالوی صاحب خلاصۃ التواریخ سے تعجب ہے کہ ملک پنجاب میں بیٹھکر کتاب لکھی اور شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ پایا" (صفحہ ۵۳۲)۔ "یہ اکبر کی جدت پرستی اور ہند پسندی تھی کہ منشیان دفتر الہ آباد کو بھی الہ باس لکھتے تھے۔" (صفحہ ۸۰)۔ "وہ اس سے پیشتر لکھ چکے تھے کہ ۴۲ سنہ جلوس میں عمارت کا کام ختم ہو تھا۔ پھر وہ الہ آباد سے الہ باس ہوگیا۔"[2]

آپ نہ لالہ سجان رائے بھنداری "منتخب اللباب" سرکاری کے قول پر معتمد ہیں نہ جناب آزاد کے بیان پر۔ بلکہ خود اکبر اور اس کے ارکان حکومت اور مقربین عالی منزلت کے طریق عمل پر نظر ڈالیں جب یہاں قلعہ بنا اور شاہزادوں اور امرائے دولت کے لئے محلات و قصور تعمیر ہوئے تو ٹکسال بھی قائم ہوئی۔ اسی ٹکسال سے اکبر کے الہ آباد نام رکھنے کا ثبوت ملتا ہے جس کے سکوں پر شریف سرہدی کا یہ شعر مقبول ہوکر منقوش ہوا تھا۔[3]

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد   بہ شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

میرے نزدیک یہ بھی کوئی حجت قاطع نہیں ہو سکتی۔ مسٹر وائٹ ہیڈ R. B Whitehead کے قابل قدر مقالہ "ہندوستان کے مغل شاہنشاہوں کے ٹکسال والے شہر" سے واضح ہے کہ برٹش میوزیم میں جہاں الہ آباد کا سکہ موجود ہے، وہاں اسی عہد اکبری کا اسی عجائب خانہ میں ایک سکہ AE دارالضرب الہ باس کا بھی محفوظ ہے جو ۱۸۹۲ء میں داخل ہوا تھا۔[4]

اکبر کے عہد میں اس نام (الہ آباد) کے مقبول عام ہونے کا ثبوت یک اور ملتا ہے۔ رمضان ۱۰۰۹ھ (مارچ ۱۶۰۱ء) میں اکبر نے برہان پور و آسیر (ملک خاندیس) فتح کیا تو عادل شاہ کی تعمیر[5] جامع مسجد واقع برہان پور کے عقبی مینار پر میر محمد معصوم نامی تخلص مشہور درباری شاعر اور خطاط نے یہ کتبہ لگایا:۔

"تاریخ آنچہ عبارت است از زمان جلوس حضرت شہنشاہ ظل اللہ اکبر پادشاہ غازی کہ بتائید جوان بخت خویش قلعہ آسیر کشاد۔"

---

[1] سیر المتاخرین، طبع الہ آباد، صفحہ ۱۳۹۔ [2] دربار اکبری، صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳۔ [3] دربار اکبری، صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳۔ [4] حیات جلیل، مؤلفہ مقبول، جلد دوم، نوٹ نمبر ۱۰۲، صفحہ ۱۲۸، مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔ [5] صفحہ ۲۲۹، رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (سلسلہ جدید) جلد ہشتم نمبر ۲ بابت ۱۹۱۲ء۔ [6] سنہ ۹۹۷ھ = ۱۵۸۹ء۔

گشت آباد اسیر ازاں نامی   سنہ بششش بگفت الہ آباد"۔ بلے..

سال الہی خلد اللہ آباد الہ سے الہ کے معنی اور الہ آباد کی مناسبت روشن ہوجاتی ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ الہ اور اللہ میں لفظاً و معناً کوئی فرق نہیں۔ سامی زبان کی تمام شاخوں میں ا، ل، اور ہ کا مادہ کسی نہ کسی ترکیب سے معبودیت کے لئے استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ کلدانی اور سریانی کا "الاہیا" عبرانی کا "اوہ" عربی کا "الہ" سب اسی سے نکلے ہیں یہی "الہ" حرف تعریف (الْ) کے اضافہ کے ساتھ اللہ ہوگیا۔ جو اسم ذات کے طور پر خدا کے لئے مستعمل ہوتا آیا ہے۔ اسکی کسی خاص صفت کے لئے نہیں بولا جاتا۔ اللہ کے لغوی معنی کے بارہ میں علمائے لسان و اشتقاق فرماتے ہیں کہ اس کی اصل "اَلَہ" یا "وَلَہ" ہے۔ اَلَہ اور وَلَہ تحیّر و درماندگی کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پروردگار عالم و عالمیان کے متعلق جو کچھ ہم جانتے، یا سمجھتے، یا جان سکتے ہیں، وہ عقل کی نارسائی اور فہم و ادراک کے تحیّر کے سوا اور کیا ہے۔

رہی الہ باس یا الہ آباس یا الہ آباد کی بحث ہمارے زمانہ میں تو یہ شہر تمام غیر زبانوں اور ایشیا کے اکثر ممالک میں الہ آباد ہی کے نام سے شہرت پا گیا ہے۔ عرب و مصر کے جغرافیوں کو دیکھئے۔ ان میں ہم کو عربی املا اور نحوی ترکیبات کے لحاظ سے "اللہ باد" اور "اللہ آباد" ہی لکھا ملتا ہے۔ پروفیسر محمد ثابت مصری کے الفاظ پہلے نقل کر چکا ہوں[۲] جو دو جگہ اللہ باد[۳] لکھتے ہیں تو ایک جگہ اللہ آباد[۴]۔ وہاں کے ایک اور ممتاز جغرافیہ نویس نے بھی "اللہ آباد" ہی لکھا اور یہاں کی شہرت و استحکام، دریاؤں کے ملنے کی جگہ، تقدس، غلہ اور روئی کی وسیع تجارت، یونی ورسٹی، اور بہت سی ریلوے لائنوں کے اتصال کا ذکر کیا ہے[۵]۔

ہندوستان کی پرانی تاریخوں اور تحریروں میں "الہ آباس" اور "الہ آباد" دونوں ملتے ہیں۔ شمار کے اعتبار سے الہ باس زیادہ، الہ آباد کم۔ آئین اکبری میں ٹکسال کا نام الہ باس[۶]، صوبہ کا نام

---

[۱] صفحہ ۲۹، رسالہ نگار، نمبر ا جلد ۱۶، جولائی ۱۹۲۹ء۔ [۲] صفحہ ۱ کتاب ہذا۔ [۳] دروس الجغرافیہ، جزو اول، صفحہ ۴۷۔ [۴] ایضاً صفحہ ۹۰۔ [۵] الجغرافیۃ الحدیثہ تالیف احمد حافظ، جزو ثالث، مطبعہ سعدیہ قاہرہ، صفحہ ۳۴۷۔ [۶] مطبوعہ منشی نولکشور، جلد اول، صفحہ ۱۹۔

الہاباس، سرکار کا نام الہاباس، حویلی کا نام الہاباس ملتا ہے؛ محال جلال آباس، جو شاید شاہی لقب جلال الدین سے منسوب ہو۔[1] لیکن آگے چل کر وہی صوبہ الہ آباد، اور شہر بھی الہ آباد ہو جاتا ہے۔[2] خود مؤتمن الدولہ شیخ ابو الفضل نے کئی جگہ پیاگ[3] اور الہ آباد کا حال لکھا ہے۔ ایک کا نقل کر دینا کافی ہوگا۔

"صوبۂ الہ آباد۔ الہ آباد، پیشیں نام پیاگ (بفتح بائے فارسی)، گیتی خداوند بدان نام روشناس گردانید۔ وسنگین قلعہ بانجام رسید۔ وگزیں کاخہا افراختہ آمد۔ اوراد پادشاہِ معابد انگارند۔ نزد آں گنگ و جون و سرستی بہم پیوندند۔ لیکن پسیں را پیدائی نہ بود۔[4]"

(یعنی) صوبۂ الہ آباد میں۔ الہ آباد، پرانا نام پیاگ تھا۔ (پ کو زبر ہے)۔ اکبر بادشاہ نے اس نام (الہ آباد) سے شہرت دی۔ پتھر کا قلعہ بنوایا۔ اچھے اچھے بلند محل تعمیر کرائے۔ یہ تیرتھوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے پاس گنگا جمنا اور سرستی ملتی ہیں۔ مگر ظاہر میں سرستی کا پتہ نہیں۔

یہی حالت اقبال نامہ معروف بہ اکبرنامہ کی ہے۔ آئین اکبری جس کا جزوِ خاتم ہے۔ اس میں پہلے تو الہاباس ملتا ہے،[5] پھر الہ آباد ہو گیا، اور وہی رفتار پوری قوت کے ساتھ آخر تک قائم رہی۔[6] حتیٰ کہ آغاز ہی سے اس کو الہ آباد قرار دے دیا، "بساعتِ خجستہ اساس شہر الہ آباد نہادند۔"[7]

باوجود اس کے کہ الہاباس یا الہ آباد نے صوبہ کا صدر مقام ہو جانے سے سرکاری و دفتری اقتدار[8] حاصل کر لیا تھا، لیکن کڑے کی اہمیت اُس وقت تک باقی اور نمایاں تھی۔ اکبرنامہ میں قصبہ کڑہ[9] اور گزر کڑہ[10] اور آئین اکبری میں سرکار کڑہ،[11] سرکار کڑہ غربی، حویلی کڑہ[12] اور بلدۂ کڑہ[13] کا نام جا بجا آتا ہے۔

---

۱ مطبوعہ منشی نولکشور، جلد دوم، صفحات ۲۴۲، ۲۴۶ و ۲۷۷۔ ۲ جلد سوم، صفحہ ۱۴۷۔ ۳ ایضاً جلد دوم صفحہ ۱۔ ۴ اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۱۱۔ ۵ آئین اکبری، جلد دوم، صفحہ ۱۷۔ ۶ جلد دوم، صفحات ۳۲۵ و ۳۷۲ و ۳۷۳۔ جلد سوم، صفحہ ۶۹۰۔ ۷ اکبرنامہ جلد سوم، صوبۂ الہ آباد، صفحات ۱۷۴ و ۳۰۲، ۶۹۹، ۷۰۸ و ۷۷۴، ۸۰۲۔ حویلی الہ آباد، صفحات ۱۵۶ و ۱۴۷ و ۳۷۳ و ۴۰۱۔ الہ آباد، صفحات ۳۷۲ و ۵۰۹ و ۵۰۳ و ۵۲۴ و ۶۲۲ و ۶۴۳ و ۷۹۸ و ۸۲۳۔ ۸ اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۴۱۲۔ ۹ جلد دوم، صفحات ۱۹۰ و ۲۱۵ و ۳۲۳ و ۳۶۰ و ۳۷۵ و ۳۸۲۔ ۹ جلد دوم، صفحہ ۳۷۴۔ ۱۰ جلد دوم، صفحہ ۳۔ ۱۱ ایضاً صفحہ ۷۷۔ ۱۲ ایضاً صفحات ۳ و ۷۷۔ ۱۳ ایضاً صفحہ ۷۷۔

کرنل جی بی میلسن G. B. Malleson بھی لکھتے ہیں کہ بابر اور اکبر کے وقت میں کڑا بہت آباد و بارونق تھا[1]

مسٹر جیریٹ H. S. Jarret نے آئین اکبری کے ترجمہ[2] میں بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ اکبر کے عہد میں جب کڑے کی بجائے الہ آباد کو مرکز حکومت بنا دیا گیا تھا تو کڑہ کی اہمیت جاتی رہی۔ تاہم اس کی پرانی تاریخی عظمت[3] برقرار تھی۔ وہ تغلقوں کے زمانہ میں ہندوستان کے اہم شہروں میں سے تھا۔ صوبہ کا نام بھی یہی تھا۔ مصر کے نامور مورخ و جغرافیہ نویس شیخ ابو العباس احمد[4] نے اپنی زندہ رہنے والی کتاب صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء میں اس کو صاحب ہند کی مملکت کے تیئیس اقلیموں میں سے ایک اقلیم بتایا ہے[5]۔ بہت سے تاریخی واقعات اس قطعہ زمین سے وابستہ ہیں۔

اسی آئین اکبری میں جہاں "بزرگ پرستش کدہ ہا" کے عنوان سے بڑی بڑی تیرتھ گاہوں کا ذکر ہے لکھتے ہیں[6] "پریاگ مروزہ بہ الہ باس روشناس۔ وازہر ت تابیست کردہ نیایش دہ دانند۔ گویند کہ آدمی بہر خواہشے دریں جا فرو شود در دیگر زاد کامیاب آید و تر دامن گردد۔ ہر کہ خود را بکشد بزبان زدگی ننگ گراید مگر دریں جا فرواں ثواب اندوزد۔ و ایں راہگی سال بزرگ داشت نمایند لیکن در ماہ ماگھ بیشتر"[7]

متقدمین میں سے مولانا نظام الدین احمد ہروی نے جو اکبری دربار کے رکن رکین اور ممتاز و ماہر عہدہ دار و مورخ گزرے ہیں "طبقات اکبری" میں ہر موقع پر "الہ باس" لکھا ہے[8]۔ ایک جگہ یہ بھی صراحت

---

[1] اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۲۴۳ نوٹ۔ [2] جلد دوم صفحہ ۱۶۷ حاشیہ۔ [3] تاریخ فیروز شاہی، جز ثانی، صفحات ۲۴۳، ۲۴۹ وغیرہ۔ و تاریخ مبارک شاہی، صفحات ۱۰۸، ۱۱۱، ۲۲۳۔ [4] متوفی ۸۲۱ھ (۱۴۱۸ء)۔ [5] جلد پنجم صفحہ ۷۰۔ [6] آئین اکبری، جلد سوم صفحہ ۱۷۱۔ [7] اس میں تو دوسروں کے اقوال کا صاف حوالہ ہے ورنہ جیسا کہ پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے ابو الفضل نے بعض پرانی باتیں ہندو بیانات کی تقلید و اعتبار پر لکھ دی ہیں (پنجاب میں اردو صفحہ ۱۲۲)۔
[8] مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۵ء، صفحات ۲۲۸، ۳۴۳، ۳۵۰، ۳۵۹، ۳۷۵۔

کی ہے "پیاگ کہ الحال بہ الہ باس موسوم ومشہور است"[1]۔ دوسرے محل پر فرماتے ہیں "دریاگ جائے کہ آب جون وگنگ بہم می رسد شہر بنا فرمودہ وقلعۂ چند بر روئے ہم طرح انداختہ آں شہر را بہ الہ باس نام کردہ بودند۔"[2]

"منتخبات ابوالفضل علامی" میں خان خانان سپہ سالار کے نام فتح کا ایک خط موجود ہے، جس میں امن آباد الہ آباد تحریر کیا ہے[3]۔ کہیں اس سے یہی شہر مراد نہ ہو۔

جہانگیر کے عہد کو دیکھئے۔ مرحوم مولوی خدابخش خاں کے مشرقی کتابوں کے عجائب خانہ (پٹنہ) میں ایک چھوٹا سا خوش خط نسخہ دیوان حافظ کا محفوظ ہے۔ اس کے حاشیہ پر کچھ عبارت خود جہاں پناہ کے قلم سے تحریر ہے، جس میں "الہ باس" لکھا ہے[4]۔ اقبال نامۂ شگرف یعنی جہانگیر نامہ میں خواجہ ابوالحسن معتمد خان بخشی نے بعض بعض جگہ "الہ باس" لکھا ہے[5] اور کہیں کہیں الہ آباد بھی[6]۔ اسی طرح تزک جہانگیری میں الہ باس اور الہ آباد دونوں نام آئے ہیں[7]۔ دبستان مذاہب میں جو شاہجہاں کے زمانے یعنی ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) کی ایک مشہور ومعتبر کتاب ہے[8] اور جس کا حوالہ کننگھم صاحب بھی دیتے ہیں تیرتھ (محل بزرگوار) کی تعریف اور تمثیل میں تحریر ہے "پریاگ کہ اکنوں مشہور بہ الہ آباد است"[9]

اورنگ زیب عالمگیر کی تمام تحریرات میں، جو اس نے شاہجہاں کو زمانہ عزلت میں بھیجی تھیں

---

[1] صفحہ ۲۰۸۔ [2] صفحہ ۳۰۵۵۔ [3] مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۹ء، صفحہ ۱۱۶۔ [4] چشم دید۔ [5] مطبوعہ نولکشور، ۱۸۶۵ء، صفحات ۷، ۱۹، ۷۷، ۱۲۷، ۲۲۶ اور ۲۳۵۔ [6] صفحات ۸۸، ۲۳۰، ۲۰۵، ۲۱۲۔ [7] الہ باس: صفحات ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۳۱۔ و۔ الہ آباد صفحات ۲۷۳، ۲۸۰۔ [8] اس کا مصنف ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں سورت سے حیدرآباد دکن میں ملا تھا اور اس کا زمانہ عالمگیر کے وقت سے پہلے تھا۔ شمس العلماء مولانا شبلی فرماتے ہیں "دبستان مذاہب کی نسبت مشہور ہے کہ محسن فانی کشمیری کی تصنیف ہے۔ بعض اس کو داراشکوہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ذوالفقار اردستانی کی تصنیف ہے۔ جیسا کہ مآثر الامراء جلد دوم صفحہ ۲۹۲ میں مذکور ہے۔ سب سے پہلے یہ کتاب بمبئی میں ۱۲۶۲ھ میں چھاپی گئی تھی۔" (رسالہ الندوہ، جلد ۷، نمبر ۷، رجب ۱۳۲۳ھ، صفحہ ۳)۔ [9] مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۱ء، صفحہ ۱۹۳۔

الہ آباد لکھا ہے[1]۔

راجہ کندن لال بہادر اشکی جو ایک گرامی منش، محتاط انسان اور عہد امجد شاہی میں سلطنت اودھ کے میر منشی تھے "اپنی نفیس و مستند تاریخ (منتخب تنقیح الاخبار) میں "ولایت الہ آباد" اور اُس کا "دار الحکومت الہ آباد" لکھتے ہیں[2]۔ صوبہ کا نام بھی "الہ باس" نہیں بتاتے۔ حالانکہ آگرہ کے متعلق صوبہ کا نام آگرہ اور اُس کا دار الصدر اکبر آباد تحریر فرمایا ہے[3]۔

البتہ منشی سجان رائے نے باوجودیکہ شاہجہانی فرمان اور بقرار خود، تبدیل نام سے آگاہ تھے، اپنی کتاب (خلاصۃ التواریخ[4]) میں ہر جگہ "الہ باس" لکھا اور بد نصیب و بدنام اورنگ زیب نے مواخذہ و تعرض بھی نہیں فرمایا۔

سرکاری گزیٹیر میں بحوالہ تاریخ الفنسٹن لکھا ہے کہ اکبر نے شہر کی بنیاد ڈالی اور الہ باس نام رکھا تھا۔ پھر الہ آباد بدل دیا اور یہی سکوں پر بھی لکھوایا[5]۔

مسٹر فرنو' J. H. Furneaux ایڈیٹر ٹائمس آف انڈیا اپنی ضخیم و عظیم الشان کتاب 'ہندوستان کی جھلک' The Glimpses of India میں تحریر فرماتے ہیں کہ الہ آباد کا نام ۱۵۷۵ء میں اکبر نے الہ آباد رکھا تھا۔ جس کے معنی "دی اے بوڈ آف گاڈ" The Abode of God (خدا کے ٹھکانے کے) ہیں[6]۔ میری رائے میں قابل مترجم کی ذہانت و ذکاوت لائق داد ہے کہ "آباد" اور "اے بوڈ" کی بے تکلف و برجستہ آمد اور معنی و منشا کی یکسانی سے یک مستحق ستائش بات پیدا کر دی۔ دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ "الہ آباد اگرچہ ابتدا میں ہندوں کا مقام پریاگ نام تھا، تاہم شہر اُس کو مغلوں نے بنایا۔ . . . اور انتہائے عروج پر اُس کو اکبر نے پہنچایا[7]"۔

---

[1] رقعات عالمگیر مطبوعہ دار المصنفین، جلد اول، صفحہ ۲۱۷ [2] مطبوعہ ۱۲۶۹ھ مطبع مسعدن المعانی، صفحہ ۳۵۔ [3] یعنی نسخہ مذکور۔ [4] قلمی کتب خانہ محمدن۔ [5] ڈسٹرکٹ ریجسٹر جدید، جلد ۲۳، صفحہ ۲۲، ۳۰۔ تاریخ ہنفسٹن، جلد نہم، صفحہ ۵۱۳۔ [6] صفحہ ۲۲۵۔ مطبوعہ فیلاڈلفیہ۔ ۱۸۹۵ء Piladelphia U. S. A. [7] صفحہ ۲۲۵۔

نواب نصیر حسین خاں، خیال کا خیال ہے کہ "الہ آباد (شہر گنگا، جمنا کے سنگم پر تھا۔ ماگھ میلے میں ایشور (خدا) کا نام وہاں لیا جاتا تھا۔ اس مناسبت سے وہ الہ باس پکارا اور یوں اردو بنا لیا گیا" [1]

یورپ کے اہل قلم نے جن کا سلسلہ زیادہ تر عہد جہانگیری سے چلتا ہے، ہمیشہ الٰہ آباد لکھا ہے۔ انگریزوں کی عملداری کے آغاز بلکہ آمد کے وقت یہ تحریک کی جاتی تو شاید "الہ باس" کا پھر رسخ ہو جانا بہ آسانی ممکن تھا۔ جیسا کہ الہ آباد سے انگریزی کا الٰہ آباد Allahabad ہو گیا ہے۔ بہر حال دو تین صدی سے انگریز جو کچھ لکھ رہے ہیں سب کو معلوم ہے۔ سرکاری تحریرات سے ایک پرانی نظیر پیش نظر ہے۔ جس زمانہ میں کہ پونا کی حکومت کا آفتاب لب بام تھا اور یہاں کا زبردست مرہٹہ سردار بے دست و پا سا ہو رہا تھا تو مادھو راؤ نارائن پیشوا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی وساطت سے اودھ کے نواب وزیر سے درخواست کی تھی کہ الٰہ آباد کے میلوں کے موقع پر ہندو جاتریوں سے محصول ورجنگی کم لی جائے۔ ارل کارنواس Earl of Cornwallis سپہ سالار افواج شاہی و کمپنی نے ۲۰ اگست ۱۷۹۰ء کو اپنے (انگریزی) وکیل سید نورالدین حسن خاں بہادر کی معرفت یہ جواب دیا تھا۔

"حقیقت محصول تیرتھ پراگ یعنی الہ آباد کہ بہ مدنظر آرام و رضاجوئی زاران بہ نسبت ایام پیشیں خیلے تخفیف نمودند برائے اطلاع مخص لطف فرمودہ اند و مخلص بہ مقتضائے محبت و وداد نقل فرادم سودہ نواب صاحب ممدوح بہ قید ہر قسم پیشں آں مشفق ارسال می دارد۔ و رجائے واثق کہ از دو نواب معظم الیہ بہ ہماں طریق از فرط رحم و شفقت کہ ملو بر اطمینان و حفاظت زاران است بوجہ احسن جلوۂ ظہور خواہد یافت" [2]

اس میں پراگ تیرتھ اور الٰہ آباد کے ساتھ ساتھ، دکن کے ایک ہندو سردار کی خواہش و استدعا اور اودھ کے مسلمان حکمراں کی مروداری و مروت، انتظام اطمینان و حفاظت اور اپنی ہندو رعایا

---

[1] نقل اور اردو، صفحہ ۱۱۔ [2] "مکاتبات و مرسلات فارسی ایسٹ انڈیا کمپنی با دربار پیشوا" جن کو بھارت اتہاس سنشودھک منڈل نے شائع کیا ہے۔

اور جاتریوں پر نظر مہر و پرورش قابل توجہ باتیں ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب خوداله آباد میں اشراف میونسپل کمیٹی نے اقتدار و اختیار پایا تھا تو ہندوؤں کے مُردوں پر عجیب و غریب ٹیکس لگا دیا تھا یعنی جتنی لاشیں گنگا اور جمنا کے کنارے پر جلائی جاتیں اُن کے لئے فی لاش ڈھائی روپیہ لیا جاتا تھا۔[1]

باوجود سعیِ مفرط و توجہ بلیغ پروفیسر کوشل کشور "الہ باس" کے صحیح اور واقعی معنی معلوم کرنے اور اس (شاید سنسکرت نژاد) "الا" کے ماخذ و اصل کی تحقیق سے قاصر رہے۔ وہ اس کو ایک چیستان مان کر اہل ذوق و تلاش کو صلائے کرم دیتے ہیں۔ اس دعوتِ خاص میں مقبول ہے نوا بھی ممدوح کا ہم آہنگ و ہم نوا ہے۔ ان کے نزدیک یہ اسم "الا" کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے جس کا تذکرہ "پرانون" میں ہے، اور جو بنی آدم کا ابوالآبا تھا۔ یا یوں کہئے کہ حقیقتہً اس کی فطرت و جنسیت مشتبہ ہے۔ کیونکہ بعض اس کو اُم الامہات بھی کہتے اور بتاتے ہیں۔ نیز گنگا کے ایک تیرتھ کا نام "ایل" ہے۔ قیاس پہنچا ہے کہ اسی "ایل" کے مشتقات توصیفی سے "الا" ہے۔ نکتہ نواز و دقیقہ رس پارگیٹر صاحب اسی "ایل" سے آریا کو ماخوذ اور اس جہت سے اگر تمام نوع بشری کا نہیں، تو کم از کم کل اصناف و اقوام "آریا" کا مہد و گہوارہ الہ آباد کو سمجھتے ہیں۔[2]

لیکن دشواری تو یہ ہے کہ اس وسیع ملک میں بہت سے مقام الہ آباد اور الاباس سے موسوم ہیں۔ ضلع مظفر نگر ہی میں اسی نام "الہ باس" کا ایک مشہور گاؤں موجود ہے[3]۔ تو یہ عظمت و تقدس اور دیرینہ سالی کا خلعت کس کس کو پہنانا جائز ہوگا۔

رہے "ایل" کے معنی۔ یہ بھی سُریانی زبان میں خدائے پاک کے ناموں میں سے ایک ہے۔ شیخ الامام محی الدین ابن محمد عبدالقادر القرشی[4] نے اپنی مبسوط و مستند تالیف الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ میں لکھا ہے کہ اللہ، الصمد اور اللاہ کے سوا "ایل" بھی اسمائے الٰہی میں سے ہے[5]۔ امام راغب اصفہانی المفردات

---

[1] رسالہ اردو ماہ اپریل ۱۹۳۵ء، صفحہ ۳۰۲، جلد ۱۵۔ انتخاب اکمل الاخبار دہلی بحوالہ پانیر الہ آباد ۱۸۸۲ء۔ [2] اخبار لیڈر مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔ [3] ڈسٹرکٹ گزٹیر مظفر نگر، جلد سوم، مطبوعہ ۱۹۰۳ء، صفحہ ۲۰۲۔ [4] صاحب تصانیف کثیرہ ائمہ فقہا سے تھے ۶۹۶ھ (۱۲۹۶ء) میں وفات پائی۔ [5] نسخہ قلمی قدیم، صفحہ ۲۔ موجودہ کتاب خانہ مولوی سید منظور احمد صاحب مرحوم واقع صمدن ضلع فرخ آباد۔ [اس کا ایک مکمل و صحیح نسخہ پبلک لائبریری الہ آباد میں بھی موجود ہے۔ نمبر فہرست ۱۲/۴]

فی غریب القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ایل اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔"[1]

جتنے منہ اتنی بات۔ حال میں ایک صاحب علم نے اچھا خاصا رسالہ[2] تصنیف فرما کر یہ دکھایا ہے کہ "ایل" ایک قوم تھی جس سے مغل اور ترک قومیں نکلی ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی کے ایک برگزیدہ فرد تھے۔ بظاہر یہ تحقیق پروفیسر کونسل کشور کے نظریہ سے زیادہ قریب پائی جاتی ہے۔

باقی ناموں اور لفظوں کے متعلق آئین اکبری کے فاضل مقدمہ نویس اور حاشیہ نگار کی تحریر نقل کر دینا ضروری ہے فرماتے ہیں:-

"پراگ و پیاگ، در ہندی وصل و اتصال۔ الہاباس والہ آباد بمعنی جلئے ظہور قدرت اسم ذات بمعنی باش و بود آمدہ بمعنی جائے فرود آمدن و ظہور بودن دراں مکان والہ آباد یعنی آباد کردہ حق سبحانہٗ تعالیٰ۔ والہاباش یعنی جائے ماندن حق جل جلالہٗ۔"[3]

(ترجمہ) پراگ و پیاگ کے معنی ہندی میں ملنے، مل جانے کے ہیں۔ الہاباس اور الہ آباد قدرت کے ظاہر ہونے کی جگہ، اسم ذات کے، رہنے بسنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ بمعنی اترنے کی جگہ کے، اور اس مکان میں ظاہر ہونے کے۔ اور الہ آباد یعنی حق تعالیٰ کا آباد کیا ہوا، الہاباش، خدا کے رہنے کی جگہ۔

پریاگ اور سنگم، سنسکرت کے لفظ ہیں جس سے غالباً اس عربی داں فاضل کو واقفیت نہ تھی۔ دوسروں کا بتایا ہوا لکھا ہے، یا یہ کہ اُس وقت اِن لفظوں اور ناموں کا یہی مفہوم مانا جاتا ہو۔ مجھ ہیچ مداں کو بھی اس زبان میں درک و دخل نہیں۔ غیروں سے حاصل کی ہوئی معلومات کی صحت کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟

پریاگ، پر प्रिय اور یاگ (یگ) यग से بنا ہے۔ پِریَ یا پریہ، سنسکرت میں پیارے کو کہتے ہیں اور یگ ہوَن کو جو معروف عام ہے۔ پریاگ کے معنے ہوئے جہاں یگ پیارا ہو یعنی جہاں بڑے بڑے ہوَن ہوتے ہوں۔ (प्रयाग)۔

---

[1] مطبوعہ مصر، صفحہ ۳۰۔ [2] تبصرۂ ایلیہ، از مرزا اسد علی بیگ برلاسی۔ [3] آئین اکبری از شیخ ابو الفضل علامی منشی نول کشور۔ لکھنؤ۔ جلد دوم، صفحہ ۱، حاشیۂ اوّل۔

سن सं اور گم गम سے سنگم संगम مرکب ہے۔ سَن = برابر۔ گم = پہنچ: جہاں دونوں برابر پہنچیں، میل کی جگہ۔ باس वास کے معنی سنسکرت کے اہل لغت نے متعدد لکھے ہیں۔ یہاں، بسنے کے، استھان، ٹھاؤں، جگہ کے صادق آتے ہیں۔ باس، نواس اور استھان ہم معنی و مترادف کلمے ہیں۔ سکونت یا رہنے کی جگہ۔ باش فارسی ہے۔

خوب ہوا کہ اس تاریخی چھیڑ چھاڑ سے الہ باس اور الہ آباد کی قدامت، تسمیہ اور اصلیت کے متعلق کچھ ذکر آگیا اور پرانی کتابوں کی ورق گردانی کر لی گئی، ورنہ کون اس طرف توجہ کرتا اور تحقیق و تدقیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ آسان طلبی و سہل انگاری کے موجودہ دور میں الہ آباد کو الہ باس بنا لینے کی تحریک محض بے سود ہے۔ جس طرح چند صدیاں پیشتر باوجود حکومت کی قوت و پشت پناہی کے، زمانہ کی زبان، بنارس کو محمد آباد[1]، متھرا کو اسلام آباد[2]، برندابن کو مومن آباد[3]، بنگالے کی لکھنوتی کو جنت آباد[4]، صوبہ بہار کی سرکار مونگیر کو فرخ آباد[5]، اور پنجاب کے گجرات کو اکبر آباد[6] بنا کر شہرت نہ دلا سکی، یہ سعی بھی ناکام رہے گی۔ اس لئے ایسی باتوں کے چھیڑنے سے جو جماعتی اختلافات اور تلخیوں کو بڑھائیں، احتراز مناسب ہے۔

از من سخن عشق و جنون پرس نظیری ‌ ‌ ‌ ‌ دیریست دل و دین و سر کیش نہ دارم

کسی تاریخ سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ باغ کب نصب ہوا تھا، کس نے نصب کیا تھا، ابتدا نام کیا رکھا گیا تھا۔ البتہ یہ مشہور و زبان زد عام ہے کہ باغ بہت پرانا ہے، جس کی پیدایش (لغوی معنی میں) اکبر کے قلعے کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اکثر مورخ اس بارہ میں متفق ہیں کہ قلعہ کی بنیاد[7] اکبر کے اکیسویں

---

[1] تاریخ بنارس، از حکیم مظہر حسن، مطبوعہ ۱۹۳۰ء، صفحہ ۵۵، جلد اول۔ [2] متھرا کا ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، مطبوعہ ۱۹۱۱ء، صفحات ۱۳۷ و ۱۹۶۔ [3] مشہور قصبہ پٹیالی کا پرانا نام بھی مومن آباد ہے جو امیر خسرو کا مولد و موطن تھا۔ ترجمہ انگریزی مآثر الامرا، مطبوعہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۳۰۲۔ [4] آئین اکبری، جلد دوم، صفحہ ۱۴۵۔ [5] آخری مغل، مصنفہ ولیم اروین، صفحہ ۲۰۰۔ Later Mughals by William Irvine [6] حیات جلیل، مؤلفہ مقبول، حصہ اول، صفحہ ۲۲۲۔ نوٹ ۳۰۲۔ [7] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۳۶۔ دربار اکبری، صفحہ ۱۲۲۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۰۵، طبع ۱۸۶۸ء۔ دیباچہ انتخاب (انتخاب خلیہ)، مطبوعہ الہ آباد، صفحہ ۱۳۹۔

سالِ جلوس (۹۸۳ھ) یا حسبِ روایت ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۵۷۵ء میں پڑی تھی[1]۔ اوراقِ تاریخ اس
باغ کو اہم بتاتے اور امتیاز خاص دیتے ہیں۔ کبھی یہ ایک سادی سی جگہ فرحت و سیر کی تھی۔ اس کی
زمین، اس کے چمنوں اور روشوں نے اس وقت بھی اکبر کے قدم چومے تھے[2]۔ اس کے پھولوں اور
غنچوں نے اس عظیم الشان شہنشاہ کے دماغ کو معطر کیا تھا۔ شاہزادہ دانیال جب الہ آباد کا گورنر تھا[3] تو
یہاں آکر لطف اندوز ہوتا تھا۔ جہانگیر اس کے درختوں کے سایے میں تکان دور کرتا تھا۔ تعب سیر و شکار
کے بعد آرام و راحت پاتا تھا۔ وہ مدت تک یہاں رہا تھا[4]۔ سلطنت کی ضرورتوں یا اپنی ہنگامی شوریدہ
سری کے تقاضے سے کبھی باہر بھی جانا چاہتا تو یہاں کی دلچسپیاں عناں گیر ہوتیں۔ جلد سے جلد کھینچ کر
واپس لے آتیں۔ جہانگیر کو منانے اور سمجھانے کے لیے جب اس کی والدہ بیبی، مہد مقدس سلیمہ سلطان بیگم[5]

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۰۔ [2] طبقاتِ اکبری، صفحہ ۳۵۹۔ [3] منتخب اللباب خافی خاں، حصہ اول، صفحہ ۲۲۴۔ و۔ دیبان منش، صفحہ ۱۴۱۔ و۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۱۱ء، صفحہ ۶۹۔ [4] جہانگیرنامہ معتمد خاں بخشی، صفحہ ۸۰۔ و۔ اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج و زوال، صفحہ ۱۴۰۔ و۔ گزیٹیر مذکور، صفحہ ۱۶۹۔ [5] سلیمہ سلطان بیگم مرزا نور الدین محمد سے گلرخ بیگم کی بیٹی، بابر کی نواسی تھی، ہمایوں کی بھانجی اور اکبر کی پھوپھی زاد بہن۔ ہمایوں نے اس کی نسبت بیرم خاں خانخاناں سے ٹھہرادی تھی۔ شادی کی تقریب ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء) میں اکبر کے ہاتھوں انجام پائی۔ بیرم خاں کے مرنے پر ۹۶۸ھ (۱۵۶۱ء) میں خود اکبر نے اس سے نکاح کر لیا۔ شاہزادہ خانم ایک بیٹی اور سلطان مراد ایک بیٹا اس کے بطن سے تھے۔ بڑی خوش سلیقہ، خوش بیان، شیریں کلام، حاضر جواب، اہل علم و ہنر کی قدرداں تھی۔ شعر و سخن سے بھی بہرۂ کامل رکھتی تھی۔ مخفی تخلص تھا۔ عہد جہانگیر ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں اس دار دنیا سے رخصت ہوئی۔ باپ خاندانِ کاشغر سے ایک خاندانی شخص تھا۔ (ملاحظہ ہو اکبرنامہ جلد اول، صفحہ ۱۰۱۔ و۔ جلد دوم صفحات ۹۰ و ۱۰۰۔ و۔ طبقاتِ اکبری، صفحات ۲۴۶ و ۳۲۸ و ۳۵۳۔ و۔ اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ ۲۲۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۲۵۔ و۔ نگارستان فارس، صفحہ ۱۱۸۔ و۔ مکتوبات آزاد، صفحہ ۴۱۔ نیز۔ مآثر الامرا، صفحہ ۳۰۔ و۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۳۸)۔

الہ آباد آئی تھی تو جہانگیر نے دو منزل[1] بڑھ کر استقبال کیا، اور ملازم عالم و عالیان کو یہاں اتارا تھا۔

تاریخ کا ایک اندوہگیں واقعہ بھی اسی مقام سے وابستہ ہے۔ سلیم کے اشارہ[2] سے اکبر کے دانشمند و شجاع اور بہ ہر فن کامل و ماہر مشیر شیخ ابوالفضل علامی کا سر کاٹ کر راجہ نرسنگ دیو[3] (یا انگریزوں اور ہندوؤں کی مستند تحقیق سے 'برسنگھ دیو') بوندیلہ نے جہانگیر کے حضور میں الہ آباد بھیجا تھا تو اسی جگہ[4] پیش کیا گیا تھا۔

زمانۂ حال کا ایک ممتاز انگریز عہدہ دار (جس کا نام ادباً و احتراماً لینا مناسب نہیں) خسرو باغ کو ایک اور شرف دینا چاہتا اور لکھتا ہے کہ "جب جہانگیر[5] ۱۶۰۵ء کے قریب الہ آباد کا گورنر تھا تو اُس کا بیٹا جو تخت نشین ہو کر شاہجہان ہوا نیز اُس کا بڑا بھائی "خوش رو" نام وہیں پیدا ہوئے تھے۔ اسی دوسرے نام یعنی 'خوش رو'

---

[1] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۲۳۔ [2] تاریخ اکبر از می لیسن، صفحات ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹۔ و۔ ترجمہ آئین اکبری جلد اول، صفحہ ۳۳۔ و۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۲۰۵۔ و۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۴۔ [3] معتمد خاں نے اقبال نامہ میں اس راجا کو نرسنگ دیو بندیلہ لکھا ہے (صفحہ ۸۰)۔ آزاد دہلوی نے بھی نگارستان فارس میں نرسنگ دیو تحریر کیا ہے۔ (صفحہ ۱۱۱) نیز سیر المتاخرین، جلد اول صفحہ ۲۰۸۔ مسٹر بیل نے اپنی ڈکشنری میں صفحہ ۲۰۵ پر نرسنگ دیو راجہ بندیلہ کے نام سے حالات لکھے ہیں، مگر صفحہ ۱۲ پر بیر سنگھ بندیلہ بتایا ہے۔ سید نجیب اشرف ندوی، مقدمہ رقعات عالمگیر (صفحہ ۱۳۷، نوٹ) میں لکھتے ہیں کہ بیر سنگھ کو عبدالحمید وغیرہ نے غلطی سے نرسنگھ لکھا ہے۔ حالانکہ اُس کے بنائے ہوئے تالاب کا نام خود بیر ساگر لکھا ہے۔ اس کی سوانح عمری "بیر سنگھ دیو چرتر" نام ہے۔ (تاریخ جہانگیر، مؤلفہ ڈاکٹر بینی پرشاد، ضمیمہ ج، صفحہ ۲۰۱۔) [4] تاریخ جہانگیر از گلیڈون، صفحہ ۹۔ نیز نوٹ ۳، صفحہ مذکور۔ و۔ صفحہ ۴۲۔ و۔ بیلس جیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۶۔ و۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر متھرا، صفحات ۱۹۳، ۱۹۶۔ ایلیٹ صاحب کی تاریخ ہندوستان، جلد ہفتم، صفحہ ۱۴۰۔ رشحات العنون کا ایک نفیس قلمی نسخہ خط نسخ میں لکھا ہوا پبلک لائبریری الہ آباد میں موجود ہے، مصنفہ امین الدین خان بن سید ابو المکارم بن امیر خان الحسینی الہروی۔ اس میں بھی ورق ۲۳۱ (جزو اول) پر دو جگہ 'برسنگ دیو' لکھا ہے۔ [5] سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۲۰۸۔ و۔ اُمرائے ہنود، صفحہ ۳۴۹۔ و۔ دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۱۰۔ و۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۱۲۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۹۹۔ و۔ تاریخ بندیل کھنڈ، قلمی، از مولوی سید منظور احمد خاں مرحوم۔

سے خسرو باغ منسوب ہے"۔ یہ صاحب اپنے ماخذ اور ذریعۂ معلومات کا حوالہ نہیں دیتے۔ خسرو کو خوش رو قرار دینا اور اپنے اہل زبان کو اس کے معنی "فیر فیس Fair face ۔ اچھے چہرے والا" بتانا ذہانت ونکتہ آفرینی کی ایک عجیب ونازک اختراع ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ان صاحب کو ملا غیاث الدین رام پوری کی تحقیقات وموشگافی سے یہ خیال پیدا ہوا ہو۔ جنھوں نے اس لفظ کے متعلق غیاث اللغات[۱] میں اچھی خاصی بحث کی ہے، اور مؤلف بہار عجم اور ان کے استاد کے حوالہ سے یہ خوشگوار فیصلہ کیا ہے کہ صحیح لفظ خسرو ہے، زبر کے ساتھ نہ کہ پیش سے، اور یہ خُشرو کا معرب ہے جس کے معنی خوبرو ہیں۔ بہر حال میں موصوف کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ خسرو کوئی نیا وضع کیا ہوا لفظ نہیں ہے۔ اس کی نسبت ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ نے بھی سر ٹومس رو کے سیاحت نامہ میں لکھا اور اس کا یونانی املا "گریک فارم" CHOSROES بتایا ہے۔[۲]

واضح رہے کہ بیرون ایشیا کے سیاحوں کی تحریرات میں سب سے پرانی ایطالیہ کے پیٹرو ڈیلا ویلے Pietro Della Valle کی ملتی ہے جس نے ۱۶۲۳ء میں اپنے ملک وزبان کے تلفظ واملا کے مطابق "سلطان خسرو" کو Sultan Chosrou اور KHOUSRO وغیرہ قلم کیا تھا۔[۳] یہی مسٹر جی ہیورز G. Havers نے اپنی انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۶۶۴ء میں قائم رکھی۔ لیکن مسٹر ایڈورڈ گرے Edward Grey نے جدید مستشرقانہ تحقیق پر عمل فرما کر ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۲ء میں خوش رو KHUSHRU بنا دیا۔[۴]

جرمن مشرق نواز ڈاکٹر ایڈورڈ سی ساخاؤ Edward C. Sachau نے ترجمۂ کتاب الہند البیرونی میں خسرو کو KHUSRAU لکھا ہے۔[۵]

ربا خسرو باغ اور شاہجہاں کی ولادت۔ اس بارہ میں اسی قدر لکھ دینا کافی ہے کہ شاہجہاں کے مقرب اور درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس کے زائچہ کی نقل درج کر کے یہ اضافہ کیا ہے

---

[۱] فصل خائے معجمہ مع سین مہملہ۔ [۲] ریبلس اینڈ ری کلکشنس، جلد اول، صفحہ ۹۹، تعلیق تحتی۔ [۳] سیاحت نامہ مطبوعہ لندن، صفحہ ۵۲۔ THE TRAVELS [۴] ایضاً صفحات ۵۵-۵۸۔ [۵] مطبوعہ ایڈنبرا صفحہ ۲۰۴، جلد اول۔

کہ شاہجہاں دارالسلطنت لاہور[۱] میں پیدا ہوا تھا[۲]۔ مسٹر بیل بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ شاہزادہ خسرو کے مفصل تذکرہ میں لکھ چکا ہوں کہ خسرو کے مولد ہونے کا فخر بھی لاہور کو حاصل ہے[۳]، الہ آباد اس شرف سے محروم ہے۔

ڈسٹرکٹ گزیٹیر کی یہ روایت کہ "زمانہ قیام و سکونت الہ آباد میں یہ باغ جہانگیر کا زیست گاہ تھا" واقعات و تحریرات سے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کا دوسرا جزو کہ "جہانگیر کے بعد اس کے باغی بیٹے خسرو کو دے دیا گیا تھا"[۴] ماننے کے قابل نہیں۔ اس دادودہش کی تائید نہ تاریخ کے صفحات سے ہوتی ہے، نہ قرائن و قیاسات سے۔ اکبر کے جیتے جی خسرو اُس کے پاس آگرہ میں رہتا تھا۔ اُس کے تمام ہمدردان اور حامی امرا موقع مناسب کے انتظار میں اُس کو وہاں گھیرے رہتے تھے۔ جہانگیر کے تخت پر بیٹھنے کے ساتھ ہی خسرو نظر بند کر لیا گیا۔ شاہ برج (قلعہ آگرہ) میں مقید تھا۔ چھ مہینہ بعد بھاگا۔ دوبارہ پکڑا گیا۔ اور پھر زندگی بھر اس کو رستگاری و خلاصی نصیب نہیں ہوئی[۵]۔

یہ مختصری ہے اس کی سوانح عمری　　　ہمیشہ وقف ستم ہائے روزگار رہا

مسٹر فرنیو اپنی دلچسپ و عالمانہ کتاب "گلمپسز آف انڈیا" Glimpses of India میں لکھتے

---

۱ ہمیشہ سے شاہ نشین شہر چلا آتا ہے۔ اکبر اور جہانگیر جب کسی مہم یا سیر و تفریح کے سفر کو جاتے تھے تو حرم سرائے شاہی کو کسی قریبی عزیز یا مقرب امیر یا راجا کے زیر نگرانی یہاں چھوڑ جاتے تھے۔ ۲ جلد اول دو ایول صفحہ ۱۶۔ بیلز بایوگرافیکل ڈکشنری صفحہ ۳۲۵۔ و تاریخ ہندوستان جلد ہفتم از مولوی ذکاء اللہ و سیر المصنفین جلد دوم صفحہ ۲۸۸۔ و سیر المتاخرین (انتخاب سلطنت مغول) صفحہ ۱۲۹۔ ۳ طبقات اکبری صفحہ ۳۷۱ و تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۶۶۔ و سیر المتاخرین جلد اول صفحہ ۱۸۸ و دیباچہ تزک صفحہ ۲۔ و منتخب اللباب حصہ اول صفحہ ۲۴۸۔ ۴ سلسلہ قدیم ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۲۵۔ و سلسلہ جدید ۱۹۱۱ء جلد ہفتم صفحہ ۲۰۳۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۔۔۔ جلد دوم صفحہ ۱۳۰۔ The Monumental Antiquities and Inscriptions N. W. P. & O. By A. Führer صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴ دیباچہ۔ ۵ سلسلہ تواریخ صفحہ ۱۳۱۔ و کمال و سلطنت مغلیہ کا عروج صفحہ ۱۲۱۔ و اورنگ زیب و سلطنت مغلیہ کا زوال از اسٹینلی لین پول صفحہ ۶۳۔

ہیں کہ "شاہزادہ سلیم جو اکبر کا بیٹا تھا، اور بعد کو مشہور شہنشاہ جہانگیر ہوگیا تھا، وہ بھی اپنا وقت یہاں (خسرو باغ میں) صرف کرنے کا شوقین تھا۔"[1]

شاہ عالم (ثانی) کا قیام[2] بلکہ سکونت الہ آباد میں ۱۷۷۱ء تک رہی۔ تو وہ بھی خسرو باغ کا دلدادہ اور حاضر باش تھا۔ مرزا جہانگیر جو اکبر شاہ ثانی، بادشاہ دہلی کا (بقول مسٹر بیل[3]) بڑا بیٹا اور ولی عہد سلطنت تھا، جس نے ۱۸۰۹ء میں مسٹر سیٹن[4] Seton ریزیڈنٹ متعینہ دہلی پر تپانچہ (پستول) کا فیر کیا تھا، اور اسیر سلطانی کی حیثیت سے الہ آباد بھیج دیا گیا تھا، یہاں خسرو باغ میں کئی برس رہا تھا۔ اس نے اکتیس سال کی عمر میں ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں وفات پائی۔ کہتا تھا خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

شاہزادے کے ۳۱ سالہ عمر کے شمار سے دفن کے وقت قلعہ الہ آباد کی فصیل سے اکتیس ضرب توپ کی ماتمی سلامی سر کی گئی۔ وہ اسی باغ میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ مگر بعد کو شاہ بادشاہ کی خواہش اور اصرار پر ۱۸۳۲ء میں لاش نکال کر دہلی منتقل کر دی گئی اور حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار کے صحن میں دفن ہوئی۔[5]

نکالی جا رہی ہیں ہتھکڑیاں کچھ قید خانے سے ہوئی ہے ختم میعاد آج پابند سلاسل کی

سر ولیم سلی مین نے ۱۸۳۵ء میں شاہزادہ کو یہاں دیکھا تھا۔ وہ مسٹر بیل کی طرح اس کو ولی عہد اکبر دوم کا فرزند اکبر اول نہیں بتاتے لیکن اپنے سیاحت نامہ و تذکرہ میں لکھتے ہیں[6] کہ "یہ شاہزادہ الہ آباد میں اسر و حبس کی حالت میں نہ تھا صرف دہلی واپس جانے کی ممانعت تھی۔ اس کا مکان شاندار تھا۔ آمدنی معقول تھی اور اس کے مرتبہ و شان کے حسب حال تمام اعزاز برقرار تھے۔"

مرزا جہانگیر کے مزید حالات آخر کتاب میں اپنی جگہ پر ملیں گے۔

ہندوستان کی بغاوت ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں بھی ارباب سیاست کی نگاہیں خسرو باغ کی طرف

---

۱ مطبوعہ فلیڈلفیا امریکا ۱۸۹۹ء صفحہ ۲۰۷۔ ۲ گزیٹیر سابق صفحہ ۱۳۶، و حال صفحہ ۱۸۲۔ ۳ بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۱۲۸۔

۴ یہ صاحب ریزیڈنٹ شاہجہان آباد ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں مقرر ہوئے تھے (تاریخ جدولیہ صفحہ ۵۴۳)۔

۵ اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری، Oriental Biographical Dictionary

صفحہ ۱۲۸، و قاموس المشاہیر صفحہ ۱۸۳۔ ۶ جلد دوم صفحہ ۱۹۷۔

لگی ہوئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی ہے "مسٹر اسٹیل C. D. Steel اور ان کے رفقائے قلم کے بقول "خسرو باغ اگرچہ تین سو برس پیشتر ایک بغاوت کیش و سرگشتہ شاہزادے[1] کا مامن و مسکن تھا تو ۱۸۵۷ء میں بھی اس نے ایک شوریدہ سر فتنہ گر کو پناہ دی تھی[2]۔"

یہ شوریدہ سر فتنہ گر مولوی لیاقت علی باشندۂ مہ گاؤں[3] (پرگنہ چایل، ضلع الہ آباد) ہیں، جن کے تقدس و اتقا کا شہرہ دور دور تک تھا۔ بغاوت کے شروع ہی سے ضلع الہ آباد کے اس علاقہ میں جو مابین دو آب گنگ و جمن واقع ہے، ان کا بڑا اثر تھا۔ وہاں کے آشفتہ مزاج، شورش پسند خیرہ سر زمینداروں کو حسب روایات سرکاری ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو قتل و خون و غارت گری و تاراج میں ان کا پیشوا بن سکے۔ نظر انتخاب مولوی لیاقت علی پر پڑی۔ وہ بڑی آن بان اور سردارانہ تزک و احتشام سے کوچ کر کے الہ آباد آئے۔ بادشاہ دہلی کی فرماں روائی و حکومت کا اعلان فرمایا۔ گورنر الہ آباد کی حیثیت[4] سے اپنا جھنڈا بلند کیا۔ خسرو باغ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہیں سے تمام احکام صادر و نافذ ہوتے تھے۔

وسط جون میں مولوی لیاقت علی اور ان کے متبعین اور پیرووں کی جماعت نے افواج انگریزی سے شکست کھائی۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مولوی صاحب کچھ زمانہ تک مفرور و روپوش رہے۔ ۱۸۷۱ء میں الہ آباد میں گرفتار ہوئے۔ اور مدۃ العمر محبوس رہنے کے لئے جہور دریائے شور بھیج دیے گئے۔

قانون کی نگاہ میں اور سرکاری طور پر ان کے جرائم کیسے ہی ناقابل درگذر اور نظم مملکت کے لحاظ سے شدید مواخذہ و بازپرس کے مستوجب رہے ہوں، مگر میں نے بعض سن رسیدہ، ممتاز و فہیم مسلمانوں کو ان کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیتے ہوئے سنا ہے۔ ان کے ذکر میں خود گزیٹیروں کا لہجہ بھی چنداں تلخ و درشت نہیں پایا جاتا[5]۔

---

[1] سلطان سلیم پسر اکبر سے مراد ہے۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق صفحات ۱۵۲، ۱۶۵-۱۶۶ - جدید صفحہ ۱۸۲۔ [3] مہ گاؤں؛ الہ آباد سے چودہ میل پچھم بڑی سڑک (پختہ) پر واقع ہے۔ [4] بہادر شاہ کا مقدمہ "مطبوعہ دہلی (۱۹۲۱ء)" سے پایا جاتا ہے کہ مولوی لیاقت علی ضلع الہ آباد سے آئے تھے اور مستقل گورنر مقرر ہوئے تھے۔ کسی اور جماعت سے کوئی اور درخواست نہیں آئی تھی۔ [5] ڈسٹرکٹ گزیٹیر مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۰۲؛ نیز گزیٹیر سلسلۂ جدید ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۸۲۔

خسرو باغ کی تاریخ میں وہ دن بھی یادگار رہے گا، جب ۱۸۷۲ء میں شہزادہ ولی عہد پرنس آف ویلس بہادر کی صحت یابی کا جلسہ یہاں منعقد ہوا تھا۔ اس مبارک و مسعود موقع پر الٰہ آباد کے شاعر شہیر مولوی غلام امام شہید[1] اور اور ممتاز حضرات نے تہنیت کے قصیدے پڑھے تھے اور مبارک باد کی تقریریں فرمائی تھیں۔ عوام نے بھی اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا تھا[2]۔

خسرو باغ[3] الٰہ آباد کے ایسٹ انڈیا ریلوے اسٹیشن (جنکشن) سے ایک تیر پرتاب یا انگریزی اصطلاح میں ایک "سٹون تھرو" (پتھر پھینکنے) کے فاصلہ پر شہر سے ایک میل دور واقع ہے۔ باغ نہایت وسیع اور طویل و عریض ہے۔ اس کی وسعت و گنجایش اس دور کے بادشاہی باغات کے مساوی درجہ و شان رکھتی تھی یعنی انگریزی پیمایش سے چالیس ایکڑ و ستر ڈسمل۔ پوری تفصیل اور رقبہ کی موجودہ تقسیم نمبروں کے ذیل میں ملے گی۔

خسرو باغ کے متعلق تفصیلات و جزئیات کے بیان کرنے سے پہلے فنِ چمن بندی و باغبانی کی نسبت اس قدر کہہ دینا ضروری ہے کہ کسی وقت یہ ایک مستقل ہنر تھا۔ ہندوستان میں اس کا شوق، مسلمان ایران اور وسط ایشیا سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ دُنیا کے تاریخ داں لکھتے ہیں کہ نینوا کے ایک بیشمار خونخوار بادشاہ نے سب سے پیشتر باغ لگوائے اور قلعہ و خندق بنوائے تھے۔ سلاطینِ اسلام اور اُن کے ارکان دولت نے خاص کر اپنے ذوق، رنگ طبیعت، ملک کی آب و ہوا اور رسم و رواج یا بہ لفظ دیگر "ضرورت" کے موافق و مناسب تغیرات کر کے اس کو خوب ترقی دی سرپرستی و پرورش فرمائی۔ دلکش اختراعیں اور دل آویز اصلاحیں کر کے اس چمن کو اپنا خانہ زاد، ہندوستان پرور بنا لیا۔ اُن کے قصور و عمارات کے ساتھ باغیں باغ، خانہ باغ، گلزار، چمن، صحن کا ہونا لازم و ملزوم تھا۔ فیروز شاہ تغلق جو باجماع مورخین منصف مزاج، خوش انتظام اور صاحب علم حکمراں گزرا ہے اور جس نے "فتوحات فیروز شاہی" کے نام سے اپنے عہد کے بہت کی تاریخ خود لکھی ہے سینتیس سال کے قریب [۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) سے ۷۹۰ھ (۱۳۸۸ء) تک کچھ دن چھوڑ کر] فرماں روا رہا۔ اور فی الجملہ امن و عافیت کے ساتھ بسر کی۔ اس نے اپنے مستقر سلطنت میں جو دہلی سے زیادہ فیض آباد کے نام سے اُس وقت شہرت

---

[1] وفات ۵ شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) مقام مدفن الٰہ آباد۔ [2] سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خاں صفحہ [illegible] شمس العلماء محمد ذکاء اللہ صفحہ ۱۴۔ [3] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد صفحہ ۳۴۰۔

رکھتا تھا، منو بیغ نصب کرائے تھے۔ زمانہ کا زبردست وتباہ کار ہاتھ ان سب کو مٹا چکا ہے۔ آج ایک کا
نشان بھی نہیں بتاتا۔

اک نقش مٹ گیا ہے روتے نشان پر ہیں   دل میں ہیں داغ حسرت قصے زبان پر ہیں

سلطان سکندر لودی نے ۸۹۴ھ (۱۴۸۹ء) سے ۹۱۵ھ (۱۵۱۰ء) تک سلطنت کی۔ اس کا عہد
بہت سی اصلاحات ملکی و مالی کے لئے شہرت رکھتا ہے حتیٰ کہ سب سے پہلے اسی کے زمانہ میں ہندوؤں نے
عربی فارسی شروع کی تھی[۱]۔ ورنہ اُس وقت تک تو دھرم دان ہندو اس کو ناپاک ودیا کہتے تھے[۲]۔ اس نے ۹۱۵ھ
یعنی مرنے سے کچھ پہلے آگرہ[۳] سے دھول پور تک منزل بہ منزل محلات تعمیر کرائے اور باغات لگائے تھے[۴]۔
مغلوں کے زمانہ کو لیجئے۔ بابر[۵] نے جب ہندوستان فتح کیا تو دہلی چھوڑ کر اس نے بھی آگرہ کو مرکزِ حکومت
بنایا۔ اپنے دل پسند نو احداث باغ "باغ وفا" واقع کابل کی یاد تازہ تھی[۶] اُس کی نقل یہاں بھی کرنا چاہی۔
"چار باغ" یا "باغِ گل افشاں" کی بنیاد ڈالی[۷]۔ اپنے مالوف وطن کے سوا بخارا اور بدخشاں اور بہت سے پہاڑی
مقامات سے پھل پھول کے درخت اور بیج منگائے۔ نے شکر کی پود، انار، سنگترے اور شفتالو لگائے۔
مگر سنگلی زمین اور ناموافق آب و ہوا نے شکست دی۔ کوشش رائگاں گئی۔ بہادر ترک[۸] پھر بھی ہمت نہ ہارا۔ جمنا کے

---

[۱] بیلس ہیاگر کی کل نقشی، صفحہ ۱۴۰۔ [۲] دربار اکبری، صفحہ ۹۷۵۔ [۳] آگرہ کو سب سے پیشتر اسی بادشاہ نے تخت گاہ
سلطانی بنایا (تزک بابری صفحہ ۲۶) اور یہی اس کا اصلی اور پرانا نام ہے۔ شاہ جہاں کے عہد سے اکبر آباد لکھا جانے لگا ورنہ اس سے
پہلے اکبر اور جہانگیر کے زمانہ کی تمام کتابوں تاریخوں تذکروں اور فرمانوں حتیٰ کہ رقعوں میں بھی اس شہر کا نام آگرہ ہی لکھا
ہے۔ تاریخ آگرہ از مولوی سید احمد صفحہ ۲۵ و فٹ نوٹ۔ [۴] مرقع اکبر آباد یا تاریخ آگرہ صفحہ ۱۵۔ [۵] تزک بابری ترجمہ ارسکن صفحہ ۲۳۴۔
[۶] تاریخ عمارات مولفہ فرگسن جلد دوم صفحہ ۱۰۱۔ اسی باغ کے ایک حصہ میں جو "جو بُرجی" کہلاتا ہے کابل جانے سے پیشتر بابر کا تابوت
دفن رہا تھا۔ [۷] تاریخ تاج از مفتی معین الدین مرحوم صفحہ ۱۴۰۔ معین الآثار صفحات ۱۰ و ۲۵۔ کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۸۰۔ چار باغ
میں ایک شاہی ایوان بھی عہد بابری کا تھا۔ مذکور صفحہ ۸۰۔ [۸] یہ تمام سلاطین چغتائی ملک موروثی یعنی بخارا اور سمرقند کے نام پر جان دیتے تھے
اور عمر بھر وطن اور اس کی چیزوں کی یاد سے دل کو یوں ہی خوش رکھتے تھے۔ (دربار اکبری صفحہ ۴۴۴) [۹] بابر کا اصلی نام ظہیر الدین محمد
تھا۔ تیمور لنگ سے چھٹی پشت تھی۔ شیخ عمر مرزا شاہ فرغانہ کا بیٹا تھا۔ فرغانہ سمرقند کے پورب واقع ہے۔ چغتائی قبیلہ کا ترک تھا۔ اگرچہ
مورخین نے اس کو اور اس کے خاندان کو مغلوں میں شمار کیا ہے۔

پُرفضا کنارے اُبلگوں پانی کی موجوں سے دُھلنے والی ہواؤں سے معمور مقام پر "آرام باغ"[1] آباد کیا۔ آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ پہلے اسے "چار باغ" کہتے تھے۔ پھر "ہشت بہشت" ہوا۔ بابر نے نئی بنیاد ڈال کر "نور افشاں" کہلوایا۔ اب "رام باغ" کہلاتا ہے[2]۔ اس کی اثناس کی سالانہ پیداوار کسی وقت حد و شمار سے باہر تھی[3]۔ اسی دل نشین سرزمین یعنی خاک نور افشاں نے بابر کے جسم خاکی کو چھ مہینے تک اپنی آغوش میں رکھا تھا۔ بعد ازاں حسب وصیت یہ امانت کابل کو منتقل کر دی تھی[4]

بابر خوش نصیب و نیک نیت تھا کہ ساڑھے چار سو برس گزر جانے پر آج بھی اس کی ایک اور دلپسند یادگار محفوظ اور "باغ بابر"[5] کے نام سے کابل کی موجودہ آبادی سے باہر ایک پہاڑ کے دامن میں موجود ہے۔ دامن میں باغ اور فوارے ہیں اور اس سے اونچائی پر باغ کی عمارت ہے اور اس سے اوپر پہاڑی کے بالکل نیچے وہ احاطہ ہے جس میں شاہ بابر کا مزار ہے[6]۔ بلدیہ (میونسپلٹی) کابل کے تفریحی جلسے، امراء و عمائد کی پرتکلف پارٹیاں اکثر اسی روح پرور و حیات افروز مقام پر ہوتی ہیں۔

میں نے یہ پورا حال اس لئے نقل کر دیا ہے تاکہ اہل نظر آگرہ یا ہندوستان کے کسی باغ کا کابل سے مقابلہ کر سکیں اور اندازہ فرمائیں کہ باوجود اختلاف نوعیت "آب و ہوا" دونوں میں کس قدر یکسانی اور خوشنمائی پیدا کی جاتی تھی۔ پھر ایسے شخص کے ہاتھوں، جسے گھوڑے کی پیٹھ اور رزم و نبرد کے میدان کے سوا کبھی زمین پر قدم رکھنے کی بھی مہلت نہیں ملتی تھی۔

اکبر اعظم نے بھی اچھے سے اچھے باغ نصب کرائے تھے۔ کون بتا سکتا ہے کہ "باغ فرح بخش" اور "باغ

---

[1] کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۲۰۳۔ لیکن منشی صاحب کی تحقیق یہ ہے "آرام باغ" جہانگیر نے نورجہاں کے لئے نصب کرایا تھا۔ کابل کے باغِ نور افشاں کی نقل ہے۔ صفحہ ۱۴۰ مذکور۔ [2] دربار اکبری، صفحہ ۲۳۲۔ [3] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد، صفحہ ۸۰۔ [4] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۱۰۔ ولیمس، ڈکشنری، صفحہ ۲۵۲ و آگرہ ہینڈ بک مرتبہ کین و کن صاحبان، صفحہ ۲۰۳۔ [5] مسٹر این بی نیول فرماتے ہیں کہ بابر دفن ہوا وہ مقام کابل کے پاس شاہ باغ میں ہے جس کی دل پرور رفعت حیات سے محجوب ہے۔ یہ وہی باغ ہے جس کی شہرت عظیم الشان تعمیرات فرشتہ نے گنائی ہیں۔ دیکھو ... حصہ دوم، صفحہ ۲۰۔ [6] سفر نامہ افغانستان (اردو)، سید سلیمان ندوی۔ رسالہ معارف نمبر ۳، جلد ۳۳، صفحہ ۱۹۵۔

ارم آساس "کیا ہو گئے۔ آج صفحۂ کاغذ کے سوا ان کا نام بھی کہیں باقی نہیں[1]۔

روتے ہیں ہمیں دیکھ کے دشمن بھی ہمارے
آتی ہے تباہی مگر ایسی نہیں آتی

احمد آباد کے پاس، جہاں سلطان مظفر گجراتی پر اکبری لشکر نے فتح پائی تھی، وہاں مرزا عبد الرحیم خانخاناں نے ایک باغ لگایا۔ "باغِ فتح" نام رکھا تھا[2]۔ یہ مسلمان سلاطینِ ہندوستان کا قابلِ رشک کارنامہ تھا کہ ایران و توران میں جہاں فتح ہوتے وقت "کلہ مینار" (مقتولوں کے سروں کے) بنائے جاتے تھے[3]، یہاں سرسبز باغ نصب اور آباد ہونے لگے۔ جہانگیر نے بھی اس کو دیکھا تھا۔ لکھتا ہے کہ "جو باغ خانخاناں نے میدانِ کارزار پر بنایا ہے، دریائے سابرمتی کے کنارے پر ہے[5]۔ عمارت عالی اور بارہ دری موزوں و مناسب چبوترہ کے ساتھ دریا کے رُخ پر تعمیر کی ہے۔ تمام باغ کے گرد پتھر اور چونے کی مضبوط دیوار کھنچی ہے۔ ایک سو بیس جریب کا رقبہ ہے۔ خوب سیرگاہ ہے۔ دو لاکھ روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا باغ تمام گجرات میں نہ ہوگا۔ دکن کے لوگ اسے "فتح باڑی" کہتے ہیں[6]۔"

باغوں کے لگانے میں جہانگیر نے اپنے پردادا مرزا بابر سے کچھ کم سلیقہ و ذوق نہیں پایا تھا، بلکہ چین اور امن وامان نصیب ہو جانے سے اس نے دل کھول کر اپنا شوق پورا کیا۔ کابل اور کشمیر کے بعض سرسبز و مسطح میدان اس کے لئے موزوں اور قدرتی طور پر مناسب تھے، جن کو اس نے سراپا بہار یا گلزار ارم بنا دیا تھا[7]۔ وہ ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں کابل گیا تھا۔ پردادا کی قبر کی زیارت کی۔ حکم دیا کہ بڑا سا چوڑا باغ "شہر آرا باغ"[8]

---

[1] تذکرہ ہفت اقلیم۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۲۹۔ [3] پرائس صاحب Prcie نے اپنی تاریخ جہانگیر میں صفحہ ۱۱۵ پر اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضیافت کا حال بھی تحریر فرمایا ہے، جو خانخاناں کی بیٹی خیر النساء نے جہانگیر کی اس باغ میں کی تھی۔ [4] مسلمان تاجداران ہند، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۲۶ء، صفحات ۱۳۵ و ۱۴۱۔ [5] آج کل سابرمتی لکھی جاتی ہے۔ [6] دربار اکبری، صفحہ ۶۴۸۔ [7] ترجمہ تزک از بیورج Bereridge جلد اول، صفحات ۴۲۹ و ۴۳۲ و نوٹ۔ [8] تاریخ جہانگیر از گلیڈون Gladwin، صفحہ ۲۳۹۔ [9] شاہ آباد کا شہر آرا باغ کسی اسی کی ایک خوش نما نقل تھا۔ آج ایک نیم ویران محلہ اور چند درختوں کا نام ہے۔

کے متصل نصب کیا جائے اور "جہاں آرا باغ" نام رکھا جائے۔ دریائے کابل کاٹ کر نہر نکالی جائے۔ اس باغ کے خیابانوں میں ہو کر گزرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

گرد دامن بن گیا صحرا کا داماں، دیکھ کر
پاؤں پھیلائے ہیں ہم نے بھی بیاباں دیکھ کر

اور یہ دونوں باغ "شاہ لالان" کے نام سے شہرت یاب ہوئے[1]۔ راجہ کندن لال اشکی منتخب تنقیح الاخبار میں لکھتے ہیں کہ اس باغ "جہاں آرا" کی بنا ۱۰۱۵ھ یا سمبت ۱۶۴۳ میں پڑی تھی[2]۔

کشمیر ایک تو قدرت کاملہ کی عطا و موہبت سے خود ہی گل و گلزار ہو رہا تھا۔ اس پر جہانگیر کے زرپاش ہاتھ اور نکتہ آفریں دماغ کی بدولت کیا سے کیا ہو گیا۔ یہاں کے باغات میں پھل پھول کی وہ کثرت ہو گئی جس کی تفصیل سے میرا قلم عاجز اور کاغذ کا میدان تنگ ہے۔ باغوں میں پھول، دولت خانوں میں پھول، جامع مسجدوں کے چھتوں پر پھول؛ غرض ہر طرف لالہ ہی لالہ نظر آتا تھا۔ بود و باش کے مکانات کی چھتیں تو حسب معمول لکڑی کی ہوتیں، لیکن ان کو خاک پوش بنا کر سال بہ سال ان پر گل کھلائے جاتے۔ ایک چنبیلی ہی خدا معلوم کتنے قسم اور رنگ کی ہوتی تھی، صندلی بھی، نیلی بھی، سفید بھی[3]۔ اور نہایت خوشبودار۔ اسی طرح اور ہزاروں قسم کے پھول پھل اگائے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانہ سے پہلے ہندوستان میں شاہ آلو نہیں ہوتا تھا۔ نہ زرد آلو۔ محمد قلی افشار نے کابل سے لا کر پیوند لگا دئے۔ شہر آرائے کابل سے مرزائی نام ناشپاتی لا کر لگائی گئی۔ کابل، بدخشاں، سمرقند سے منتخب چیزیں اور پودھیں لائی گئیں۔ شہتوت پر کرم پیلہ چڑھا دیا اور ریشم بنانے کا سامان کر دیا گیا[4]۔ ایک بڑا خوبصورت باغیچہ یہاں کشمیر میں اکبر نے لگایا تھا۔ جہانگیر نے اس کی اصلاح و درستی کی نگہداشت کا اہتمام کیا۔ "نور افزا" نام رکھا[5]۔ اس نے بہت سی سیرگاہیں، عمارتیں اور حوض اس اطراف میں بنائے تھے، جن کا حصر و شمار آج کون کر سکتا ہے[6]۔ پھولوں سے جہانگیر کے عشق کی نسبت مسٹر ہنری بیورج کا انڈین میگزین[7] Indian Magazine میں ایک سیر حاصل آرٹیکل نکل چکا ہے، اس پر اضافہ کی ضرورت نہیں۔

---

[1] سیر المتاخرین (انتخاب مغول) صفحہ ۱۰۲، مطبوعہ الہ آباد۔ ادیان مغول صفحہ ۳۰۱۔ [2] کل مطبوعہ ۱۳۳۹ھ، سلطان الطائف صفحہ ۲۴۴۔ [3] ترجمہ تزک جہانگیری، جلد اول صفحہ ۶۔ [4] اقبال نامہ جہانگیری، صفحات ۲۴۴ و ۲۵۰۔ [5] اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ ۱۲۹۔ [6] ایضاً صفحہ ۱۵۵۔ [7] بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۶ء۔

جہانگیر کی مشہور ہنرمند و خوش سلیقہ ملکہ نورجہاں کے شوق اور نام کے انتساب سے بھی متعدد باغات، نورافشاں[1]، نورپری وغیرہ لگائے گئے تھے[2]۔ نور منزل یا ڈیرہ باغ ۱۰۲۸ھ (۱۶۱۹ء) میں نصب ہوا تھا[3]۔ بلند باغ یا تیس کھمبے نے پچپن بیگہ زمین گھیری تھی[4]۔ ان کے واسطے اُمرا دُور دُور سے عمدہ پھولوں اور پھلوں کے درخت تلاش کر کے بھیجتے تھے[5]۔ کشمیر کے اُس حصہ سے جہاں زعفران پیدا ہوتی ہے مٹی لا کر ڈالی جاتی تھی[6]۔

ایک دل پسند مقام کیرانہ (حال واقع ضلع مظفر نگر) میں جہانگیر کا ایک مقرب امیر مقرب[7] خاں نام، اچھی سرزمین اور سازگار آب و ہوا کو دیکھ کر منتخب و بے مثل آموں کا باغ نصب کرتا ہے۔ گجرات، دکن اور اور دُور دست ممالک سے، جہاں جہاں کے آموں کی تعریف سُنتا ہے، بیج اور پیڑ منگا کر لگاتا ہے۔ ایک سو چالیس بیگہ رقبہ کے گرد پختہ دیوار کھینچتا ہے۔ کیاریوں اور خیابانوں کا فرش کراتا ہے۔ باغ کے وسط میں دو سو بیس گز لمبا، دو سو گز چوڑا حوض بنواتا ہے۔ حوض کے اندر ماہتابی دو صفہ بائیس گز مربع رکھتا ہے۔ سرد اور سرد و گرم ہر قسم کے درخت لگاتا ہے تو اُس بے قدر و قیمت زمین کی یہ قدر و عظمت ہو جاتی ہے کہ شاہی روزنامچوں اور نیم سرکاری تاریخوں[8] میں اس کا اندراج کیا جاتا ہے۔

---

۱ بابر کے گل افشاں باغ کی تقلید تھی۔ (صفحہ ۸۸) نورافشاں کا رقبہ چالیس بیگہ چار سو ہ پختہ یا بائیس ایکڑ تین روڈ تیس پول تھا (مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ، از مولوی سعید احمد صفحہ ۹۷)۔ ۲ ایضاً، صفحہ ۲۲۔ ۳ ایضاً، صفحہ ۹۷، ۱۰۰۔ ترجمہ تزک جہانگیری از بیورج، صفحات ۷۶ و ۹۵۔ ۴ ایضاً، صفحہ ۹۹۔ و آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۰۵۔ ۵ ایضاً، صفحہ ۸۸۔ ۶ ایضاً، صفحہ ۷۷۔ ۷ جہانگیر نے بر زمانہ شاہزادگی خطاب دیا تھا (تزک، صفحہ ۱۲) اور اپنی کتاب میں متعدد جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ (صفحات ۶۸ و ۲۰۳)۔ مسٹر ہوجز Hodges انگریز سیاح و مصور اسی کی صوبہ داری بہار کے زمانہ (جولائی ۱۶۲۰ء) میں پٹنہ آئے تھے اس نے بہت اچھی طرح سے اُتارا حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا جو مراسلات کے خطوط سے پایا جاتا ہے کہ اُن پر مقرب خاں کا رعب بہت غالب تھا، تاہم وہ شریف کے جور و ت سے بہرہ نظر آتے ہیں۔ اپنے خطوط میں نواب کے بہت سے حالات لکھے ہیں۔ ۸ اقبال نامۂ جہانگیری، صفحہ ۱۲۵۔ لیکن ڈسٹرکٹ گزیٹیر مظفر نگر (جلد سوم مطبوعہ ۱۹۰۳ء) صفحہ ۲۰۰ میں تحریر ہے کہ حکیم مقرب خاں شاہجہاں کا حبیب خاص تھا۔ بادشاہ نے اس کو کیرانہ جاگیر میں دیا تھا۔ یوں [illegible] جس کے عہد سے کیرانہ کی ترقی اور رونق بڑھی ہے جس

(باقی صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ ہو)

خشک مزاج و خشک دماغ اورنگ زیب عالمگیر کے وقت کو بھی دیکھ لیجئے ایک ادنیٰ مثال فدائی خاں کا لگایا ہوا پنجور[1] کا باغ شملہ کے راستے پٹیالہ کے علاقہ میں موجود ہے۔ یہ امیر بادشاہ کا رضاعی اور

(بقیہ صفحہ ۳۸) نے یہاں بہت سی عمارتیں بنوائی تھیں اور یہ خوبصورت باغ بھی۔ جو اب بھی قصبہ کے شمال و شرق میں موجود ہے۔ اس میں اچھے سے اچھے میوہ دار درخت منگا کر لگائے تھے اور یہاں کے آم تو حسب روایت تاج المآثر دور دور تک دہلی میں مشہور و معروف ہے۔ بارہ دری جو مقرب خاں نے باغ میں بنوائی تھی، اب بے مرمت ہو رہی ہے۔

[ہم کو اس سے مطلب! ناصح کو کیا شکایت!   میرا ستانے والا مجھ کو ستا رہا ہے]

مقرب خاں نے نوے برس کی عمر پائی۔ یہی میر ملا سعد اللہ المتخلص بہ مسیحائے کیرانوی مشہور سخنور کا مربی تھا جنھوں نے رام اور سیتا کے سوانح عمری کے متعلق فارسی میں مثنوی لکھی تھی۔ مقرب خاں نے ان کو متبنّیٰ کیا تھا (نیز ملاحظہ ہو بیل صاحب کی ڈکشنری (صفحہ ۱۰۰))۔ دوسرے موقع پر (صفحہ ۲۰، گزیٹیر) اضافہ ہوتا ہے کہ مقرب خاں کا اصلی نام شیخ حسن یا حسّو تھا اور باپ کا نام شیخ بنّا یا بھینا۔ پانی پت کے باشندے تھے۔ عہد جہانگیری میں شہرت و عزت پائی اسی کے ساتھ مقرب خاں خطاب ملا۔ باپ بیٹے دونوں سرجن یعنی جراحی پیشہ تھے ۹۸۵ھ میں اکبر کے ایک زخم کا علاج کیا تھا جو ہرنوں کی لڑائی میں پہنچا تھا۔ مقرب خاں پہلے شاہزادہ سلیم کا حکیم تھا، جس کو تخت نشینی کے بعد اس نے گجرات کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ ۱۰۲۷ھ میں شاہزادہ شاہ جہاں وہاں بھیجا گیا تو بیمار پہنچا۔ ۱۰۲۸ھ میں آگرہ کی حکومت پر سرفراز ہوا۔ شاہ جہاں تخت پر بیٹھا تو مقرب خاں کو پنشن دے دی اور کیرانہ یعنی خود اس کا مسکن مع لواحقات کے پرگنوں کے جاگیر میں ملا۔ اس کا لڑکا رزق اللہ بھی شاہ جہاں کے زمانہ میں طبیب اور ہشت صدی منصب دار تھا۔ اورنگ زیب نے خطاب خانی مرحمت فرمایا تھا۔ ۱۰۷۹ھ میں رزق اللہ نے وفات پائی۔

اس کی تائید سیر المتاخرین سے ہوتی ہے۔ کشمیر سے واپسی کے بعد لاہور کے قریب چاندنی رات میں اکبر ہرنوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ناگہاں ایک آہو اپنے حریف کو چھوڑ کر اکبر کی طرف جھپٹا اور اس کی دونوں رانوں کے بیچ میں سینگ مار دیا۔ زخم ہو گیا۔ آماس بھی۔ درد شدت سے ہوا تھا۔ ابوالفضل کی رائے سے مقرب خاں معروف بہ شیخ بھینا جرح معالجہ میں مشغول ہوا۔ ایک مہینہ سات دن بعد پوری صحت ہو گئی۔ ابوالفضل اور مقرب خاں جنھوں نے ان دنوں بڑی خدمت کی تھی مورد عنایات و الطاف شاہی ہوئے (انتخاب مطبوعہ الہ آباد صفحہ ۱۲۴)۔

صفحہ ہذا۔ [1] پنجور بڑا زبردست تاریخی مقام ہے۔ سلاطین خلجی کے عہد میں اس کی اہمیت اور شان خاص کر بہت بڑھی ہوئی تھی۔ منہاج سراج کی "طبقات ناصری" میں اس کو ہستانی جگہ کو خوب نمایاں کیا گیا ہے۔

لاہور کی شاہی مسجد[1] کا مہتمم تعمیر تھا۔ اس باغ کے غصب کرتے وقت اس کو جو دشواریاں پیش آئیں وہ قدرتی موانع سے زیادہ انسانوں کے ہاتھ سے تھیں۔ راجاؤں نے ہوشیاری و چالاکی کے ساتھ مخالفت کی۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جسمانی امراض میں مبتلا کریہہ پیکر باغباں اور کشاورز فراہم کئے جن کو دیکھ کر محل کی بیگمیں اور کنیزیں سہم گئیں۔ پھر آب و ہوا کی رداءت و خرابی کے عجیب و غریب ہیبت ناک قصے اور بے بنیاد افسانے سنا سنا کر دل برداشتہ و خوف زدہ بنا دیا۔

مسٹر فرینچ[2] Mr. French نے دوران سفر سرکاری میں دہلی سے شملہ جاتے ہوئے اس کو دو مرتبہ ۱۸۳۸ء و ۳۹ میں دیکھا تھا۔ اس کے احاطہ کی بلند دیواروں کی جو سنگ و خشت کی تھیں اور شاندار دروازہ کی تحسین کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ باغ مختلف حصوں میں منقسم ہے جو ایک دوسرے سے چھ چھ فٹ سے لے کر سولہ سولہ فٹ تک اونچے ہوں گے۔ زمین کا بڑا رقبہ گھیر رکھا ہے۔ حوض بھی ہیں فوارے بھی۔ ہر ایک پر جدا جدا عمارتیں گنبد دار بنی ہیں۔ "چراغاں" کے لئے طاق ہیں۔ ایک عمارت قوس قزح کے رنگوں کی تیار کی گئی ہے۔[3]

یہ نمونۂ جنت باغ نزہت و لطافت کا ایک دھندلا سا خاکہ یا ایک بگڑا سا نقشہ رہ گیا ہے۔ سیلانی وہاں جاتے حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھتے اور یہ کہہ کر چلے آتے ہیں۔

---

[1] یہ مسجد لاہور کی بہترین عمارتوں میں سے ہے۔ ۱۰۸۴ھ (۱۶۷۳ء) میں چھ لاکھ روپے کے صرف سے تعمیر ہوئی تھی۔ پتھر اور تمام سامان پہلے سے فراہم تھا۔ ان کی قیمت اس کے علاوہ۔ ۱۸۴۰ء کے شدید زلزلہ میں بعض برجیوں اور آخری منزلوں کو نقصان شدید پہنچا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو تجدید کرنا پڑا۔ یہ عمارت بعض خصوصیات کے لحاظ سے بھی ممتاز ہے۔ اس کا نقشہ اس تکلف سے بنایا گیا اور یہ ایسے موقع پر اس اہتمام سے تیار کی گئی ہے کہ اگر مقبرۂ جہانگیر کے کسی مینار پر سے اس کے میناروں کو دیکھا جائے تو صرف تین مینارے نظر آتے ہیں، چوتھا نگاہ سے اوجھل رہتا ہے۔ مسلمانوں کے کمال فن اور ترقی و سلیقۂ تعمیر کی بے مثال یادگار ہے۔

[2] مسٹر فرینچ C. J. French اس زمانہ میں رائٹ آنریبل ارل آف آکلینڈ Rt. Hon'ble Earl of Auckland جی سی بی گورنر جنرل ہندوستان کے لشکر کیمپ میں متعین تھے۔ اسی حیثیت سے بالائی ہندوستان کا دورہ ۱۸۳۸ء و ۳۹ میں کیا تھا اور روزنامچے لکھتے گئے تھے جو معلومات تاریخی و مقامی سے مالا مال ہے۔ یہی سیاحت نامہ ۱۸۷۲ء میں شملہ سے شائع ہوا۔ اس کی وجہ پر نکتہ چین و عیب جو حضرات کے مآخذ کے لئے ایک سبق آموز و عبرت افزا قطعہ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔

[3] سیاحت نامہ صفحات ۳۸ و ۳۹۔

سرِ جنبش تھی گردِ راہ شاہوں کے لئے — خوب گاہِ ناز تھی تو کج کلاہوں کے لئے

آج ہیں تیری فضائیں سرد آہوں کے لئے

باغات کی نگہداشت، درستی حال و شادابی، درختوں کی آراستگی، پھلوں کی پرورش، نہروں کی حفاظت و روانی کے بارہ میں خود اورنگ زیب عالمگیر کو جس قدر فکر تھا اُس کی تحریرات و خطوط سے ظاہر ہے۔ عمدۃ الملک امیر الامرا اسد خان مدار المہام کو دار الخلافہ کے متعدد باغوں کے نام سے کر تاکید کرتا اور حکم دیتا ہے کہ "روزانہ جا کر اُن کو دیکھا کرو۔ زینت و شادابی کا خیال رکھو حوضوں کی صفائی پر بھی توجہ مبذول رہنا چاہئے۔ میں جب تک وہاں رہا ہر ایک کو خود دیکھتا اور منتظمین کو تاکید و تعقید کرتا رہتا تھا[1]"

دھول پور کے قریب، چولا سرائے سے دو میل پرے موضع نورآباد کے متصل وہ خوشنما پر فضا و سیع باغ موجود ہے جو عالمگیر نے تعمیر اور نصب کرایا تھا۔ پھاٹک کی پیشانی پر کتبہ لگا ہے۔ مادۂ تاریخ "دیدہ باغ جمال" سے اعداد ۱۱۰۰ نکلتے ہیں یہی سال ہجری تھا۔ ۱۶۸۸ء کے مطابق ہوتا ہے۔ بعد کو سنہ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں ایک شاہ زادی گنا بیگم اس میں دفن ہوئی تھی مقبرہ یادگار ہے[2]

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم۔ مغلیہ کے باغات کا تاریخی حصہ باوجود سعی اختصار کسی قدر بڑھ گیا اور پھر بھی:

موضوع تشنہ رہا۔ ادبی و تاریخی، روایتی و اعتقادی اور مذہبی (مختلف) پہلوؤں سے نگاہ نہ ڈالی جا سکی۔

جن حضرات نے عہد گزشتہ کے نیک نام اور بقائے دوام والے مغل بادشاہوں کے ویران باغوں کی رعنائیاں اور فردوس نظری دیکھی ہے، جن کو اُن کی ٹوٹی پھوٹی عمارتوں اور اینٹ پتھر میں کسی دلکشی کا سامان نظر آتا ہے، جو اِن عظیم الشان کھنڈروں کی ہیبت و جلالت سے متاثر ہوتے ہیں، جن کو اُن کے بچے کھچے، اُجاڑ گلزاروں کی مٹی ہوئی شان میں بھی حُسنِ مطلق کا جلوہ دکھائی دیتا ہے، اُن کے دلوں سے پوچھا جائے۔ اُن کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ مغرب محض آرٹ جانتا اور تیار کر سکتا ہے، وہی اُس کا دین و ایمان ہے بلکہ معبود و مسجود۔ مصنوعی نیرنگی و خوش الوانی اُس کی زندگی کی روح ہے اور نشاطِ حیات۔ مشرق اس کو سراسر نمائش و تکلف سمجھتا ہے۔ ان پیچ در پیچ نقوش اور مخلوط لونوں میں حقیقی دلربائی کی جھلک بھی نہیں پاتا۔ سچ یہ ہے کہ تخلیقِ حُسن اور جمال آفرینی کے اسباب بھی مغرب کے دسترس اور اُس کے تمام مصنوعات سے دور بلکہ یکسر مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ اس فن شریف (باغبانی) کا عروج و کمال جس کو دیکھنا ہو، وہ کشمیر کو

---

[1] کلماتِ طیبات، معروف بہ رقعات عالمگیری، رقعہ ۱۱۶، مطبوعہ نولکشور، صفحہ ۳۰۔ [2] بیل ڈکشنری، صفحہ ۹۸۔ و گلگشت مقبول، صفحہ ۱۲۴۔

دیکھے۔ وہاں کے باغات (نشاط، شالا مار، چشمہ شاہی، اور ی ناگ، وغیرہ) کو دیکھے۔ نورالدین جہانگیر اور نورجہاں کے حُسنِ سلیقہ اور ذوقِ سلیم کی ستائش کرے۔ وہ ان کو حسنِ محض اور فردوسِ مکمل پائے گا۔

اور کچھ وسعت تقریر بڑھادے یارب   سننے آیا ہے ہر اک اب مرا افسانہ جدا

اگر اس قدر تصدیع یا زحمت نظر بھی گوارا ہو تو مسز اسٹوارٹ Mrs. C. M. Villiers Stuart کی نہایت دلچسپ و نفیس کتاب "سلاطینِ مغل کے باغات" "Gardens of the Great Moghals" اور مسٹر نانالال مہتا کے فاضلانہ مقالہ Cont-ribution of Islam to Indian Culture "ہندوستان کے تمدن میں اسلام کی امداد" پر[1] ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہو گا۔ نیز پنڈت آنند کول کا دلچسپ رسالہ جو کشمیر کے باقیات (یعنی آثار قدیمہ) کے متعلق ہے اور اس رسالہ کی تمہید جو مسٹر دی این مہتا کے مشکبار قلم سے کشمیر کے باغات اور ہندو و مغل روایات پر نکلی ہے ملاحظہ طلب ہے۔

ہندوستان کے باغات میں خواہ وہ مسلمان بادشاہوں کے لگائے ہوں یا اُن کے حلقہ بگوش راجہ مہاراجاؤں کے، چند خصوصیات و ممیزات پائی جاتی ہیں۔ جاننے والے اُن کو بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ اولاً ایک مستحکم چار دیواری سے باغ کا محصور ہونا، خواہ مربع ہو خواہ مستطیل۔ عظیم الشان مرتفع پھاٹک، شایانِ مرتفع، اور کھڑکیاں۔ دوسرے آبیاری و آبپاشی کا خود ساختہ و خود اختیاری دیرپا انتظام، باغ کے اندر بہتی ہوئی نہروں اور دیگر مصنوعی و غیر قدرتی ذرائع سے کیا جانا۔ ان کی تفصیل یوں کی جا سکتی ہے کہ باغ کا پانی کہیں درختوں میں سے ہو کر کہیں آبشاروں کی شکل میں گزرتا ہے۔ کہیں صاف شفاف چادروں میں لپٹا ہوا آتا اور وسیع و عریض حوضوں میں گرتا ہے۔ تزک سے پایا جاتا ہے کہ شہنشاہ بابر پانی کے بارہ میں بڑی کاوش اور توجہ رکھتا تھا۔ ہندوستان میں رواں پانی کے نہ ملنے کی اس کو بڑی شکایت تھی۔ جگہ کا انتخاب اس کا مخصوص و اولین نقطۂ نظر تھا۔ اچھے سے اچھا اور بہتر سے بہتر موقع تلاش کر کے اپنی پسند و اطمینان کے مطابق پانی کی بافراط بہم رسانی

---

[1] مطبوعہ اخبار لیڈر، ۲۲ر جنوری ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۰۔ [2] Archaeological Remains in Kashmir by Pandit Anand Kaul and its Introduction by Mr. S. N. Mehta.

کا بندوبست کر لیتا تب کام شروع کرنے دیتا تھا۔[1]

اسی طرح شاہ جہاں نے جب اپنی استراحت دائمی کے لیے اسی سرزمین آگرہ کو پسند کیا ' ہتاب باغ کی بنیاد ڈالی[2] ۔ شاہانہ تعمیرات ' تکلفات[3] و اہتمامات شروع ہوئے ، تو پانی کا انتظام مقدم سمجھ کنووں کا ایک سلسلہ بنا ڈالا۔ اس کے حوضوں ' فواروں کے مقامات ' نالیوں اور نہروں کے ساتھ ساتھ تو بڑے بڑے کنوئیں اب تک قائم و برقرار ہیں[4] ۔ ان دو کے بعد تیسرا تھا رنگ و بو کا تناسب اور لطیف امتزاج ' حسین و جمیل ترتیب و ترکیبات کے ساتھ ان کی آراستگی ۔ درختوں کے لگانے میں یہ امر مدنظر رہتا تھا کہ طرفۃ العین میں باغ کی ہیئت و حیثیت مجموعی یا اُس کا نقشہ نگاہ کے سامنے آجائے ۔ باغ کے تمام حصے اور ٹکڑے مربع اور بجائے خود مکمل ہوتے تھے ۔ گرداگرد نہریں رواں ہوتیں ہر قسم کے پھلوں کے درخت بکثرت ہوتے تھے ' بالخصوص ایوانوں کے قریب ۔ بہشت بریں کی نقل یا قدرتِ مطلق کے کل کی تبیعت و تقلید میں ان نمونۂ بہشت باغوں کے حصے بھی آٹھ رکھے جاتے تھے ۔ یہ تعداد اگر کسی وجہ سے پوری نہ ہو سکتی تو بھی مساوی و یکساں حصوں میں تقسیم کیا جانا لابد تھا ۔

باغ کے وسط میں وہ یا کسی دوسرے موزوں محل پر ایک نفیس و خوبصورت بارہ دری یا کوشک کا تعمیر کیا جانا آرایش و آسایش کے لیے ناگزیر تھا۔ برساتوں اور گرمیوں میں بالخصوص ' بیگمات اور شہزادیاں ' سلاطین اور شہزادے اس بارہ دری میں ' یا باغ کے سایہ دار ٹھنڈے ٹھنڈے مرمریں چبوتروں پر استراحت فرماتے گرمی کی تپش و کلفت دور کرتے ۔ نہروں کا خوشگوار شیریں پانی کوثر و تسنیم کی طرح زیادی و فائی حوضوں سے نشاط انگیزیوں کا ضامن ہوتا ' سیلِ آب اور فرحت بخش تموج لطف اندوز کرتا۔ فتح مند جنگ آزما بڑے بڑے معرکے جھیل کر سفر و تعب اور تحملِ مشاق و مصائب کے بعد سکون و راحت کا ٹھکانا یہاں پاتے ۔ سرو و شمشاد کے درخت اپنے نیچے خوشنما زمردیں کیاریوں میں مختلف قسم کے پھولوں اور خوشبو غنچوں کو اکٹھا کر کے ایک فرشِ رنگ و بو بچھا دیتے۔

---

[1] کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک ' صفحہ ۶۰۔

[2] تاریخ تاج وغیرہ از منشی معین الدین احمد ' صفحہ ۵۰۔ و۔ آگرہ کی ہینڈ بک ' مؤلفہ کین صاحب ' صفحہ ۱۰۸۔ [3] منشی صاحب اسی تاریخ تاج (انگریزی) میں لکھتے ہیں کہ آگرہ کی اور شاہی عمارات کی طرح اس ہتاب باغ کی قیمتی چیزیں اور پتھر جاٹوں نے ڈیگ اور بھرت پور بھیج دئے تھے ۔ جو بچ رہے تھے بیچ ڈالے تھے ۔ (صفحہ ۱۱۰)۔ [4] تاریخ مذکور صفحہ ۱۱۱۔ آگرہ ہینڈ بک ' صفحہ ۱۰۵۔

قدرت کا رنگ و نور جلوہ فرما ہوتا۔ نکہت بیز و کیف آور نسیم و صبا سے تھکا ہوا دماغ معطر و تازہ ہو جاتا۔ سبزہ و گل کے تختے نگاہ کو شاداب کر دیتے۔

مست کر دیتی ہے مجھ کو فصل گل میں بوئے گل ۔۔۔ وجد میں لاتی ہے حالت سبزہ و اشجار کی

بھینی بھینی اس نے وہ نارنج کے پھولوں کی بو ۔۔۔ جس پہ سو جانیں فدا ہوں طبلۂ عطار کی

دور کیوں جائیے۔ اپنے ہی صوبہ (متحدہ) میں ہندوستان کے پرانے پایہ تخت آگرہ کو دیکھیے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی بہت سے باغات یا مٹے ہوؤں کے نشانات و آثار ملیں گے۔ (۱) رام باغ[1] 'نور چار باغ' سے ایک میل کے قریب جمنا کے ادھر ہے۔ مشہور ہے کہ بابر کے عہد میں لگایا گیا تھا۔ (۲) باغ خان عالم (مرزا برخوردار[2]) جو اکبر و جہانگیر کا معتمد اور مقرب امیر تھا۔ (۳) اعتماد الدولہ کے روضہ کا تین سو برس سے زندہ ہوئے نور جہاں نے لگایا تھا۔ (۴) مہتاب باغ، جس کو شاہ جہاں نے اپنی پس مرگ راحت کے لئے تجویز اور نذر کیا تھا[3]۔ (۵) بہشت آباد سکندرہ کو ملاحظہ کیجئے۔ جس کا باغ اور صحن پیش باغ، جو تاروں سے گھرا ہوا ہے اور محفوظ ہے۔ اس قسم کے احاطے اور اضافے پرانی دفتری اصطلاح میں 'خار بندی' کہلاتے تھے۔ محکمہ باغات کی تازہ ترین سرکاری رپورٹوں[4] میں اس کا رقبہ ۱۰۱/۵۰ ایکڑ لکھا ہے۔ مسٹر ڈنکن انجینیر ۱۲۳ ایکڑ کہتے[5]، کرنل ہیویل ۵۰ ایکڑ بتاتے ہیں، اور اس کی سنگین دیواروں کو چوبیس فیٹ بلند[6]۔ منشی معین الدین باغ کی وسعت ڈیڑھ سو ایکڑ اور اس کے جنوبی پھاٹک کی رفعت ستر فٹ سے زائد تحریر فرماتے ہیں[7]۔ اس میں شک نہیں کہ اس پنج منزلہ عمارت کی

---

[1] عہد بابری کی یادگار اور آرام گاہ ہے۔ ہمایوں کا قیام بھی یہاں رہا تھا۔ منشی معین الدین کی تاریخ تاج، صفحات ۷۔ الغایۃ ۱۰۹۔ [2] اکبر و جہانگیر کا شجاع امیر، سپہ سالار اور سفیر تھا۔ شاہ جہاں نے شش ہزاری منصب پر سرفراز کیا تھا۔ تاریخ تاج انگریزی از منشی معین الدین، صفحات ۹۰ لغایۃ ۱۰۰۔ [3] تاریخ مذکور صفحات ۱۱۰ و ۱۱۱۔ مآثر الامراء جلد اول، صفحات ۳۲۷ لغایۃ ۳۲۹۔ ۷۔ دیبلس ڈکشنری، صفحہ ۱۴۷۔ آگرہ ہینڈ بک مسٹر کین صاحب صفحہ ۱۰۳۔ جنرل کننگھم اور مسٹر کارلائل Carlleyle نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ [4] صوبہ جات متحدہ کے سرکاری باغات کی رپورٹ، بابتہ ۲۷-۱۹۲۹ء، ص ۱۱۔ [5] آگرہ ہینڈ بک، ص ۲۱۵۔ [6] آگرہ میں تین دن، صفحہ ۱۴۲۔

[7] تاریخ تاج و صنادید آگرہ (انگریزی)، صفحہ ۱۳۸۔

تکمیل کی نوبت ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں جہانگیر کے ہاتھوں پہنچی[1] اور اس نے ایک مرتبہ اس کا پورا نقشہ بھی بدل دیا تھا[2]۔ مگر دراصل[3] اکبر ہی نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی میں تعمیر کرانا شروع کیا تھا[4]۔ بے موقع سہی تاہم یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ تین ہزار سے زیادہ آدمی دس[5] سال تک روزانہ لگے رہے[6]۔ پندرہ لاکھ سے زیادہ صرف ہوا[7]۔ یہ عمارت ہندوؤں کے طرز تعمیر سے مشابہ ہے، اور اس وسیع و عریض کشور کی تمام تعمیرات میں ہندوستانی وضع و شان کی نمود کے لحاظ سے بے مثل و بے نظیر پائی جاتی ہے۔ جہاں گرد سیاح مسٹر سیوارڈ W. H. Seward کا بیان ہے کہ یہ یادگار چیوپس[8]

---

[1] تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد، صفحہ ۱۰۰۔ و تاریخ تاج از منشی معین الدین، صفحہ ۱۰۳۔ [2] آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۱۴ بحوالہ تزک جہانگیری۔ [3] مسٹر ڈبلیو ایچ سیوارڈ کا دنیا کے گرد سفر، صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۵ Travels Around the World by W. H. Seward [4] کین صاحب کی آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۱۴۔ و بیل صاحب کی اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری، صفحہ ۱۳۔ نیز سر ٹامس ہربرٹ Sir Thomas Herbert کی تحریر جنہوں نے ۱۶۲۶ء (عہد جہانگیری) میں اس کو دیکھا تھا۔ حال کے اکثر تاریخ نویسوں کی روایت یہی ہے۔ لیکن موجودہ کتبوں اور تزک جہانگیری یا اسی عہد کی کسی فارسی تاریخ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی کہ اکبر نے اپنے مقبرہ کی بنیاد خود ڈالی تھی اور بہشت آباد نام بھی خود رکھا تھا۔ جہانگیر نے سنہ جلوس کے سوانح میں اس کی تعمیر کا حال لکھا ہے، نیز دیگر ترمیمات و اصلاحات و تصرفات جدیدہ کا، جو سنہ ۱۳ج تک وقوع میں آئیں۔ البتہ اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ ۲۰ میں بہشت آباد روضۂ اکبر اور پندرہ لاکھ روپیہ خرچ اور بعض ترمیمات تعمیر کا مذکور ہے۔ ڈنکن صاحب انجینیر لکھتے ہیں کہ آج کل کے حساب سے مصارف تعمیر کا اندازہ نوے لاکھ ہوتا ہے۔ [5] کپتان ولیم ہاکنس Captain William Hawkins نے چودہ سال لکھے ہیں، جو ۱۶۰۸ء سے ۱۶۱۱ء تک آگرہ میں رہے تھے۔ [6] تاریخ جہانگیر، ص ۱۰۱۔ نیز تحریر کپتان ولیم ہاکنس۔ [7] تاریخ تاج، صفحہ ۳۸۔ و تزک جہانگیری، مطبوعہ علی گڑھ، صفحہ ۷۔ [8] مصر کے تین سب سے بڑے اہرام بہت زیادہ مشہور ہیں۔ یہ اہرام فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں یا مقبرے ہیں، جن میں کبھی حنوط کی ہوئی لاشیں رہتی تھیں، جو اب یورپ کے عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ قدامت دراز کے باعث سے اہرام (پیران کہن سال) کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے چیوپس سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اس کے دو تلفظ اور بھی ہیں، شی آپس اور کیوپس۔ یہی "ہرم اعظم" یا "ہرم اکبر" کہلاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۶ پر)

Cheops کے مقبرہ سے بھی زیادہ قابلِ تحسین ہے۔[1]

مقبرہ، اللہ اکبر! کیا عظیم الشان ہے ۔۔۔ آستانہ پُر جلالت آج تک دربان ہے

افسوس ہے کہ ۱۶۹۰ء میں جاٹوں کی وحشیانہ دست بُرد سے یہ بھی نہ بچی[2] اور اس کا احترام اور پاکی کا لحاظ نہ کیا گیا۔

اس بارہ میں نکولاؤ منوچی صاحب N Manucci (ترجمہ مسٹر آروین) پنڈت ایشرداس[3] ناگر کی "فتوحاتِ عالمگیری" کا اپنے نوٹ میں حوالہ دیتے ہیں[4]۔ مگر میرے سچے اور اچھے منوچی! تمہارے یقین دلانے سے کون ہندوستانی باور کرے گا کہ واقعی جاٹوں نے اکبر کی ہڈیاں باہر نکال کر پھینک نہیں، پھونک دی تھیں۔ وہ جیتے جی ہندوؤں کے اکثر شعائر و رسوم کو مانتا اور اُن کا ادب کرتا تھا۔ اگر تمہاری روایت سچ ہے تو مان لیجئے کہ اُس کی رہی سہی بعد مرگ کی آرزو بھی جاٹوں کی بدولت پوری ہو گئی یہ صحیح ہے اور ڈاکٹر فوہرر بھی اپنی کتاب

(بقیہ صفحہ ۴۵) رفعت و وسعت میں لاجواب ہے خوبصورتی و عمدگی میں اس درجہ ممتاز ہے کہ ہفت عجائبِ عالم میں شمار ہوتا ہے۔ دریائے نیل سے پانچ میل و مقام جیزہ کے سامنے دس میل پر شہر ممفس کے قریب واقع ہے۔ اس کو ملک خوفو فرعون مصر نے تعمیر کیا تھا جو کم از کم حضرت عیسیٰ سے ۲۹ سال پیشتر گزرا ہے بعض اس کا زمانہ اس سے بھی ایک ہزار برس پہلے بتاتے ہیں۔ سنگ خارا کے دو سو تین چبوترے نیچے اوپر بنا کر تعمیر کیا گیا ہے۔ سب سے نیچے کے چبوترہ کا ہر ضلع ۷۶۴ فیٹ لمبا اور چار فٹ آٹھ انچ بلند ہے۔ سب سے اوپر کے چبوترہ کا ہر پہلو تیس فٹ لمبا ہے اس میں بڑے بڑے پتھر لگے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا پتھر تیس فٹ طول میں ہوگا۔ پتھروں اور دیواروں پر کتبے کندے ہیں گویا تاریخی واقعات کا مرقع ہے۔ چبوترہ کی بلندی زمین سے لے کر چوٹی تک ۴۵۶ فٹ ہے۔ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے چوٹی کی سطح ایک نقطہ کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اُس کی چوڑائی بھی دس گز مربع ہے۔ اُس کی کرسی ساڑھے سولہ بیگہ زمین گھیرے ہوئے ہے۔ عربی کی مشہور و جامع کتاب "مستطرف" میں اس کے بانی کا نام سوید بن سرلاق بن سرباق لکھا ہے۔ محاضرات الادبا مطبوعہ مصر جز ثانی، صفحہ ۲۲۵ بھی ملاحظہ طلب ہے۔ یہ تفصیل اس لئے لکھ دی گئی تاکہ آپ اپنے ملک و وطن کی ایک عمارت کا اس اعجوبۂ عالم سے مقابلہ کر سکیں اور اُس پر ایک جہاندیدہ غیر ملک و قوم کے سیاح کا فضیلت دینا!۔ سفر نامہ:-

[2] دنیا کے گرد سفر، صفحہ ۲۲۵ Travels Around the World

[3] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد ایم اے، و۔ آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۲۱۹۔

[4] ایشور داس مورخ صفحہ ۱۳۳۔ [5] منوچی مترجمہ آروین صاحب Mr. William Irvine جلد اول صفحہ ۱۵۹ و جلد دوم صفحہ ۳۲۰۔

"آثار قدیمہ اور کتبات ہائے[1] میں تسلیم کرتے ہیں کہ مقبرہ کا بالائی حصہ کھلا ہوا ہے آسمان کا نیل گوں چتر اوپر۔ اس سے پہلے اس پر کمخواب اور سونے چاندی کے ستونوں کا زرتار و زرکار شامیانہ سایہ گستر رہتا تھا۔ یہ چبوترے پر آویزاں کیا جاتا۔ ارد گرد کے تمام شہ نشینوں اور صحنچیوں میں اسی شان و اہتمام کے قیمتی پردے اور چلمنیں ہر طرف لٹکتی تھیں۔ ان کو اور بہت سی قیمتی اشیاء و اسباب و زیورات کے ساتھ راجہ جواہر سنگھ جاٹ اڑا لے گیا۔ اسی جواہر سنگھ نے سنگ مرمر کے تختے اور منقوشات اکھاڑ کر ڈیگ کو بھیج دیے تھے۔" سُن اے زبردست راجا سُن!!

ایک بیکس کی لحد سے یہ صدا آتی ہے   یاد کر میری محبت کو، مجھے یاد نہ کر

سر کین اور مسٹر ڈکن نے بھی اس واقعہ کا دردناک ماتم کیا ہے[2]۔ [مقبرۂ خسرو کے چھپر کھٹ، شامیانے اور آرائشوں کے غائب ہونے کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔]

باز آمد آیئے، اور یہاں آس پاس کے شاہی وقت کے بعض باغات اور مقبروں کی اراضی[3] و وسعت کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

آگرہ کا رام باغ بیس ۲۰ ایکڑ   دراصل آرام باغ (نور افشاں) کا رقبہ [illegible][4] گز ۴ بسوہ پختہ یعنی [illegible] ایکڑ [illegible] روڈ ۲۳ پول ہے۔[4]

"   اعتماد الدولہ ۳۳ر۷ ایکڑ

"   تاج کا باغ اور اس کا مربع اکیس ایکڑ۔ مولوی سعید احمد مارہروی اس باغ کا رقبہ [illegible] بیگہ پختہ تحریر فرماتے ہیں جو [illegible] ایکڑ ۲ روڈ ۹ پول کے برابر ہوتا ہے۔[5]

اس کے بعد الٰہ آباد کو لیجیے، جس کے انفریڈ پارک نے حسب اندراج ڈسٹرکٹ گزیٹیر[6] ۱۳۳ [illegible] ایکڑ ایک

---

[1] ممالک مغربی و شمالی و اودھ، صفحہ ۷۰۔ [2] آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۲۱۹۔ جاٹوں اور مرہٹوں کی لوٹ اور بعض انگریز حکام جنرلوں اور گورنروں کی دستبرد کا بھی اس کتاب میں جا بجا ذکر آیا ہے۔ صفحات ۲۲۵، ۲۱۵، ۵۴، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۹۵، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۱۲ نوٹ، ۲۴۹، ۱۷۸۔ [3] رپورٹ انتظام باغات سرکاری بابتہ ۱۹۲۹-۳۰، صفحات ۱۰۱۔ [4] مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ، صفحہ ۲۲۔ [5] مرقع اکبرآباد یعنی تاریخ آگرہ، صفحہ ۵۰ نوٹ۔ [6] گزیٹیر سابق مطبوعہ [illegible]، صفحہ ۱۷۰۔ نیز امپیریل گزیٹیر، صفحہ ۲۱۵۔

روڈ ۲۹ بول اور بروے رپورٹ[1] سالانہ ۱۸۸،۲۵ ایکڑ رقبہ پایا ہے۔ مگر یہ بعدِ انقلاب کی عالی ہمتی اور وسیع حوصلگی تھی، یا حقیقتہً[2] اُن بدنصیب مسلمانوں کی یادگار، جنھوں نے ناعاقبت اندیشی سے سرکار انگریزی سے بغاوت کی لزامات کر براست۔ اس کی پاداش میں اپنے علاقہ، وجاہ داد سے محروم ہوئے۔ گاؤں ویران کر دیے گئے۔ گھروں پر گدھے کا ہل چل گیا۔ البتہ دس بارہ برس بعد شاہزادۂ عالی تبار ڈیوک آف ایڈنبرا[3] کی بدولت مٹنے والوں کو یہ فخر کرنے کا موقع ملا۔

نہ ہو قناعت شعار گلچیں، اسی سے قائم ہے شان تیری
وفورِ گل ہے اگر چمن میں، تو اور دامن دراز ہو جا

یہ تو زبانی اور مقامی روایات تھیں۔ سرکاری گزیٹیر[4] کا بیان ہے کہ "جب ڈیوک نے اپنے قدموں سے سرزمین پریاگ کو عزت بخشی تو اس مبارک دتھم کی یادگار میں ۱۸۷۰ء میں، اس پارک کی بنیاد ڈالی گئی۔ پہلے یہاں چھاؤنی تھی، مگر اُس کی آب و ہوا ناقص اور خراب رہتی تھی۔"

یہ بھی ایک قابل آشکار حقیقت ہے کہ جس سال ایک حقیر متنفس یعنی راقم سطور[5] نے اس عالم آب و گل میں قدم رکھا تھا، اُسی سال اس نزہت گاہ نے صفحۂ ہستی کو اپنے ظہور سے رونق بخشی تھی۔

خسرو باغ[6] کی بلند اور چوڑی پکی مضبوط چار دیواری جو اس قبے اور فراخ مربع رقبہ[7] کو گھیرے ہوئے ہے، جہانگیر کے حوصلہ اور سلیقۂ تعمیر کی یادگار ہے۔ باغ کے ہر طرف پختہ سڑک کافی وسیع موجود ہے۔ مقامی روایات اور مسٹر بیلی کی تحریر[8] سے پایا جاتا ہے کہ یہ عظیم و عریض سنگین احاطہ، عہد شاہزادگی میں جہانگیر کے حکم سے قلعہ کے باقی ماندہ[9] مصالح سنگ و خشت اور چونے سے بنا تھا۔ مسلمان مورخ اس بارہ میں قطعاً خاموش ہیں۔ ایک باغی شہزادے کی،

---

[1] رپورٹ سالانہ باغات سرکاری بابت ۳۰-۱۹۲۹ء، صفحہ ۵۔ [2] گزیٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۹۳ء، صفحہ ۱۰۷۔ [3] گزیٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۹۳ء، صفحہ ۱۰۷۔ [4] کلام مسطور ملقب بہ مقبولِ احمد مطبوعہ فتح گڑھ ۱۳۲۹ھ، صفحہ ۲۔ [5] گزیٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۵۔ [6] ڈاکٹر فوہرر کی تاریخ یادگارہائے قدیمہ اور اُن کے کتبات، جلد دوم، صفحہ ۱۳۰۔ [7] مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔ [8] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۳۴۰۔ [9] پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۵۰۔

[10] مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔

اگرچہ تقدیرات ازدی سے وُہ بعد کو شہنشاہ ہوگیا تھا اُس کے عالم شباب کی سرمستی، شوریدہ سری اور سرکشی کی کسی مستقل یادگار کا اپنی کتاب میں ذکر کرنا زمانہ شناس جاہ طلب اہل قلم کی شان کے منافی اور اُس کے مقاصد کے سراسر منافی تھا اور آئین مصلحت بینی کا ناقابل عفو سیاسی جرم۔

یہ ڈر لوگوں پہ غالب ہے کہ حالت میری غالب ہے — سُنی کا ذکر کیا آنکھوں کی دیکھی بھی نہیں کہتے

اُس زمانہ کے یورپین سیاحوں کے نزدیک بھی یہ جگہ محض آنے، دیکھنے اور گزر جانے کی چیز رہی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سراپردگیان عصمت وعفاف سلطانی کی اقامت کی وجہ سے بے چاروں کا گزر بھی یہاں نہ ہونے پاتا ہو۔

ایک مشہور روایت یہ ہے کہ خسرو باغ سے قلعہ تک اندر اندر جانے آنے کے لئے زمین دوز راستہ بنا ہوا تھا۔ شاہزادہ خسرو کی قبر کے قریب کی ایک کھڑکی اُس کا دہانہ بتائی جاتی ہے۔ یہ روایت خواہ کیسی ہی مقبول عام اور دیرینہ کیوں نہ ہو مگر اس کی تصدیق نہ تو کسی تحریر سے ہوتی ہے نہ پیرانِ کہن سال سے۔ نہ اُس کے نشان و آثار نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آگرہ و دہلی کی بعض عمارت کی طرح یہاں کے متعلق افواہ کی بھی کچھ بنیاد یا اصلیت رہی ہو مگر مجھے تو خسرو باغ کے اندر اور باہر ہر طرف گھوم پھر کر دیکھنے اور توجہ و غور کرنے سے کسی گہرے سُرنگ یا اندر اندر دور تک جانے والے راستہ کا پتہ اس وقت تک نہیں چلا۔

بحالت موجودہ یہ فرح بخش و مسرت خیز باغ ایشیا اور یورپ دونوں کے کمال فن اور باغبانی و چمن آرائی کا نفیس اور سُتھرا نمونہ ہے۔ ایک طرف لہلہاتے ہوئے شاداب و سرسبز تختے بابر اور جہانگیر کی تختہ بندی اور گلکاریوں کی یاد دلاتے ہیں۔ دوسری طرف صناعان فرنگ کی ہُنرمندی اور طرز جدید کی نظر فریب گلبندی و سبزہ کاری و مرغزاری کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد وانتر درکس کے لمبے چوڑے خوشنما قطع تالاب ہیں، جو صاف و شفاف اُمرت (پانی) سے لبالب بھرے ہوئے بہشت بریں[2] کی پاک و پاکیزہ نہروں اور حوضوں کی طرح موجیں مارتے اور باشندگان شہر و مضافات کے لئے آب خضر و آب حیوان کا کام دیتے ہیں۔

---

[1] پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مطبوعہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۵۰۔

[2] جوئے شہد و شیر و جوئے بادہ ہم در بہشت — کہ نعمت ہاست تنہا دل بکوثر داشتن

ہمارے صوبہ کے نامور اُستاد اور انشاپرداز پنڈت منوہر لال زتشی نے عہدہ داران تعلیم کی مجلس میں اُن کی ضروریات و فرائض پر توجہ دلاتے ہوئے فرمایا تھا کہ "الٰہ آباد کے کتنے ایسے معلم ہیں جو خسرو باغ جاتے ہیں، جو عہدِ مغلیہ کی نہایت دلچسپ باقیات سے ہے۔ جو اُس کو دیکھتے اور اُس کی خوبصورتی سے لطف اُٹھاتے ہیں۔" [1]

زیرک و فرزانہ سیاح جو ابھی قلعہ معلّے سے وہ اکبری ایوان اور جہانگیری قصر جن میں تین سو سال کے قریب تیمور [2] صاحب قران کی آل اولاد اقامت بزیر و احت گزیں رہی تھی، دیکھ کر آرہا ہے۔ انسانی فطرت کے تقضاء اور کارگاہ عالم کے مشاہدہ و تجربہ سے اُس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ بے اختیار پوچھ اُٹھتا ہے۔

اے اہلِ شہر ادفن ایں دودماں کجاست   خاکم بہ فرق، خوابگہ خسرواں کجاست؟

غریب الدیار کچھ جواب پاتا اور اسی پتہ پر چل دیتا ہے۔ وہ قلعہ یا پورب کی سمت سے آرہا ہے۔ شہر کے باہر پرانے قبرستانوں، پھر شہر کے کچھ قدیم اور مقابلتہً کم آباد و بے رونق محلّوں سے گزرتا ہے۔ پھر شاندار و فلک بوس محلات اور لکھ پتی مہاجنوں کی کوٹھیوں اور دولت مند تاجروں کی دورویہ دکانات، سیٹھ ساہوکاروں کے مالامال ایوانات دیکھتا جارہا ہے۔ بڑی اور خوب پُن دو سیع سڑک سے کوتوالی، پولیس اور متنوع و مختلف امراض و شکایتوں کے متعدد شفاخانوں کے سامنے سے ہوتا ہوا ضلع آباد کے بڑے اور فراخ و کشادہ احاطہ میں داخل ہوتا ہے۔ جس کو انیسویں صدی عیسوی کی کاروباری و منتظم حکمران جماعتوں نے روپیہ کی ضرورت اور آمدنی کے لالچ سے ایک بڑے بازار یا بالفاظ [3] پروفیسر بینی پرشاد "پھل بازار" کی شکل میں منتقل کر رکھا ہے۔ اُسکے دونوں جانب بھاری بھاری پھاٹک سوجود ہیں۔ پچھم والے پھاٹک کا کتبہ خود شاہد ہے [4] کہ اس کی تعمیر جہانگیر کے حکم سے ہوئی تھی۔

---

[1] اخبار لیڈر، ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء۔ [2] ہندوستان کے مغل بادشاہ براہ راست تیمور یا تمر لنگ کی نسل سے مانے جاتے ہیں جو فاتح مسد تھا، لیکن در اصل اُس کے پر پوتے بابر کو جہاں سب سے پہلے پیدا ہوا تھا کہ اُس نے اپنے ممالک و جاگیرات کو جو در ملک تاتاری (عرف توران) میں واقع تھیں مجبوراً اس سے کم وقت اور بادہ راحت بخش ہندوستان میں قیام اختیار فرمایا۔ [3] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۲۰۔ [4] ڈسٹرکٹ گزیٹیر قدیم صفحہ ۱۶۶۔ جدید صفحہ ۲۰۲۔

بفرمانِ شہنشاہِ جہانگیر — کہ زیبد ملکش از مہ تا بماہی
بنا شد ایں سرائے آسماں قدر — [کہ باد آباد خلد آباد شاہی]

آبادی شہر کا یہ حصّہ "خلد آباد" اِسی مناسبت سے کہلاتا ہے۔

چوتھے مصرع کے "باد آباد خلد آباد شاہی" سے عدد ۹۰۰ نکلتے ہیں۔ اگر "ک" کے عدد بیس اور اضافہ کرلئے جائیں جو فنِ تاریخ گوئی میں مذموم ہے تو ۹۹۵ ہوجائیں گے یہی خسرو کا سال ولادت ہے۔ اور "ہ" کے پانچ ملاکر ایک ہزار۔ جہانگیر اُس وقت تک نہ شہنشاہ ہوا تھا، نہ ملک کا حکمران مطلق تھا۔ البتہ آگے چل کر باپ سے باغی ودعاغی ہوکر اُس نے تمام شوکت وشانِ ملوکانہ[1] اختیار کرلی تھی۔ ممکن ہے کہ اسی رعایت سے یہ قطعہ کہا گیا ہو۔ [خلد آباد کا مزید تذکرہ اور اس نام کے متعلق بحث[2] "مقبرۂ خسرو" کے ذیل میں کی جائیگی]

گرینڈ ٹرنک روڈ[3] یعنی بادشاہی عہد کی بڑی سڑک بھی خلد آباد کے اندر سے ان ہی پھاٹکوں میں

---

[1] اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج" از کرنل جی بیسن Malleson صفحہ ۲۰۰، مطبوعہ آکسفورڈ، ۱۹۱۸ء۔
[2] تاریخ جہانگیر" از گلیڈون، صفحہ ۹۔ و۔ گزیٹیر جدید، صفحہ ۱۲۹۔ [3] شارعِ اعظم یا گرینڈ ٹرنک روڈ شیر شاہ بانی سلطنت افاغنہ کی یادگار ہے۔ مورخین اس کا عہد دولت شوال ۹۴۷ھ ۱۰ جنوری ۱۵۴۰ء سے ربیع الاول ۹۵۲ھ مئی ۱۵۴۵ء تک شمار فرماتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے اٹھارہ سال میں اپنی سلطنت کا باغ آباد کیا تھا۔ پانچ برس سے کم اُس کا لطف اُٹھایا۔ اسی حال میں بنگالے سے لے کر رہتاس (پنجاب) تک کہ چار مہینے کی مسافت تھی اور آگرہ سے لے کر منڈو (شادی آباد، دارالامارۃ مالوہ) تک پختہ سڑکیں بنوائیں۔ اُن پر ڈاک چوکیاں بٹھائیں۔ خود پنجاب میں ہوتا تو بھی بنگالہ کی رپورٹیں اور خبریں اُس کو دوسرے دن پہنچ جاتی تھیں۔ عوام کی آرام کے لئے تین ہزار میل تک سڑک کے دونوں طرف آم اور کھرنی کے سایہ دار میووں سے لدے ہوئے درخت لگے تھے۔ کوس کوس بھر پر پختہ مسجدیں، کنوئیں اور سرائیں موجود تھیں۔ ایک دروازے پر ہندو دوسرے پر مسلمان تعینات تھے جو وارد وصادر کو پانی پلاتے اور ہر قسم کی راحت پہنچاتے تھے۔ غریب مسافروں کے لئے دونوں وقت لنگر جاری رہتا تھا۔ انتظام وحفاظت کا یہ حال تھا کہ رستوں پر ایک بڑھیا بھی سونا اُچھالتی چلی جاتی تھی۔ جہاں چاہتی اپنا مال ومتاع رکھ کر سو جاتی چور یا رہزن کی مجال نہ تھی کہ کبھی نیت میں فتور آجائے۔ (بیل صاحب کی ڈکشنری، صفحہ ۲۵۸۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۲۷ و۔ دربارِ اکبری صفحہ ۱۵۱)۔ لیکن

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

میں ہوتی ہوئی جاتی ہے۔ بحالت موجودہ یہ سڑک پھاٹک کی اصلی سطحِ ارضی یا فرشِ آستان سے نمایاں طور پر اونچی ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ دروازوں کی ابتدائی اور نظر پسند بلندی میں اتنی ہی کمی ہو گئی ہے۔

خلد آباد کے یہ دونوں پھاٹک کم و بیش اب بھی اپنی اصلی حالت میں برقرار ہیں۔ ایک شرقی، باغ کے داہنے یعنی شہر و قلعہ کی طرف، دوسرا غربی، جو بائیں کو یعنی فتح پور، آگرہ و دہلی کی جانب ہے۔ یہ دُہری ڈانٹوں پر محرابی بنائے گئے تھے۔ ان کے بیرونی سمت یا بغل میں وہ اضافے بھی ہیں، جو بعض مقامات میں ڈیوڑھی اور بعض جگہ گھونگھٹ کہلاتے ہیں۔ ایک حصہ میں دوسرے سے گنجایش زیادہ ہے پتھر کے موٹے موٹے ٹکڑوں اور ڈھیلوں کو نہایت مضبوط اور دیرپا بنانے کے لیے چونے کی موٹی موٹی تہوں میں جڑا اور پیوست کر دیا ہے مگر اب ان میں شکستہ حالی نمودار ہے۔ جوڑ کھلتے جاتے اور ایک دوسرے کو چھوڑ رہے ہیں۔ بڑی بڑی جھاڑیاں اور اچھے خاصے درخت ان پر کھڑے ہیں گھانس بھی جمی ہوئی ہے۔ سارا بالائی حصہ سبز پوش اور جھیل زار بنا ہوا ہے۔ سڑک کے رفتہ رفتہ بلند ہوتے جانے سے ان کی اونچائی میں بھی واضح فرق ہو گیا ہے۔ بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ باہر والا یعنی پچھم طرف کا دروازہ شہر کی طرف والے سے اونچا تو کسی قدر کم مگر چوڑا کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔

ان دونوں پھاٹکوں پر خوبصورت ہلکی پھلکی کھلی ہوئی بُرجیاں (گلدستہ نما) دونوں طرف یک ایک بنی ہیں مگر جا بجا شکستہ اور بوسیدہ ہو رہی ہیں۔ پتھر نکل گئے ہیں۔ جھاڑ اور چھجوں کے تختے گر رہے ہیں۔ شہر والے دروازہ پر کوئی تحریر نہیں ہے۔ نہ ان دونوں میں سے کسی پر نقش و نگار یا اہتمام آرایش و تکلف کیا گیا تھا۔

خلد آباد کی سرا کا اصلی (آبادی کی سمت کا) پھاٹک[1] اب باقی نہیں۔ یہ باغ کے پھاٹک کے بالکل مقابل واقع تھا اور اُسی طرز و شان کا تعمیر ہوا تھا۔ کب گرا اور کیسے؟ چشم دید تو بوڑھے بوڑھے آدمی بھی نہیں بتا سکتے۔ ہاں یاد سے پہلے کی بات سُنی سُنائی کہتے ہیں کہ ہنگامۂ بغاوت کے زور یا در پیش ہونے کے وقت باغیوں کے استعمال کے لیے فوجی و جنگی ضرورتوں یا مصلحتوں سے حکومت نے دست شفقت پھیرا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی بلند و

(بقیہ صفحہ ۵۱)
شیر شاہ سے پہلے بھی مسلمان بادشاہوں کو اس قسم کا شوق رہا ہے۔ سکندر لودی نے ۹۱۵ھ (۱۵۰۹ء) میں آگرہ سے دھولپور تک سرائے بہ منزل محلات اور باغات تعمیر کرائے تھے۔ (دربار اکبری، ص ۵۹۸ ۔ نیز اوہماتِ مغل، صفحہ ۲۶۸) ۔ ستہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، جلد ۲۲، صفحہ ۱۱۔ صفحہ ہذا:۔ لہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، جلد ۲۲، مطبوعہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۰۲۔

مستحکم عمارت کا گر جانا یا گرایا جانا آسان نہ تھا۔ بہر صورت

آپ کا تھا گناہ گار، میں نہ کہ ابر و باد کا ۔۔۔ میرا مزار تھا جہاں، اب وہ زمین صاف ہے

شاید دنیا اور اہل دنیا کا یہی دستور چلا آیا ہے۔ کلکٹری شہر کی عمارت جس مقام پر بنائی گئی ہے، یہاں جمال پور کا مشہور زبردست ٹیلا تھا۔ اور اس پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ جس کی بدولت یہ جگہ ہمیشہ انہدام و بربادی سے محفوظ رہی تھی لیکن بغاوت کے زمانہ میں فوجی اغراض سے یہ مسجد گرا دی گئی۔ اور بعد کو بنیادیں کھودنے پر ظاہر ہوا کہ مسجد بھی کسی تباہ شدہ مندر کے خرابہ پر تعمیر ہوئی تھی[1]۔

مگر اس دروازہ کے انہدام کے متعلق کوئی تحریر یا سند نہیں پائی جاتی۔ اس وقت یہ جگہ ایسی ہی صاف و ہموار ہو رہی ہے کہ کسی عظیم الشان عمارت کے کبھی یہاں ہونے کے آثار بھی باقی نہیں۔ ممکن ہے کہ خود رو تعمیرات اور بے سلسلہ و بدقطع مکانات کے نیچے دبے ہوئے ہوں۔ بشپ ہیبر صاحب کی تحریر اس کے موجود ہونے اور دیکھنے پر دلالت کرتی ہے۔ نئے ڈسٹرکٹ گزیٹیر نے اپنے ماخذ اور ذریعہ علم و استناد کا حوالہ نہیں دیا۔ پرانے گزیٹیر میں صاف لکھا ہے کہ "سرا کے دروازے پر یہ قطعہ فارسی لگا تھا۔ جو خسرو باغ کے اصلی پھاٹک کے کتبہ کے بالکل سامنے تھا[2]۔" اسی کتاب میں اس قطعہ (ہرمان والے) کا چوتھا مصرع بھی مندرج ہے[3]۔

خلد آباد کی سرا کو پادری ہیبر صاحب نے ۱۸۲۵ء میں ایک گئی گزری بلکہ گری پڑی حالت میں دیکھا تھا۔ تاہم اس کی نسبت لکھتے ہیں[4] کہ "یہ ایک نوبل (عالیشان) مربع ہے۔ جس کے چار عمدہ گاتھک وضع کے پھاٹک ہیں۔ جس کے گرد قلعہ بند دیوار ہے۔ اور جس کے اندر وارد و صادر کے قیام و راحت کے لئے

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر ستمبرا صفحہ ۲۰۹۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۲۲۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۲۲۔ [4] سیاحت نامہ، جلد اوّل، صفحہ ۲۴۴۔

Narrative of a journey through the Upper Provinces of India from Calcutta to Bombay in 1824-25, London, 1828, by Rt. Revd. Reginald Heber, D.D., Lord Bishop of Calcutta.

حجرے بنے ہیں۔"

ایک صدی اور گزرنے پر یہ حالت ہے کہ سرائے کی پرانی سنگین دیوار تو تین سمت کی باقی ہے، مگر خود سرا جا بجا گر گئی ہے۔ زمانہ کی روش بدل جانے اور آیند و روند کی عارضی ضرورت قیام باقی نہ رہنے کی وجہ سے اس نزدگاہِ عوام کا اصلی مقصود بھی مفقود ہو چکا ہے۔ کاروانسرا کا کچھ حصہ جو بھٹیاروں کے تصرف میں پُرانے وقتوں سے چلا آتا تھا، اب بھی ہے۔ جس طرح شاہی زمانہ سے معافی تھی، بدستور ہے۔ ان کوٹھریوں کی نگہداشت و مرمت بھی انھیں کے ذمہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے، نزول اور سرکاری مقبوضہ ہے، وہ میونسپلٹی کے متعلق ہے۔ بلدیہ کے زیر اہتمام سرا کے وسط (صحن) میں کھانے پینے کی چیزوں اور سوکھی پھلوں اور پیداواروں کی ہاٹ لگتی ہے۔ اس (بازار) کی آمدنی چار ہزار سالانہ ہوتی ہے، جو میونسپلٹی لیتی ہے۔ سرا کے وسیع و فراخ صحن میں موقع بے موقع مختلف قسم و وضع کی کچھ خوشنما اور کچھ نازیب عمارتیں اور دکانیں بن گئی ہیں، اور بنتی جاتی ہیں۔ سڑک والا دروازہ پشت کی جانب سادہ اور پُرانا ہے۔ خسرو باغ کی طرف اس وقت کوئی دروازہ نہیں ہے۔ نہ دیوار ہے، نہ کوئی روک ہے۔ سرا کا یہ رُخ کھلا ہوا ہے۔ بڑی سڑک رواں ہے۔ سڑک کے اس سمت جدھر کبھی سرا کا بڑا پھاٹک رہا ہوگا، کچھ معمولی طرز کی دکانیں باغ کے رُخ جا بجا بن گئی ہیں۔ جو باغ کی دلفریبی، پھاٹک کی شان اور ارباب حل و عقد کے سلیقۂ والتفات پر بدنما داغ ہیں۔

اسی گزرنے والی سڑک کے پورب پچھم دونوں جانب دروازے ہیں، جو خلد آباد کے پھاٹک کہلاتے ہیں، جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں۔ قطعۂ تاریخ کے صرف تین مصرعے اس وقت کھلے ہوئے ہیں۔ چوتھا (یعنی آخر کا) غائب ہے۔ کبھی مجھ سے ایک برخود غلط قدیمی واقف کار ہی نے کہا تھا کہ ایک بڑے حاکم کی آمد کے ہنگامے یا کسی محفل کے وقت درستی کی ضرورت سمجھی گئی تھی۔ حُسنِ اتفاق سے معمولی مرمت کی نوبت بھی پہنچی تھی۔ لیکن اس طرح کر اس ٹکڑے پر بدنما استر کرنے میں پورا ایک مصرعہ غائب ہو گیا۔

ہم دل میں خوش کہ سبزۂ تربت ہرا ہوا   وہ اس ادا سے روئے کہ پلکیں بھی نم نہیں

اُس بدگمان نااندیش کا یہ کہنا کہ یہ چاروں مصرعے ایک سیدھی لائن میں ایک بڑے لمبے پتھر پر کھدے ہوئے تھے صریحاً غلط ہے۔ پہلے ہی نظر ڈالنے سے اس نظریہ کی لغویت روشن ہو جاتی ہے۔ پہلے تینوں مصرعے

(۲)

خسرو باغ کا بڑا پھاٹک

(ایفرمان - یا کہ زبید - ۳۲ بنا شد) ایک بڑے اور لمبے مگر کم چوڑے تختے پر تیمور کے، نہایت خوش قلم، جلی، اُبھرے ہوئے حروف میں بخط نستعلیق کندہ ہیں۔ درست حالت میں ہیں۔ کچھ فاصلے سے بھی صاف پڑھے جاتے ہیں۔ ہر مصرع ایک جداگانہ خوشنما جدول کے اندر محصور ہے جس کے دائیں بائیں دونوں پہلوؤں پر بیل بنا کر ایک لطف پیدا کر دیا گیا ہے۔ ان کی ایک لائن ہے۔ طرز تحریر گنجان ہے۔ چپ و راست مساوی، ہاتھ ہاتھ بھر کے قریب جگہ چھٹی ہوئی ہے۔ بیچ والا یعنی دوسرا مصرع ٹھیک محراب کی نوک پر، دروازہ کے پھول کے اوپر، وسط میں آیا ہے۔ اس مکتوب و منقوش پتھر کے نیچے ایک سادہ اور کچھ کم لمبی بڑی پتھر کی لگی ہے۔ جس کی ہیئت و کیفیت گواہ ہے کہ یہ بھی اُسی وقت کی ہے۔ بعد کو بدلی یا لگائی نہیں گئی ہے۔ نہ اس پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ نہ ان دونوں پتھروں پر کوئی استرکاری ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ سرائے کے گرائے ہوئے پھاٹک پر ثبت رہا ہو مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مصرع اخیر یہاں شروع ہی سے نہیں لکھا گیا تھا، ورنہ مصرعوں کی ترتیب اور تحریر کی نشست کُلیۃً جدا ہوتی۔ آخر کیوں چھوڑ دیا گیا۔ کون سی ضرورت یا مصلحت اس کی داعی تھی، ایک حل طلب معمّا ہے۔ بدیہی طور پر اس کے متعدد و مختلف وجوہ ہو سکتے ہیں۔ ایک فلسفی چاہے تو ان پر طبع آزمائی کرے۔ مورخ کا کام صرف گزرے ہوئے گمشدہ از بام واقعات کو بے کم و کاست راست راست نقل کر دینا ہے۔ ماہیت اشیاء کا تجسس اور رازہائے سربستہ کی جستجو اور اُن کا ادراک، اُس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے۔ وہ کہہ دے گا کہ چوتھا مصرع بخوبی معروف و مقبول عوام ہے۔ اس کو یاد رکھنے کے لئے اب قلم و سیاہی کی مدد درکار نہیں۔ جس طرح ساڑھے تین سو برس سے سینہ بہ سینہ محفوظ چلا آتا ہے۔ ابھی صدیوں تک زبان پر رہے گا۔

سرائے کے سامنے وسط میں پہنچتے ہی شمالی جانب خسرو باغ کا بلند بادشاہی پھاٹک پیش نظر ہوتا ہے۔ اس عمارت کا انداز تعمیر، خوش وضعی و خوش نمائی، یورپ کے نامور سیاحوں اور انجینیروں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔[1]

میں نے دیکھا ہے کہ یہاں پہنچ کر صاحب نظر سیاح متحیر ہو جاتا ہے۔ پھاٹک کی رفعت و عظمت، بلندی و شان، اُس کو مبہوت بنا دیتی ہے۔ اب نہ وہ جہانگیر باقی ہے، جو کبھی بلند ارادہ شاہزادہ تھا۔ جو شاہانہ تمکنت،

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحات ۲۰۲ و ۲۰۳ و۔ پریاگ یا الٰہ آباد کی ہینڈ بک، صفحہ ۵۰۔

احتشام و وجاہت سے الہ آباد میں وقت گزرتا اور ہندوستان کے تاج و تخت کے خالی ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ نہ وہ اولو العزم و حوصلہ مند خسرو سلطان نظر آتا ہے، جو مرتے دم بھی سلطنت اور حکومت کا سودا اپنے سر میں لے گیا۔ اس وقت ہر طرف خاموشی و سکون چھایا ہوا ہے۔ لیکن دیکھنے والا اگر لرزہ براندام نہیں ہو جاتا تاہم یہاں کی مجموعی کیفیت سے متاثر و مرعوب ہوتا اور اس کے جزو و کل پر بڑی عبرت و حسرت کی نگاہ ڈالتا ہے۔

یاد ہے وہ مبارک صبح جب میں پہلے پہل اس موقع پر پہنچا تھا۔ دروازہ کی شان و عظمت سے نظر افروز اور نیم ویران باغ کی نسیم و صبا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ یہ اشعار بے اختیار میری زبان پر آ گئے۔

اے باد بامدادی! خوش آمدی بہ شادی — پیوند روح کردی! پیغام عیش دادی

بر بوستاں گزشتی یا در بہشت بودی — شاد آمدی و خرم! فرخندہ بخت بادی

تا من درین سرایم ایں در ندیدہ بودم — کامروز پیش چشم در بوستاں کشادی

اس رفیع و منیع پھاٹک کے مقابلہ میں عہد مغلیہ کے دو دروازے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ایک فتح پور سیکری کا بلند دروازہ۔ جو اکبری تعمیرات میں خاص شرف و فضیلت کا مالک ہے اور فتوحات دکن کی یادگار میں بنا تھا۔ مسٹر فرگوسن کہتے ہیں کہ شاہانہ عظمت و جلالت رکھتا ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے دروازوں میں اس کا درجہ ممتاز ہے[1]۔ جس کی نسبت مسٹر فریچ لکھتے ہیں کہ یہ جنوب میں ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ یہ ایک عظیم الشان پھاٹک ہے، جو دنیا بھر کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ جلالت والے پھاٹکوں میں ہے تمام پھاٹکوں سے زیادہ عظیم الشان ہے۔"[2] بقول مسٹر بیل یہ پھاٹک "بلند دروازہ" یا "دروازہ کلاں" کے نام سے بالکل بجا مشہور ہے[3]۔ محقق و مورخ منشی معین الدین کا بیان ہے کہ "بلند دروازہ" خوشنمائی

---

[1] دور رزنی سے بیستہ۔ [2] ... صفحہ ۲۲۸۔ خواجہ ابو الحسن معتمد خاں نے جہانگیر نامہ میں صفحہ ۱۱۹ پر پوری تفصیل اور بڑی تعریف لکھی ہے مسٹر ایڈمنڈ اسمتھ Edmund Smith نے اپنی کتاب "فتح پور سیکری" میں اور مسٹر بیورج نے ترجمہ تزک جہانگیری مطبوعہ ۱۹۱۴ء حصہ دوم صفحہ ۷۱ نوٹ میں موجودہ حالات و تفصیلات نقل فرمائے ہیں۔ یہی دروازہ بھی کہلاتا ہے ... ۱۰۲۹ھ ... کی تعمیر ہے۔ [3] سیاحت نامہ بالائی ہند صفحہ ۱۴۱۔ [4] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۶۳

رفعت و منزلت میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے ارتفاع اور شان کو دیکھ کر

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے   زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

بے ساختہ زباں سے نکل جاتا ہے۔ فی الواقع یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے ایک پہاڑ پر دوسرا پہاڑ کھڑا کر دیا ہے۔" [1]

دوسرا شادی آباد مانڈو (مالوہ) کا عالمگیری دروازہ۔ عہد اورنگ زیب میں جب شہر پناہ کی مرمت و درستی ہوئی تو یہ دروازہ بڑھایا گیا تھا۔ پروفیسر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ بلندی و خوبصورتی میں یہ بھی فتح پور والے دروازے سے کسی طرح کم نہیں۔ [2]

شاہی شارع اعظم اس پھاٹک کے سامنے گزرتا ہے، مگر اس وقت سطح آستان اور باغ کی زمین سے بہت اونچا ہو رہا ہے، جس سے دروازہ کی شان و رفعت اور کسی قدر خوبی و خوش نمائی میں فرق آگیا ہے۔

یہ نمونس عمارت ابتدائی زمانہ مغول کی عمارات کی وضع پر ہے، جس میں افغانی اور ہندوانہ طرز تعمیر کی آمیزش نمایاں ہے۔ جو خصوصیات اکبری و جہانگیری عہد کی تعمیرات کے ساتھ وابستہ ہیں، یہاں بھی کافی و وافی موجود ہیں۔

پھاٹک پر یہ پتھر نصب ہے، جس سے واضح ہے کہ اس کا مہتمم تعمیر آقا رضا اس عہد کا شاہی معمار تھا۔ پوری تحریر تو ایک ہی سطر میں ہے مگر جا بجا نقوش و جداول بنا دینے سے کئی ٹکڑے ہو گئے ہیں۔

[1] معین الآثار، صفحہ ۲۶۔ [2] سالانہ کارواں، ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۲۶۔

جدید گزیٹیر کا مؤلف لکھتا ہے کہ اس یحاتلک کا تعمیر کنندہ شاہی معمار آغا رضا کا شاگرد تھا۔[1]

مزید برآں حسن آغا رضا کے اور کیا معنی ہوئی بتا سکے گا؟ مگر فی الواقع یہ ذی علم گزیٹیر نویس کی ذہانت نہیں، بلکہ اس بااستعداد دفتر کے اہلکار یا بابو کی خوش فہمی و بیاقت ہوگی جو فارسی کے کتابوں کو پڑھنے اور ترجمے کے لئے مامور ہوا ہوگا۔

آغا رضا مصور و نقشہ ساز تھا۔ مہندس و معمار نہیں۔ تاہم اپنی ذہانت و کمال فن و دستکاری کی ایسی یادگار چھوڑ گیا ہے جو ابھی صدیوں تک اس کے بقائے نام کی ضامن رہے گی۔ لیکن باغ کے آنے جانے والوں میں سے کتنے ایسے شخص نکلیں گے جن کو اس باکمال کے حالات سے آگاہی ہو، یا جاننے کے خواہشمند ہوں!

وہ بیکس ہیں، ہمیں دنیا نے چھوڑا، ہم نے دنیا کو ۔ عالم ہم سے واقف ہے نہ ہم واقف ہیں عالم سے

اس لئے خسرو باغ کی تاریخ لکھنے والے کا دینی فرض ہے کہ اس ہنرمند کو تخصیص و تقدیم کے ساتھ یاد کرے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اس کے حالات ہماری متداول و متعارف تاریخوں میں نہیں ملتے۔ بہت سی فارسی اور انگریزی کی کتابوں اور رسالوں کی ورق گردانی کے بعد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک مصور تھا، جہانگیر کے دامنِ دولت کا ممتاز وابستہ اور عہد شاہزادگی کا مقرب رکن۔ اپنے خاندانی جوہر اور کمال سے بھی مالامال تھا۔[3]

اس کا باپ یہ خود، اس کا بیٹا تینوں اپنے اپنے زمانے کی قوت ناموروصاحب فن گزرے ہیں۔ تعجب خیز اسی قدر ہے کہ خود اس کے تذکرہ سے زیادہ آغا رضا کے باپ و بیٹے دونوں کا ذکر مختلف تاریخوں میں موجود

۱؎ ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید ۱۹۰۴ء، صفحہ ۲۰۲۔ ۲؎ برٹش کا نچ میلا پن۔ اگست ۱۹۳۳ء۔ ۲؎ ایضاً اگست ۱۹۳۵ء۔

3 Laurence Binyon's "The Court Painting of the Grand Moguls"

4 Laurence Binyon's "The Persian Painting"

5 Journal of the Royal Asiatic Society, for April, 1935

محفوظ ہے۔ آقا رضا کے باپ مولانا علی اصغر کاشی تھے۔ جن کی نسبت مرزا اسکندر (منشی شاہ عباس بزرگ) نے عالم آرائے عباسی میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ سلطان ابراہیم مرزا کے شرف خدمت تھے۔ اسماعیل مرزا نے کتب خانہ کی نگہداشت اسپرد کی تھی۔ وہ بے مثل دست و بے نظیر صاحب مصور تھے۔ تصویروں کے درست کرنے اور رنگ بھرنے میں یکتا تھے۔ پہاڑوں اور درختوں کے بنانے میں تمام برادروں سے بڑھے ہوئے تھے[1]

آقا رضا کا بیٹا ابو الحسن بھی مصور تھا جس نے جہانگیر کے دربار تخت نشینی کی تصویر بنا کر پیش کی تھی اور نادر الزمانی خطاب پایا تھا۔ جہانگیر نے اس تصویر اور اس مصور کی جس قدر توصیف و تحسین کی ہے "اس کی مثال کسی دوسری جگہ پائی نہیں جاتی۔ اس زمانہ تک کے سابق و موجود نامور ترین مصوروں میں سب سے برتر بتایا ہے" حتی کہ باپ (آقا رضا) کی ہنرمندی کی حقیقت بھی کھول دی ہے۔ لکھا ہے کہ ابو الحسن کا باپ آقا رضای مروی زمانہ شاہزادگی میں میری ملازمت میں داخل ہوا تھا۔ اس سے ابو الحسن کو میری درگاہ کی خانہ زادگی کا شرف حاصل ہے۔ لیکن بیٹے کو باپ کے کام و ہنر سے قطعاً کوئی مناسبت حاصل نہیں، یہاں تک کہ دونوں کو ایک عالم سے شمار نہیں کیا جا سکتا[2]

تزک کے اصل فقرہ "پدرش آقا رضائی مروی در زمان شاہزادگی من بخدمت من پیوستہ" میں ایک لفظ "مروی" میں اختلاف ہے۔ سید احمد خان مرحوم نے اس کو مروی (مرو کا) پڑھا اور چھاپا ہے[3]۔ مسٹر ہنری بیورج Henry Beveridge تزک کے انگریزی ترجمہ میں فرماتے ہیں کہ قلمی نسخوں میں "ہروی (ہرات کا)" لکھا ہے[4]۔ جامع ورق کے آبائی کتاب خانہ کے مخطوطہ میں "مروی" ایک مروڈ جاتا ہے[5]

بہر حال باپ کاشان کا رہا ہو خود آقا رضا اصفہان یا دار السلطنت میں مرو سے پہنچا ہو یا ہرات سے؛ اس کی اصل و نسل کا کہیں مذکور نہیں۔ ہندوستان آنے سے پہلے اس کی حالت اور گزران کیسی تھی؟ مولف عالم آرائی کا بیان ہے کہ آقا رضا نے فن تصویر و صورت کشی و یک رنگی سازی اور چہرہ کشائی میں بڑی ترقی

---

[1] جلد اول، صفحہ ۱۲۰۔ [2] مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۲۲۵، ترجمہ انگریزی ایڈیشن Alexander Rogers صفحہ ۲۰۔ [3] مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۲۲۳۔ [4] مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء، حصہ دوم صفحہ ۲۰ نوٹ

[5] موجودہ قصبہ صدر ضلع فرخ آباد۔

کی ہے۔ وہ اعجوبۂ وقت ہوگیا ہے اور اس دور زمانہ میں مسلم الثبوت ہے۔ اُفتادِ طبع سے مجبور ہے۔ باوجود زیرکی قلم ہمیشہ
زور آزمائی اور ورزش گیری میں مصروف رہتا اور اسی طرح کی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ اہلِ علم و فن کی صحبت اور مستعد
والوں سے دور رہنے اور پہلوانوں سے میل جول اور ارتباط رکھنے کا خوگر ہے۔ بدمزاجی، تنگ حوصلگی اور استغنا اُس کا
شیوہ ہے۔ طبیعت میں استغنا چھایا ہوا ہے۔ اس طرف کچھ دن سے اپنی ہرزہ درآئی و بے ہودگی سے تو باز آ گیا ہے،
تاہم کام کی طرف توجہ کم ہے۔ بارگاہِ شاہی (والیِ ایران) میں پہنچ کر مورد الطاف بھی ہوا اور بڑے اعزاز و مراتب پائے تھے۔
لیکن اپنے ناہنجار اطوار کی بدولت رسوخ و اعتبار حاصل نہ کر سکا۔ ہمیشہ مفلس و پریشان رہا۔ ایران کے قیام سے
دل برداشتہ اور شاکی رہتا ہے۔

طالب من ہمہ شاہان جہان اند و مرا — در صفاہان جگر از بہر معیشت خون شد[1]

اس کے ہندوستان چلے آنے کا سبب ظاہر ہے۔ وہ اسی ملک میں کہیں پیوند خاک ہوا ہوگا، جس کے
بتانے سے صفحات تاریخ قاصر ہیں۔

آقا رضا کے متعلق رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے عالمانہ مقالہ[2] میں مسٹر نکولس ان مارٹنووچ
Nicholas N Martinovitch کی تحریر کے بعض اجزا مزید تحقیق و صحت کے محتاج ہیں۔
فاضل مستشرق کو کیا خبر تھی کہ سنہ ۱۰۱۱ھ میں یہ چابک دست نقاش (آقا رضا) الہ آباد میں وارد تھا۔ وہ مو قلم صورت کشی
و رنگ فروزی و روغن آرائی چھوڑ کر سنگ و خشت سے سر مارتا رہا اور معماری و اُستاد کاری میں مشغول و مصروف
تھا۔ وہ سنہ ۱۰۱۱ کو ۱۱۰۱ لکھنے کے بجائے ہندسوں میں پورا لکھتا تھا۔ وہ جہانگیر کے تیرھویں سال جلوس سے پہلے دنیا
اور اہلِ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ سنہ ۱۰۲۳ یا اس کے قریب کی تصویریں اُس کے قلم کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ صحیح
ہے کہ کم از کم سات مصور خطا اُس زمانہ میں رضا نام کے گزرے ہیں۔
خسرو باغ کے بیرونی جانب فصیل یا چار دیواری سے متصل پھاٹک کے دونوں طرف سنگین دکانیں

---

[1] تاریخ عالم آرائے عباسی جلد اول صفحہ ۱۲۸۔ [2] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، بابتہ ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء،
صفحات ۲۹۰ تا ۲۹۸۔

برابر بنی ہوئی تھیں، جو کسی نہ کسی حال میں اب بھی موجود ہیں۔ ان کی وضع و ساخت سے پایا جاتا ہے کہ باغ کے متعلق تھیں۔ سرائے صد آباد کا جزو نہ رہی ہوں گی۔ یہ دکانیں یا ڈیہرے حجرے شہر کی آبادی کے اندر ہونے سے کم و بیش اب تک آباد ہیں، پہلی سی رونق البتہ باقی نہیں۔ نہ ان میں کوئی اعلیٰ قسم کا سامان تجارت یا عمدہ مال و اسباب رکھا جاتا ہے۔ جائے سکونت کے طور پر مختلف پیشہ وروں کے مصرف میں ہیں۔ اس لئے صفائی اور ستھراپن مفقود ہے، خرابی و شکستہ حالی نمودار۔

اے سبزۂ سرِ رہ از جورِ پا چہ نالی؟ در کیشِ روزگاراں گل ہم بہ ہیچ نہ ارزد

پھاٹک کی عظیم الرفعت عمارت سرتاپا یوں کہئے کہ زیادہ تر معمولی سنگ سرخ کی ہے، جو کم و بیش ان اطراف میں بآسانی دستیاب ہو جاتا ہو گا۔ کہیں کہیں جستہ جستہ مٹیلے رنگ کے یا خاکی بھی پائے جاتے ہیں۔ سنگ کشمویا زرد مرمر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ان سب کی مقدار و تعداد مل کر ضرور قابل لحاظ ہو جاتی ہے۔ عمارت سادہ ہے یعنی ہر قسم کے تکلفات و نمائش و آرائش سے معرا۔ نہ اس میں سنگ مرمر کی جدولیں ہیں، نہ سیاہ پتھر کی تحریریں۔ نہ منبت کاری ہے نہ پچی کاری۔ شروع سے باغ تھا اور باغ ہی رہا۔ اس لئے گورستانوں کا سا اہتمام و انتساق یہاں نہیں پایا جاتا۔ نہ تسبیح خانہ ہے نہ مسجد کا نظارہ۔ نہ کہیں اسمائے حسنیٰ لکھے ہیں، نہ آیات قرآنی کندہ ہیں۔ نہ فلک پیمائی کے لئے منارے ہیں۔ غرضکہ اکثر اسلامی خصوصیات یہاں ناپید ہیں۔

دروازہ میں داخل ہونے پر دونوں جانب وسیع شہ نشین ملتے ہیں۔ چھ سات برس پہلے ان (یعنی دالانوں) میں نیچے اوپر دونوں طرف پولیس کی چوکی تھی۔ اب خالی رہتے ہیں۔ اوپر جانے کے لئے دائیں بائیں دو طرفہ زینے ہیں۔ سیڑھیاں کسی قدر تنگ ہیں مگر تکلیف دہ اور برا نہیں۔ ان کے دروازے مقفل رہتے ہیں۔ تیسری منزل پر پہنچ کر دیکھنے والا سارا شہر بلکہ اس کا گوشہ گوشہ ہی آنکھوں کے سامنے پاتا ہے۔ اوپر یعنی بالائی منزل پر بہت سی عمارت بنی ہے۔ اب بھی کافی گنجائش ہے۔ گو کمین ہیں، زنانہ مکانات ہیں۔ دالان ہیں۔ کوٹھریاں ہیں۔ کبھی پردگیانِ حرم سرائے سلطانی ان میں فروکش و راحت گزیں ہوتی ہوں گی۔ پھر محجلہ نشینان نگار خانہ پولیس کے اعتکاف کے لئے وقف رہیں۔ اب وہ صورت بھی باقی نہیں۔ پھاٹک میں آ کر قدم بائیں ہاتھ ایک کمرہ کا سائن بورڈ اوپر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس میں "محافظ آثار قدیمہ کا دفتر" یعنی آرکیالوجی کل

آتش ہے جس نے بوسیں کو بے دخل کرکے یہ جگہ حاصل کی ہے۔ کبھی یہاں نوبت خانہ بھی رہا ہوگا۔ پانچ وقت نوبت بجتی ہوگی۔ مگر اب

پردہ داری می کند بر قصر کسریٰ عنکبوت   بوم نوبت می زند بر گنبد افراسیاب

خدمی اور شاہی باڈی گارڈ اور یہاں کے سامان و اسباب و مراتب کے محافظ و نگراں اُن کوٹھریوں میں رہتے تھے، جو پھاٹک کے ہر دو جانب بنی ہیں۔ علاوہ باغ اور باغبانوں کے رہنے سہنے کے واسطے بھی وافر جگہ تھی۔ لکھ چکا ہوں کہ یہ کوٹھریاں اب بھی کسی نہ کسی تعداد میں باقی ہیں، مگر اُن کی حالت زبون و شکستہ ہے۔ بعض اہلِ حرفہ یا غربا سالانہ کرایہ پر میونسپلٹی سے لئے ہوئے ہیں۔

پھاٹک کے استحکام واستواری نے ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کے عظیم شرق گیر زلزلہ کا بھی مقابلہ کیا تھا مگر ایک آدھ کم سال برجیوں کی شکست کے سوا شکست کھائی۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے مناسب و مضبوط درستی کرادی ہے۔

مسلّم ہے کہ یہ سب تعمیرات جہانگیر کے زمانہ قیام اور گورنری و ولی عہدی کے دور کی یادگار ہیں۔ وہ تخت پر جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ (اکتوبر ۱۶۰۵ء) میں بیٹھا تھا[1]

ڈاکٹر ظہیر اپنی عالمانہ تاریخ صنادید قدیمہ[2] میں لکھتے ہیں کہ "الٰہ آباد میں عہد مسلمانوں کی باقیات صرف چند ہیں۔ وہ بھی چنداں اہم نہیں۔ سب سے ممتاز عمارت خسرو باغ محلہ خلد آباد میں ہے۔ یہ ایک مربع ہے جس کو قلعہ نما دیوار احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں تعمیر ہوا تھا۔" آئیے اس کو بھی دیکھ لیجیے۔

لکھ چکا ہوں کہ تاریخوں سے "خسرو باغ" نام رکھے جانے کی وجہ یا نام رکھنے والے کا پتہ نہیں چلتا مگر قیاس غالب ہے کہ یہ نام عہد جہانگیری میں بھی مشہور و زبانوں پر رواں تھا۔ اس لئے کہ پیٹر منڈی صاحب نے شاہزادہ کی موت و تدفین کے متعلق ۱۰۳۲ھ میں یا اس کے قریب لکھا تھا کہ "خسرو آگرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا تھا مگر نور جہاں کے ابرام و الحاح سے وہاں سے ہٹا کر "مردہ آباد" یا "گزرو آباد" Gazrooabad یا حقیقتہً الہ آباد کو منتقل کر دیا گیا ہے[3]" ہندوستان کے پرانے جغرافیہ اور الہ آباد کے نواحی و اطراف میں کوئی

---

[1] بیل صاحب کی ڈکشنری صفحہ ۲۰۵۔ [2] جلد دوم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ صفحہ ۱۳۰۔ [3] سیاحت نامہ جلد دوم صفحات ۱۰۵ و ۱۰۶ Travels of Peter Mundy, Vol II, pp 105 & 106

مقام ان دونوں ناموں سے شہرت نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک غیر ملک کے باشندے نے ناواقفیتِ زبان و عدم صحت سے خلد آباد کو "مردہ آباد" لکھ دیا ہو۔ اور "کرزو" تو صاف طور پر "خسرو" کا انگریزی املا اور تلفظ اور "باد" "باغ" کی تحریف یا اُس کا بدل معلوم ہوتا ہے۔

شاہ بیگم اور خسرو کے مرنے اور یہاں دفن ہونے کے بعد خسرو باغ کا نام بدل جانا چاہئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا شاید بدشگونی مانع آئی اورنگ آباد دکن میں عالمگیر کی مشہور ملکہ رابعہ درانی کا مقبرہ ہے۔ اہلِ تاریخ نے اس کا تذکرہ "باغ بیگم" کے نام سے کیا ہے۔ قرینہ و قیاس مقتضی ہے۔ ملکہ کے دفن سے پیشتر یہ اُس کا باغ رہا ہوگا۔ اس لیے اُس کے پیوندِ خاک ہونے کے بعد بھی وہی نام قائم رہا۔ چنن لال سیتا رام ثانی کی "آصف جاہی کی "مآثر نظامی"[1] سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا نام بھی کسی وقت "بیگم کا مقبرہ" پڑ گیا تھا نواب آصف جاہ نے ایک روز "بیگم کے باغ" کی سیر کے لیے تشریف لے جانا چاہا مناسب حال تیاریاں کی گئیں۔ انتظام مکمل ہو گیا تو داروغہ دیوان خانہ نے عرض کیا کہ حسبِ ارشاد "بیگم کے مقبرہ" میں اہتمام ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ نواب اُس وقت کس خیال میں تھے۔ برہم ہو کر فرمایا کہ "مقبرہ تمہیں کو مبارک ہو۔ تم ہی وہاں جاؤ" تشریف بری موقوف کر دی۔ سامانِ آسائش و آرائش جو بھیجا گیا تھا واپس منگا لیا۔ اُسی دن سے یہ لازم ہو گیا کہ حضور میں اس جگہ کا نام جب کبھی آتا تو مقربین ہمیشہ "باغ بیگم" ہی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اسی کتاب سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ آصف جاہ کے حضور میں کسی کے مرنے کی فوراً اطلاع نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ تیسرے دن (مرنے کے بعد) عرض کیا جاتا کہ فلاں امیر یا درباری نے صحتِ کلی پائی۔ جو شخص کہ نمازِ جنازہ میں شریک ہوا ہو، تین روز تک نواب کے سامنے جانے نہیں پاتا تھا۔ اور اب بھی بقول میر شوکت بلگرامی "فرماں روائے دکن کی عظمت و جلالت کی شان اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ کسی مقرب اور عزیز کی میت پر بھی اُس کی جانب سے تعزیت کی جائے۔ جہاں موت کی اطلاع بھی اگر بہت ضروری ہوتی ہے تو ان لفظوں میں کی جاتی ہے کہ "فلاں شخص کو دوا کارگر نہیں ہوئی"[2]۔ سلاطینِ مغلیہ اور شاہانِ اودھ کے یہاں بھی یہی دستور تھا کسی کے مرنے کی اطلاع دی جاتی تو عرض کیا جاتا کہ فلاں شخص تصدق ہو گیا۔

---

[1] قلمی کتب خانہ صمدن۔ [2] رسالہ "الناظر" لکھنؤ، نمبر ۵، صفحہ ۴۸۔

موت اور مرنے کا منحوس لفظ محلات کے اندر اور درباروں میں آنے نہیں پاتا تھا۔ اسی طرح چغتائیوں کا آئین یہ تھا کہ جب کسی شاہزادہ یا امیر کی وفات کی اطلاع دینا ہوتی تو اُس کا سرکاری وکیل اپنے بازو پر نیلا رومال باندھ کر دربار میں حاضر ہوتا تھا[1] اور کورنش بجا لاتا تھا۔ کہنے پر کوئی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ (ابوالفضل کے مارے جانے کی اطلاع بھی اسی طریق سے اکبر کو دی گئی تھی۔[2]) حاجی دبیر مصنف "تاریخ خانی" یعنی تاریخ گجرات موسوم بہ ظفر الوالہ بمظفر وآلہ میں لکھتے ہیں کہ غیاث الدین خلجی متوحش خبروں سے بہت دور رہتا تھا حتیٰ کہ تمام عمر کوئی ایسی خبر نہیں سُنی۔ جب اُس کا داماد مر گیا تو [illegible] نے اطلاع دینے کے یہ حیلہ اختیار کیا یعنی شاہزادی سفید لباس پہن کر سامنے آئی، جیسا کہ اہل ہند کی عورتوں کا دستور ہے۔ بادشاہ نے دیکھا تو کہا کہ شاید اس کا شوہر فوت ہو گیا ہے۔[3]

ان حالات اور ایسے خیالات کے ہوتے ہوئے خسرو باغ کا تبادلہ نام کیسے ہو سکتا تھا؟

اسی قدر نہیں، بلکہ بعض امراء و روسا نے اس سے شگون نیک لیا اور یہی نام رکھا ہے۔ نواب کلب علی خاں کی تعمیر کردہ کوٹھی نہایت شاندار اور رام پور میں 'خسرو باغ' کے نام سے یادگار ہے۔[4]

مسٹر کین بحوالہ فرگوسن صاحب[5] ناقل ہیں کہ ہندوستان کے مغل اہل تاتار کی نسل ہیں۔ "تاتار والے اپنے مقبروں کو اس طرز سے بناتے تھے کہ اُن کی زندگی بھر تو خود اُن کے اور اُن کے دوستوں کے لئے جائے سرور رہتا ...... بادشاہ یا امیر جو اپنے واسطے قبر کا انتظام کرنا چاہتا اُس کے لئے طریق معمول یہ تھا کہ دیوار شہر کے باہر ایک باغ کا حصار کھینچتا۔ اُس کے وسط میں .... ایک بلند مربع چبوترہ پر .... ایک .... عمارت بناتا جس پر گنبد ہوتا۔ بانی کے جیتے جی یہ مرکزی عمارت 'بارہ دری' کہلاتی اور خود اُس کے نیز یار و احباب

---

[1] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد صفحہ ۵۲۔ [2] ترجمہ انگریزی مآثر الامراء از ہنری بیوریج، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۲۳۔
[3] دفتر اول مطبوعہ لیڈن، طبع بریل ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۰۹۔ [4] آب بقا، صفحہ ۱۲۰، مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔ [5] مسٹر جیمس فرگوسن James Ferguson نے ۱۸۸۶ء میں وفات پائی۔ ان کی تعریف میں مسٹر ڈگلس کا ایک ہی فقرہ نقل کر دینا کافی ہے "وہ عصر حاضرہ کے سب سے بڑے ماہر آثار قدیمہ و مستند شخص تھے۔ ان کی تاریخ تعمیر لاجواب اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اس سے بھی زیادہ بیش بہا اور نفیس اُن کی "ہندوستانی اور مشرقی تعمیرات کی تاریخ" ہے جو ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔" [آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۱۰۰ نوٹ]

کے لیے سیر و تفریح اور دعوت و ضیافت کی جگہ رہتی۔ بعد وفات اُس کا صرف و مقصود بدل جاتا بنانے والے کی میت، سی مرکزی گنبد کے نیچے دفن کی جاتی ...... البتہ جب ایک مرتبہ مدفن قرار پاجاتا تو اس کے اندر مسرت و ابتہاج کی صدا بلند ہونا تو درکنار، کان میں بھی پڑنے نہیں پاتی تھی۔ "[1]

اس تجویز یا عندیہ کا حد تکمیل تک پہنچنا تو پایا نہیں جاتا۔ نہ خسرو باغ کی صورت ابتدائی یا وجہ بنا کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن خود باغ، اُس کے حوالی کی چیزیں اور مقبروں کے کتبیں اور سنین وغیرہ کے بغور مقابلہ سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ باغ کی تکمیل و ترتیب یقیناً پہلے ہو چکی تھی، جس کا موقع اور مرکزیت شاہد ناطق ہے۔ خلد آباد کے پھاٹک ۹۹۵ھ (۵۰۷ء) میں بنائے گئے۔ باغ کا پھاٹک ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں تعمیر ہو۔ شاہ بیگم کا انتقال بروایت جہانگیر آخر ۱۰۱۳ھ (وسط ۱۶۰۵ء) اور حسب تحریر لوح مزار ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۴ء) میں ثابت ہوتا ہے۔ جہانگیر اس وقت الہ آباد میں موجود بھی نہ تھا، شکار کو گیا تھا۔ باغ تیار تھا۔ بیگم اس میں دفن کر دی گئی۔ مقبرہ ایک دو سال بعد تیار ہوا ہوگا۔

خُدا معلوم، اس آغاز کا انجام کیا ہوتا
چھڑا تھا ساز ہستی مبتدا بے خبر ہو کر

---

[1] آگرہ ہینڈ بک، مرسہ ڈنگ صاحب، صفحہ ۱۴۹۔

خسرو باغ کے مقبرے وغیرہ

سنگ آستاں بہ پھاٹک میں اقدم رکھتے ہی[1] سامنے چار مقبرے نظر آئیں گے۔ مگر اُن تک پہنچنے میں تین سو قدم کے قریب فاصلہ طے کرنا ہوگا۔

ن کا منظر نہایت دلکش، دلآویز و نگر زیب ہے۔ مسٹر نیول[2] Nevill اور دیدہ ور اہل قلم کا قول ہے کہ یہ عمارات اپنے درجہ کی خوبصورت اور مغلوں کے عہد معموری و رنگ آمیزی کا بہترین نمونہ ہیں۔ مسٹر ہیئیل Havell ایک موقع پر لکھتے ہیں[3] کہ "یہ مقبرے الہ آباد کے عمدہ آثار و صنادید قدیمہ میں بڑے نمود کی چیزیں ہیں۔"

اس فن کے ایک نوآموز و کم آشنا کی حیثیت سے مجھے بھی اس بارہ میں غور کرنے اور ان چیزوں کو اپنی ناقص استعداد سے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان مبصرین کی رائے سے کون اختلاف کر سکتا ہے! یہ صحیح ہے کہ خسرو کا مقبرہ اکبر کے مقبرہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دونوں عمارتیں ایک ہی شخص کے حکم سے بنی ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ الہ آباد والا گنبد اُن فرسودہ و بوسیدہ ہڈیوں کو آغوش میں لئے ہے جو باپ سے بگڑ کر ہمیشہ گرفتار و مطرود رہنے والے بیٹے' اور بھائی (شاہجہاں) کے معتوب بھائی کی تھیں۔ جو برہان پور دکن سے لاکر یہاں لائی اور دفن کی گئی تھیں۔ سکندرہ کا بے مثل مقبرہ ایک نیک نام و عظیم الشان شہنشاہ کی دائمی و ابدی یادگار کے طور پر ہے، جو اس ہی جیسے اولوالعزم و منت شناس شہنشاہ نے بنوایا تھا۔ دادا اور پوتے میں جتنا قدرتی فرق ہوتا اور ہو سکتا ہے یہاں بھی نمایاں ہے۔

مغلوں[4] کے ابتدائی زمانہ کی تعمیرات میں، جس میں اکبر اور جہانگیر کے عہد کی عمارتیں بھی داخل ہیں، بعض خصوصیات ہوتی تھیں، جو کچھ نہ کچھ ان مقبروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یعنی بلند اونچے[5] گردنوں پر ایرانی

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق صفحہ ۱۶۵۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۲۰۳۔ [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق صفحہ ۱۲۸۔ [4] دکنی صاحب کی آثار جدید کتاب صفحہ ۲۰۹۔ [5] ایضاً صفحہ ۲۲۵۔

وضع کے گنبد۔ اس طرز کی عمارتیں بیشتر کی بنی ہوئیں عمارتوں سے دو باتوں میں بالخصوص ممتاز و متباین پائی
جاتی ہیں (۱) اس امر کی صاف و صریح کوشش کہ ہندوں کے مختلف منتخب طرز تعمیر نیز مسلمانوں کے مخصوص
طریقے و وضعیں متحد و یکجا کر دی جائیں۔ (۲) زیادہ گھٹے ہوئے رنگ دینا۔ اس کے لئے عام طور پر سفید
سنگ مرمر زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ پھر حسب موقع و صورت بیش قیمت رنگین پتھروں کا افراط کے ساتھ خرچ و
اور کھپت۔ بے شبہ بعض عمارتوں کے متعلق محض اندرونی ساخت سے یہ تمیز حاصل کر لینا دشوار ہوتا ہے
یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ چیزیں جن کے مکانات و محلات میں موجود ہونے یا نہ ہونے سے جن باتوں کا فیصلہ یا امتیاز
ہو سکتا ہے مقبروں اور روضوں میں اکثر نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً کروی کا نقطہ استعمال ہیں۔ آتا یا سیدھے سادے
نمونہ کی محرابیں کم بنانا وغیرہ۔ مجھے اعتراف ہے کہ خسرو باغ کے مقبرے بے مثل و بے نظیر نہیں ہیں۔ نہ ان میں ہمایوں
کے مقبرے متصل دہلی کی سی شان اور لطافت و نزاکت تعمیر و دقت پائی جاتی ہے۔ نہ مقبرہ اعتماد الدولہ واقع
آگرہ کی سی پرچین کاری اور منبت کاری۔ نہ مقبرہ شیخ سلیم چشتی قصبہ فتح پور سیکری کی طرح سنگ مرمر پر
سرتا پا باریک نازک اور بے نظیر نقاشی و شجرکاری ملتی ہے۔ نہ کوئی خاص قابل قدر حسن وضع و تعمیر ہے۔
نہ مقبرہ اکبر (سکندرہ) کی رفعت و عظمت و ہیبت و جلالت پیدا کرنے والی شان نمایاں ہے۔ تاہم چار
مختلف الوضع عمارتوں کا ایک سیدھی لائن اور ایک ہی محاذ میں بیک نظر آنا ایک کیفیت خاص پیدا
کر دیتا اور عجیب دلکشی رکھتا ہے۔

نامور فرگسن[1] سلطان التمش کے روضہ واقع پرانی دہلی کو ہندوستان کا سب سے پرانا مقبرہ بتاتا اور لکھتا
ہے کہ یہ مختصر تو ضرور ہے لیکن اس میں ہندوں کی صنعت کے نفیس و بہترین نمونے جہاں تک کہ اسلامی شعائر
خصائص اور شوکت کے منافی و منافی نہ تھے مناسب حال و شایان شان صرف کر دیئے گئے ہیں جن سے یہ
نہایت درجہ خوبصورت و دلآویز ہو گیا ہے۔ راقم سطور بلکہ یقیناً ہر ہوشمند دیکھنے والا بیک نظر سمجھ سکتا ہے کہ خسرو باغ
کے مقبرے بھی اگرچہ مختصر ہیں لیکن ان کی مجموعی کیفیت مختلف وضع و متنوع طرز عمارت ایک خاص قسم کی

---

[1] ہندوستانی اور مشرقی تعمیرات کی تاریخ ۱۸۷۶ء۔ History of Indian and Eastern Architecture by Fergusson, 1876.

دلکشی اور جذب نظر اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور ہر ایک میں کمال سادگی کے ساتھ ساتھ کمال فن و ہنر بھی نمودار ہے۔

سب سے پہلے جس فرض شناس حکمران نے ہمارے صوبہ کی عمارات قدیمہ کی طرف توجہ مبذول فرمائی وہ ممالک مغربی و شمالی کے لفٹننٹ گورنر) سر جان اسٹریچی Sir John Strachey تھے اول اول ۱۸۷۶ء میں روضہ ممتاز محل پر عنایت[1] کی اور مرمت کرادی۔ پھر آگرہ اور الہ آباد کی دیگر بادشاہی یادگاروں پر نگاہ التفات ڈالی۔ اپنے صوبہ کی آمدنی میں سے بہت سا روپیہ دے کر متھرا کے پرانے گرتے ہوئے مندر کو سنبھال لیا اور درست کرا دیا[2]۔ خسرو باغ ان کے دار الحکومت میں ایک ممتاز مقام تھا اور پبلک کے کام کی چیز۔ بقدر ضرورت اس کی مرمت و درستی بھی ہو گئی[3]۔ دلکش باغ اس وقت بھی اپنے گزرے ہوئے دنوں کی دست برد اور استداد زمانہ کی تاخت و تاراج کو ناقدری و حقارت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ جو اپنی جوئبار شیریں یعنی میٹھے پانی کے حوضوں اور بڑے بڑے کنووں اور چشمہ فیض باؤلی سے سارے شہر کو سیراب کر رہا تھا۔ جس کے ستھرے انداز میں بندی و تناسب اجزا کی اس وقت بھی داد مل رہی تھی جس کا ایک ایک پھول اور ایک ایک پتہ جس کے مقبروں کا ہر پختہ و شکستہ پتھر اپنے شاہانہ تکلفات اور نازک ترئینات کا آئینہ دار تھا۔ عروس البلاد الہ آباد میں گرمی کی شدت و تپش اور بعض اوقات سردی کی افسردگی و انجماد بھی کائنات کی حسین و جمیل چیزوں کو مردہ کر دیتی ہے مگر خسرو باغ کی معطر ہواؤں کے حیات بداماں جھونکے اس وقت بھی تازہ زندگی پھونک دیتے تھے۔

دنیا بدل گئی ہے وہ ہیں یہیں اب تک — اپنے مقام پر ہیں اپنے مکان پر ہیں

---

[1] ہینڈبک آگرہ و تاج از ہیول، صفحہ ۴۴۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر متھرا ۱۹۱۱ء، صفحہ ۲۴۴۔ [3] الہ آباد اور الہ آباد کی گرمی کو بعض شعرا نے بھی اپنے اپنے طرز خاص سے یاد کیا ہے۔ ایک بذلہ سنج کہتا ہے

ز گرمی محبت ایں ترف زار — الہ آباد گشتہ آذر آباد

مرزا غالب ایک قصیدۂ منقبت میں فرماتے ہیں

عکس بر روز باد زیب گلشن — نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

(کلیات مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۶۲ء، صفحہ ۱۹۷)۔

اس کے چھبیس ستائیس برس بعد "مغل اعظم" کے صحیح جانشین اور اس کی عظمت و سطوت رفتہ کے وارث و قابض لارڈ کرزن آنجہانی نے دیرینہ سال عمارات کے بقا و پرداخت میں وہ سعی مصروف فرمائی جس کے لئے ہندوستان کے باشندے بالخصوص احسان شناس مسلمان ہمیشہ زیر بار منت و شکر گزار رہیں گے۔ تمبولن بیگم کے گنبد کا خالی کرا دینا اور اس کے عوض میں[1] سپرنٹنڈنٹ باغات الہ آباد کے لئے ایک قصر پر تکلف مہیا کر دینا اسی بلند حوصلہ امیر کا کام تھا۔ جس کا ذکر مناسب موقع پر عنقریب آئے گا۔

تم نے نگاہ لطف سے رکھ لی ادب کی شرم ورنہ لبوں تک آ ہی چکا تھا گلا ابھی

مقبروں کی نگہداشت اور خسرو باغ کی آبیاری و آراستگی اس وقت حکومت کے دست کرم کی ممنون ہے[2] باغ کے مصارف معقول نفع کے ساتھ خود اس کی پیداوار سے پورے ہو جاتے ہیں۔ پھل پھول، پودوں، ہر قسم کے درختوں اور قلموں سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی ہے۔ یہاں[3] کے گلاب اور گلاب کی قلمیں مشہور اور بڑی قدر کی چیزیں ہیں۔ الہ آبادی امرودوں کی پود اس باغ کی قابل اعتبار اور اچھی سمجھی جاتی ہے۔ منتظمین نے تین[4] تین ایکڑ کے دو قطعے میوہ کے درختوں اور پودوں کی پرورش گاہ اور پھل پھول کی بہار دکھانے کے لئے محفوظ رکھے ہیں۔

انگریزی پیمائش سے باغ کا کل رقبہ ٦٧٫٠٠ ایکڑ ہوتا ہے۔ انتظامی ضرورتوں اور سہولت کارروائی کے لئے اس کی تقسیم دو حصوں میں کر دی گئی ہے۔ ایک قطعہ ٣٠٫٠٠ ایکڑ کا محکمہ آثار قدیمہ آرکیالوجی کل ڈیپارٹمنٹ[5] کے نام سے ہے۔ دوسرا سینتیس ایکڑ کا زیر اہتمام و انتظام محکمہ زراعت[6] ہے۔ عملی طور پر دونوں قطعے اور ان کی نگرانی محکمۂ زراعت کے ایک ذمہ دار افسر کے ہاتھ میں ہے۔ اور محکمۂ مذکور کی سالانہ رپورٹوں میں دونوں کے بقدر ضرورت حالات اور درستی و ترقی کی کیفیت مندرج و شائع ہوتی رہتی ہے۔ دونوں ٹکڑوں یعنے آرکیالوجی کل اور زراعتی کا تذکرہ جداگانہ حصوں میں ہوتا ہے۔ آرکیالوجی کل[7] حصہ کی ترتیب جدید حال میں

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ٢٠٣۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صفحہ ٢٠٣۔ [3] رپورٹ باغات سرکاری بابتہ ١٩٢٩-٣٠، صفحہ ٩۔ [4] ایضاً، صفحہ ٩۔ [5] ایضاً، صفحہ ١٠۔ [6] ایضاً، صفحہ ٩۔ [7] رپورٹ انتظامی باغات سرکاری، صوبجات متحدہ، بابتہ ٢٩-١٩٢٨، صفحہ ١٠۔

عمل میں آئی ہے اور چار پانچ سال ہوئے ختم ہوئی ہے۔ پرانی سڑک جو حائل تھی دور کر دی گئی جس کی نسبت
کہا جاتا تھا۔

راہ ہے افسانۂ ماضی کو دہراتی ہوئی   مقبروں کے درمیاں سے پیچ و خم کھاتی ہوئی

نئی سڑک ایک دلکش روش پر ہموار اور سطح کے برابر نئی ترتیب کے مناسب حال بنائی گئی ہے۔
پائپ کی لائن نئی قائم کی گئی ہے۔ فوارے لگائے گئے ہیں۔ تاریخی عمارات کے لئے موزوں و مناسب ترمیم
کی گئی ہے اور نہایت دلکش و دلآویز ماحول مہیا کر دیا گیا ہے۔ پرانی باؤلی کے متصل دیواروں پر بیلیں چڑھائی
گئی ہیں۔ اس کے لانوں کے شکستہ حال ٹکڑوں کی مرمت کر دی گئی ہے۔ خسرو کے مرکزی مقبرہ کے گرد جو کبھی
پھولوں کی کیاریاں تھیں ان میں اب سرسبز و شاداب سدابہار جھاڑی لگا دی گئی ہے۔ باغ کے گلگشت
نظارہ و تفریح سے حکمراں اور محکوم جماعتیں اور علمی و ادبی طبقے دونوں یکساں متمتع ہوتے ہیں۔ اس محکمہ کی
رپورٹ شش ماہی میں اس کا اندراج "تاریخی یادگاروں کے باغ واقع خسرو باغ" کے نام سے کیا جاتا ہے[1]۔
زراعتی حصہ ۲۰ ایکڑ کا ہے۔ اس کا شمار "پراونشیل گارڈنس" کی مد میں ہوتا ہے[2]۔ اس کی آراستگی و وسائل
آمدنی کا ابھی تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس کے لانوں پر نئی گھاس نئے قسم کی لگائی گئی ہے۔

اس سبزہ زار یا ہرے بھرے گھاس کے لمبے چوڑے قطعات پر پہنچ کر مجھ ایسے پریشان خیال
سیلانی کا دھیان خود بخود ایک دوسری طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہاں دو اکبر گزرے ہیں۔ ایک اکبرِ اعظم،
دوسرا اکبرِ اکبر۔ اکبر اعظم نے اس شہر کی بنیاد ڈالی۔ بسایا۔ اور الٰہ باس یا الٰہ آباد بنایا تھا۔ یہ تو تونگری و حشمت،
دولت کی فراوانی اور شوکت و قوتِ سلطانی کا کرشمہ تھا۔ اس کو پونے چار سو برس ہوئے۔ دوسرے یعنی اکبرِ اکبر
نے اپنی سخن سنجی و شیریں کلامی اور ذہنی و دماغی کمال سے اس کی دائمی شہرت و بقا کی ضمانت فرمائی۔ یہ ہماری
آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ مرحوم اکبر جب اس جگہ پہنچا ہے تو بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔

لاٹ ہینس کے لئے بن گئے شاہی گلزار   ساتھ سبزہ کے ہجومِ گل و سوسن نہ رہا

سب سے پہلے جس یورپین سیاح کے قدم یہاں آئے اور جس نے کم و بیش یہاں کے حالات قلمبند

---
[1] باغات سرکاری ممالک متحدہ بابتہ ۲۹-۱۹۲۸ء صفحہ ۱۱۔ [2] ایضاً بابتہ ۳۰-۱۹۲۹ء صفحہ ۹۔

گئے وہ پادری پیٹر منڈے Peter Mundy ہیں۔ جنھوں نے ۱۶۳۲ء میں اس مقام کو دیکھا تھا اور
شاہزادہ خسرو کے مقبرے اور اُس کی ترتیب و تزئین کا ذکر کیا ہے[1]۔ اُن کے دو سو برس بعد ۱۸۲۴ء میں بشپ ہیبر
Rt-Revd. Reginald Heber, D.D. تشریف لائے اور وہ باتیں صفحات
تاریخ پر چھوڑ گئے[2] جن کا بتانے والا اُن سے پہلے کوئی نہ گزرا تھا۔ اُن کے بعد آیا مشہور انگریزی صناع اور
آرٹسٹ مسٹر ٹامس ڈانیل[3] Thomas Daniell بھی مستحق صد شکر و ستائش ہیں،
جنھوں نے اپنے دوران سفر و سیاحت میں یہاں کی بعض[4] عمارتوں کے خاکے اور نقشے تیار کیے۔ یہ نقشے میں
یا اُس کے ذریعے خوش رنگ شائع ہوئے تھے اور آج بھی بڑے بڑے کتب خانوں اور امرا کے ایوانات و
قصور کی زیب و زینت ہیں۔ ادب و فضل کی دلدادہ حسین و جمیل شیدا کی تمیدہ خطوں میں تصویر کھینچ دینے
والی فینی پارکس[5] Fanny Parkes بھی یہاں آئی تھی اور[6] وہ انگلستان سے

---

[1] سفرنامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۰۱۔ [2] ہندوستان کے بالائی صوبوں کا کلکتہ سے بمبئی تک کا روزنامچہ سیاحت، مطبوعہ
لندن ۱۸۲۸ء، جلد اول، صفحہ ۲۴۳۔ Narrative of a journey through
the Upper Provinces of India from Calcutta to Bombay
1824-25. London 1828. [3] اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں دو
مصور ٹامس ڈانیل اور اس کا بھتیجا ولیم Thomas Daniell and
William ہندوستان آئے تھے اور سارے ملک کا دورہ کیا تھا۔ تمام قابل دید عمارتوں اور منظروں کی تصویریں تیار
کی تھیں۔ ولیم ساتھ ساتھ روزنامچہ بھی لکھتا جاتا تھا جو افسوس ہے کہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ ورنہ بہت سی قابل آگاہی باتیں
خسرو باغ اور الہ آباد کے متعلق اُس سے معلوم ہو جاتیں۔ اُس کے بعض اقتباسات اور ٹکڑے متفرق طور پر چھپے ہیں۔ بنگال پاسٹ
اینڈ پریزنٹ "Bengal Past & Present" کے مدیر سر ایون کاٹن Sir Evan
Cotton نے دونوں کا مفصل حال بھی لکھا ہے۔ قرب دریا کی مقامات کی تصویریں دریا سے کھینچی جاتی تھیں۔ فتح گڑھ
کیمپ از مسٹر سی۔ ایل۔ ولیس، صفحہ ۱۲۴۔ Fatehgarh Camp by Mr.
C. L. Wallace [4] میر الدولہ گورنمنٹ پریس لکھنؤ میں شاہ بیگم کے مقبرے، دیوار اور کنوؤں کا رنگین
نقشہ وغیرہ۔ [5] مسز فینی پارکس بڑی وسیع النظر اور ہوشمند ذی استعداد تھیں۔ قلم و کاغذ کے ساتھ مشغول اپنے صاحب

(بقیہ صفحہ ۷۲ پر)

یلگرم[۱] میں بقدر تفصیل حال لکھا گیا ہے۔

فارسی میں سب سے پہلے جن صاحب نے خسرو باغ کے حالات مختصر سہی مگر قلمبند کیے وہ مسٹر بیل مولف مفتاح التواریخ[۲] ہیں۔ موصوف نے اس باغ اور مقبرہ کا ذکر سلطان خسرو کے ذیل میں اپنی انگریزی کتاب میں بھی فرمایا ہے[۳]۔ مگر اس کو برائے نام کہنا چاہئے۔ پھر انگریزی میں جہانگیری سوانح کے سلسلہ میں ذی علم مستشرق بلاک مین J H Blochmann صاحب کا دلچسپ آرٹیکل اکتوبر ۱۸۶۹ء کے کلکتہ ریویو میں نکلا۔ اس کے بعد مسٹر ایسٹ وک Eastwick نے کتبوں کی طرف بھی توجہ فرمائی اور ان کا منظوم و مقفی ترجمہ کر دیا، جو مرے صاحب کی ہینڈ بک صوبہ بنگالہ[۴] Murray's Handbook for Bengal etc. میں موجود ہے۔ صاحب موصوف نے تحریر نہیں فرمایا کہ ان قطعات کی

(بقیہ صفحہ ۷۰) سیف و قلم، روشن خیال باپ میجر ای سی آرچر C. Archer, Major سے ارث میں پائی تھی۔ وہ لارڈ کومبرمیر Lord Combermere کے اے ڈی سی رہے تھے ۱۸۳۳ء میں ان کا سفرنامہ "ٹورس ان اپر انڈیا" Tours in Upper India کے نام سے دو جلدوں میں چھپا تھا۔ ان کے اس دورہ میں جو ۱۸۳۸ء میں لارڈ آکلینڈ کے ساتھ ہوا تھا میم صاحبہ بھی ہمرکاب تھیں۔ میم صاحبہ کے شوہر مسٹر سی سی پارکس C C Parkes بنگال سول سروس کے تعلق سے ۱۸۱۶ء سے ۱۸۴۶ء تک ہندوستان میں رہے تھے۔ وہ ۱۸۳۳ء میں الہ آباد میں کسٹم کلکٹر تھے۔ میم صاحبہ اپنے چھوٹے سے دوتی نما بجرے پر گنگا اور جمنا کا دریائی سفر کسی جگہ سے کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے تمام اہم اور ضروری مقامات کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھا تھا۔ مشہور و ممتاز لوگوں سے ملی بھی تھیں۔ انھوں نے اپنے سیاحت نامہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت متفقہ فیصلہ ہے کہ ہندوستان کی زندگی کے متعلق جتنی کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے اچھا اور قابل دید ہے۔ اس میں تمام حالات پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ اسی کی بدولت میم صاحبہ کو بڑی شہرت و عزت نصیب ہوئی ہے۔ (ماخوذ از پیش لفظ مرتبہ ایونگ مسٹر ورسل جیس ایم سی ا)

[۱] پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۱۰۸۔ صفحہ ہذا:- [۲] دو جلدیں ۱۸۳۳ء سے ۱۸۴۳ء تک۔ Wanderings of a Pilgrim مطبوعہ ۱۸۵۰ء، صفحات ۳۳۴ وغیرہ۔ [۳] جیس بیاگرافیکل ڈکشنری، صفحہ ۱۵۲۔ [۴] وغیرہ، مطبوعہ ۱۸۸۲ء، صفحات ۳۶۳، ۳۶۴۔

نقلیں اُن کو کہاں سے دستیاب ہوئی تھیں مگر ترجمہ کی حالت اور اصل سے مطابقت کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ
بیل صاحب کی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ سب سے آخر ہمارے زمانہ کے مشہور علم دوست مسٹر ہنری بیوریج
Henry Beveridge نے اس طرف التفات فرمایا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ
جولائی ۱۹۰۷ء[1] میں ایک عالمانہ مقالہ شاہزادہ خسرو اور اُس کے مدفن اور متصل کے مقبروں کی نسبت
تحریر کیا۔ یہ لندن میں بیٹھ کر لکھا گیا تھا۔ اشعار و قطعات کی نقلیں ہندوستان سے مسٹر رچرڈ برن اینڈ
Richard Burn کی معرفت حاصل کی گئی تھیں۔ سرمایہ معلومات و واقفیت کافی اور ذریعہ آگاہی و
صحت قابل اطمینان نہ تھے اس لئے غلطیوں کا رہ جانا ناگزیر تھا۔ خود اُن کو اعتراف تھا کہ ان قطعات تاریخ
کی زبان کسی قدر مشکل ہے۔ اس وجہ سے اپنے ترجموں پر چنداں اعتماد و اعتبار نہیں رکھتے تھے۔ میرا خیال
ہے کہ ہم وطن و ہم زبان سر چارلیس لائل Sir Charles Lyall کو دکھایا تھا انہوں نے
پوری توجہ اور قابل قدر اعانت فرمائی تھی۔ زبان و مفہوم کا جہاں تک تعلق تھا ترجمہ تو درست ہو گیا مگر بیل صاحب
اور سر چارڈ برن کے کاتب کی غلطیوں کا ازالہ کیسے ہوتا۔ دور حاضر کے عدیم المثال فاضل و رہبان دانی مسٹر ڈیو بر[2]

---

[1] صفحات ۷۵۵ تا ۶۰۲۔ [2] سر ڈینسن راس بہ ذیل ڈپٹ نامور مستشرق و دہلی سے تمرکز مل کتاب عبید سندی اور
عمر کے دو قدیم و نایاب دیوانوں کو تلاش کر کے بڑی تحقیق و تدقیق سے مدون کیا اور ۱۹۲۸ء میں لیڈن میں چھپوایا تھا حکومت
کے دست و بازو اور ہندوستان کے قابل و نامور شناس منتظمین سے تھے۔ [3] اس جلیل القدر محترم نے ۲۰
دسمبر ۱۹۳۳ کو انتقال فرمایا۔ چھیاسٹھ سال عمر تھی۔ چالیس سال ہوئے میرے وطن میں آئے اور میں وہاں تھے علمی صحبت
و تعلق سے مجھ پر بے حد لطف و کرم فرماتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء کے جرنل رسالہ رائل ایشیاٹک
سوسائٹی لندن کی سند پر میری کتاب حیات جلیل پر تنقید فرمائی تو کمال عزت و احترام سے میرا اور میرے خاندان
کا ذکر لکھا۔ حالانکہ ایک مدت سے سلسلہ مراسلت شروع کرنے کا موقع ہوا تھا وہ انہیں بھی عربی فارسی
سنسکرت وغیرہ کے مختلف و متعدد مدارج و امتحانات میں سند فراغت حاصل کر چکے تھے تاہم ہندو مصاحبوں کے طے کرنے کا
شوق و ولولہ دامن گیر تھا ان کی تیاریوں میں برابر مشغول و منہمک رہتے تھے۔ حتیٰ کہ علوم و فنون مشرق کا یہ سرچشمہ
جلد سے جلد بڑھ کر فضل و کمال کا ایک متواج دریا بن گیا۔ ان کا حافظہ تو نہایت قوی تھا جس کی صفت ہ

A.P Dewhurst نے جب ممدوح حُسنِ اتفاق سے الٰہ آباد میں قیام گزیں تھے، اُن پر نظر ڈالی اور سوسائٹی مذکور کے رسالہ جولائی ۱۹۰۹ء[1] میں اُن کی تصحیح اور بحالتِ ضرورت جابجا توضیح کردی۔ بعض غلطیاں تو فاش تھیں، بعض ٹائپ کی، مثلاً "سلمیٰ" کی جگہ "سلمی"۔ ان کے نقل یا بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

یادش بخیر، مسٹر ٹامس ولیم بیل T. W. Beale سب سے پہلے مورخ ہیں، جنھوں نے اپنے زمانہ کی ایک رائج ملک زبان (فارسی) میں خسرو باغ اور اُس کے مقابر کا ذکر مفتاح التواریخ میں لکھا[2] اور اُس کے بعد ایک اور کارآمد، جامع اور مفید کتاب "اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری" تحریر فرمائی۔ جس میں مشاہیرِ شرق کے ضروری اور پُر از معلومات مآثر انگریزی میں لکھ دئے ہیں۔ مسٹر بیورج کو اس کمی کا احساس[3] ہے کہ "مسٹر کین نے بیل صاحب کی کتاب (ڈکشنری) کو ترجمہ اور ایڈٹ تو کیا مگر تاریخوں کو چھوڑ دیا ہے"۔ اُن کو افسوس ہے کہ بیل صاحب کی کتاب پھر ۱۸۸۱ء کے بعد طبع نہیں ہوئی۔ مسٹر بیورج کا خیال ہے کہ "مسٹر بیل یوریشین رہے ہوں گے اور ضرور فارسی کے بڑے فاضل ہوں گے"۔ مسٹر کین H. G. Keene لکھتے ہیں کہ یہ بہت بڑی عمر پا کر ۱۸۷۵ء کے موسم گرما میں بمقام آگرہ فوت ہوئے جہاں صدر بورڈ[4]

(صفحہ ۷۳) ریاضتِ جسمانی سے قوی ترجمانے رہتے تھے۔ سو سال ہوئے سرکاری منصب اور ہمارے ملک کو خیرباد کہہ کر انگلستان چلے گئے۔ آکسفورڈ میں قیام اختیار فرمایا، جہاں آغازِ شباب اور طالب علمی کا کچھ وقت ریاضیات کی تکمیل میں گزرا تھا۔ مسٹر ڈیوہرسٹ کی سی قابلیتیں اور فضل و کمال کسی فرد واحد میں کم جمع پائے گئے ہیں۔ شرقیات کے جملہ شعبوں میں ان کا کمال مُسلّم اور عدیم المثال تھا۔ یہ تمام آریائی اور سامی زبانوں پر یکساں عبور و تبحر رکھتے تھے۔ سنسکرت اور ہندستانی پر ان کی قدرت اگر غیر معمولی اور تعجب انگیز نظر آتی تھی تو عربی و عبرانی کے فضلا اور اہلِ زبان اُن کے تبحر سے متحیر و ششدر ہو جاتے تھے۔ تلامذہ کی کثرت، درس و تدریس کی حالت بھی ویسی ہی حیرت افزا تھی۔ ایک طرف ہندوستان کی سِول سروس کے لئے انگریز نوجوانوں کو ہندوستانی کی تعلیم دیتے تھے، تو دوسری طرف سوڈان کی ملازمت کے خواہشمندوں کو عربی کے امتحانات کے واسطے تیار کرتے۔ اسی سرتبہ کے اسکول میں متعلمین کو "آنرز" کے قابل قابل بناتے تھے۔

[1] جولائی ۱۹۰۹ء [2] مخطوطات ۲۲۰، طبع ۳۹ .. [3] مسلمات ۳۰ سوطابات ۲۳۴۔ [4] رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۹ء۔ ۲۰۳

مال کے دفتر میں محض ایک کلرک کی حیثیت سے ملازم تھے[1]۔ لیکن ڈھاکہ کے ٹیلر صاحب Taylor
بہار کے کرسچین صاحب Christian اور شمیر یان معروف بہ حاجی مصطفیٰ M.
Raymond مترجم سیر المتاخرین) کی طرح کتنے[2] ایسے زندۂ جاوید نام ہیں گے جو بہت سی مستقل
اور ہمیشہ رہنے والی کارآمد اور مفید تالیفات چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بہت سے بلند مرتبہ یورپین افسروں
کی کیا عزت ہو سکتی ہے۔ سر ہنری ایلیٹ صاحب کی تاریخ کا اختتام بیل صاحب کی تاریخ کے ذکر اور ان کی
علمی امانت کے اعتراف پر ہوا اور بالکل بجا ہوا ہے۔ اُمید ہے کہ ان کے مدفن کا پتہ و علم ہوگا اور اس پر کتبہ بھی
ہوگا۔ نامور فاضل مسٹر ای۔ بی (ایسٹ وک اسی۔ بی) نے مرے کی ہینڈ بک Eastwick in
Murray's Handbook میں کیتھرائن بیل Catherine Beale کی قبر
کا ذکر کیا ہے، جو اگست [illegible] میں فوت ہوئی تھیں۔"

پروفیسر ڈوسن Dowson نے بھی اپنی تاریخ ہند کی آٹھویں جلد میں ان کا تذکرہ کیا ہے[3]۔
مسٹر بیل کے اس تذکرہ پر بعض مغرب پرست حضرات چیں بہ جبیں ہوں گے اور یہاں شاید
بے محل قرار دیں گے۔ راقم ہیچمداں کے خیال میں کسی علمی یا تاریخی تحریر کو محض جنبہ داری کی کسوٹی نہ بنانا چاہیے
جس کی خانہ پری بلا ازدحام کافی و وافی سمجھی جائے اور خلاف ورزی مستوجب بازپرس متصور ہو۔ جس
زندہ جاوداں شخص نے اپنی جنبش قلم سے خسرو باغ کو صفحات کاغذ پر حیاتِ تازہ بخشی، کیا وہ اس قدر افتخار
والتفات کا بھی مستحق نہیں ہے۔ وہ جو نہ صرف خسرو باغ، نہ صرف الہ آباد، نہ صرف ہندوستان، بلکہ پورے
مشرق اور اعظم ایشیا سے بھی کچھ زیادہ کا محسن و خدمت گزار ہے!

افسوس ہے کہ ان مقبروں کے حالات تفصیل کے ساتھ درکنار، برائے نام بھی کسی ایسی کتاب میں

---

[1] اورنٹیل بیاگرفی کل ڈکشنری، مطبوعہ [illegible]۔ تمہید صفحہ اول۔ [2] یہ تینوں صاحب کوئی مسئل تھے [illegible]
نہیں پہنچے، مگر علمی و ادبی سرمایہ کثیر چھوڑ گئے ہیں۔ سیر المتاخرین کے ترجمے سے زیادہ اس کی تمہید و تبصرہ میں زبان قابل مطالعہ و
تحسین ہے۔ ایک یہودی فرانسیسی اور ایسی پیاری انگریزی! وہ جس کی عمر ہندوستان میں گزری تھی یا بعد برس حجاز
و عرب میں!! [3] تاریخ ہند خود اہل ہند مورخین کے قلم سے" مطبوعہ [illegible]، ٹرنبر کمپنی۔

نہیں ملتے۔ اور مسٹر ٹیل نے جس قدر تحریر[1] کئے ہیں اُن سے کسی تشنۂ تحقیق و تجسس کی تسکین نہیں ہوتی۔ اُن کی مختصر تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں چار روضے ہیں جن پر عالیشان گنبد بنے ہیں:۔

(۱) چھوٹا سا بے تعمیر جس کی نسبت معلوم نہیں کون دفن ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بی بی تمبولن کا روضہ ہے۔

(۲) عمارت سنگین و گنبد، مادر خسرو کا مزار ہے۔

(۳) روضہ وسط باغ میں بڑے دروازے کے مقابل۔ سلطان خسرو کی ہمشیرہ نے ۱۶۲۴ء میں اپنے دفن ہونے کے لئے یہ عمارت بنوائی تھی لیکن اور یہ خالی رہی۔ شعر بہت سے لکھے ہیں۔

(۴) روضہ سمت مشرق، مرقد خسرو۔

گزیٹیر سابق کے ذی علم مؤلفین کی جماعت نے جو مسٹر[2] اسٹیل، مسٹر فنشر و مسٹر رچرڈ سپرجان پرسکوٹ ہیوٹ
C. D. Steel, J. H. Fanshawe & J. P. Hewett
پر مشتمل تھی صرف امور ذیل کے لکھنے پر قناعت کی۔

(۱)[3] اُس راجپوت شاہ بی کی قبر معہ اس کی بیٹی اور بیٹے خسرو کے مقبروں کے خسرو باغ میں واقع ہے۔

(۲)[4] سڑک کے دوسری طرف وہ مکان ہے جس میں سپرنٹنڈنٹ باغ کی بود و باش ہے۔ عام روایات کے مطابق تمبولی بیگم کا مکان کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہی شاہزادی ہو جو فتح پور سیکری میں استانبولی بیگم کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

جدید گزیٹیر میں کرنیل نیویل نے اسی قدر[5] لکھا ہے کہ "خسرو کی ماں" رانی "نے افیون کھائی۔ وہ اس باغ میں دفن ہے۔ اسی جگہ خسرو اور اس کی بہن کے بھی مقبرے ہیں" دوسرے موقع پر[6] اضافہ فرماتے ہیں۔

۱۔ خسرو یہاں کے چاروں مقبروں میں سے بالکل اخیر پورب کے مقبرہ میں دفن ہے۔

۲۔ دوسرا مقبرہ خسرو کی بہن کا ہے جو ۱۶۲۵ء میں مری تھی۔ اس میں بہت سے کتبے ہیں مگر کتبہ

---

[1] مفتاح التواریخ صفحات ۲۲۵ لغایت ۲۳۲۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق صفحہ ۳۸۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۷۵۔ [4] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۱۷۹۔ [5] ایضاً صفحہ ۲۰۳۔

شکستہ حالت میں ہیں

۳۔ تیسرا خسرو کی ماں کا ہے۔

۴۔ باغ کے عین وسط میں چوتھا مقبرہ ہے جو تمبولن کا کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ تک افسر منتظم باغ کا مسکن رہا تھا۔

ان صاحبوں نے اور جو دو ایک باتیں کام کی لکھی ہیں، وہ ہر مقبرہ کے جداگانہ حالات میں نقل کی جائیں گی۔

ڈاکٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر Hunter ڈائرکٹر جنرل امپیریل گزیٹر آف انڈیا نے بھی صرف چند لفظوں میں خسرو باغ کا تذکرہ ختم کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں[1] کہ "یہ باغ اور روضہ شاہزادہ خسرو، ریلوے اسٹیشن سے متصل ہے۔ مقبرہ پر ایک خوبصورت گنبد دار عمارت تاج کے طرز کی بنی ہے اس کے اندر پھولوں اور چڑیوں کی تصویریں ہیں۔ دو اور چھوٹے چھوٹے مقبرے اس سے متعلق ہیں۔"

تاج کی نظیر شاید اس کی بے نظیر شہرت و نام کے سبب سے آپ نے پیش کی ہے، ورنہ وہ تو سالہائے دراز کے بعد بنا ہے۔

آپ نے دیکھا گزیٹر والوں نے کس اختصار سے کام لیا ہے۔ مفتاح التواریخ ہو یا کوئی ہینڈ بک گزیٹر، ان کی تحریروں میں فرق محض طرز ادا کا ہے۔ بیل صاحب لکھتے تو داہنی طرف سے ہر فارسی میں ہیں مگر مغربی انداز پر بائیں جانب نظر ڈالتے اور بائیں ہی سے شروع کرتے ہیں۔ مسٹر سٹیل باوجود اپنی مغربی و فرنگی حیثیت و وضع کے پہلے داہنی سمت دیکھتے اور اسی طرف سے لکھنے لگتے ہیں۔ کرنیل نیویل نے جو قلم و تلوار دونوں پر یکساں قدرت و قوت رکھتے ہیں اس مہم میں جادہ کہن یعنی اسٹیل صاحب کی مختصر نگاری کی فرسودہ روش سے ہٹنا گوارا نہیں فرمایا۔ ایک متبع یا مقلد کی طرح قدم بہ قدم چلے اور ایک ناقل کے طور پر انھیں کے الفاظ کم و بیش دُہرا دئے ہیں۔

ڈاکٹر فوہرر[2] کی کتاب "مستند آثار" میں اتنا لکھ کر خاموش ہو گئے کہ "یہاں خسرو، اس کی ماں اور بہن کے مقبرے اور تمبولن بیگم کا مکان ہے۔" اس تحریر میں نہ کوئی سلسلہ ہے نہ ترتیب۔ نہ اچھا کہتے ہیں نہ برا، پھر کوئی کیا کہے گا۔

مسٹر سیوریج[3] ایسٹ وک صاحب کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ نور جہاں کا بھی ایک خالی مقبرہ

---

[1] مطبوعہ ۱۸۸۳ء کے صفحہ ۱۹۸ جلد دوم ... [2] ... [3] جلد دوم بابت ممالک مغربی و شمالی و اودھ صفحہ ۳۰۔ [4] جرنل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی ۱۸۸۸ء صفحہ ۲۰۷ نوٹ ۲۔

یاسینوٹاف[1] cenotaph کا خسرو باغ میں تھا۔ موصوف نے خیال نہیں فرمایا کہ نورجہاں کب اور کہاں مری ہے۔ اُس کا تاجدار رفیق کتنے دن پہلے دُنیا سے رُخصت ہو چکا تھا اور کون ایسا دردمند و منت شناس باقی تھا جو کوئی یادگار تعمیر کرتا۔ پھر الہ آباد سے نورجہاں کو تعلق کیا تھا؟

ایک کارآمد و راحت رساں چیز جو اگلے زمانہ کی اہم اور ضروری تعمیرات میں داخل تھی اور یہاں بھی موجود تھی، ایک شاندار باؤلی تھی۔ حال کے مورخین نے وطنی ہوں یا مسافر، اُس کے بارہ میں کچھ نہیں لکھا۔ صرف پیٹر منڈے صاحب نے جو ۱۶۳۲ء میں یہاں آئے تھے تحریر فرمایا ہے[2]:-

”خود باغ کے پاس ہی ایک خوبصورت باؤلی یا کنواں ہے۔ اس میں ایک سو بیس[120] سے زیادہ سیڑھیاں ہیں۔ خوشنما شہ نشین اور محرابیں ہیں، چھوٹے درخت ہیں، گرمی میں رہنے سہنے کے لئے سرد خانے اور ٹھنڈے ٹھنڈے ہوادار مکان ہیں۔ جن کی دیواروں پر تازہ تازہ پلاسٹر فریسکو پر تصاویر اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک پہنچنے کا راستہ اندر ہی اندر ہے۔ یہ راستہ وسیع، کشادہ، آسان گزار اور خوب روشن ہے۔ حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا بچہ بھی نیچے چلا جاتا اور اپنے ہاتھ سے پانی لے لیتا ہے۔ ٹھیک اسی مقام کے اوپر جہاں کہ پانی ہے ایک کنوئیں کا اونچا سا منہ ہے۔ یہاں سے لوگ اپنے برتنوں، بیلوں اور اور طریقوں سے پانی کھینچ لیتے ہیں۔“

مسٹر ڈینیل نے اپنے نقشہ[3] میں ایک موقع رانی یا شاہ بیگم کے مقبرہ کے متصل بھی دکھایا ہے۔ جس میں بند چبوترہ اور صحن وغیرہ بھی صاف نمایاں ہیں۔ بہت سے تماشائی نیز حاجت مند مرد و عورت، پانی لے جانے کے مختلف برتنوں اور جانوروں کے ساتھ کھڑے، بیٹھے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ جگہ باؤلی کی نہیں، بلکہ باغ کے اندر کے کنوئیں کی معلوم ہوتی ہے۔ باؤلی کا انجام اُس کے مقام پر تحریر کیا جائے گا۔

پریاگ یا الہ آباد کی ہینڈ بک مرتبہ ماڈرن ریویو آفس میں اسی قدر لکھا ہے[4] کہ ”پرانا کنواں اور پانی کی نہریں اور نالیاں ایسی خوبصورت ہیں کہ اُن کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔“

---

[1] خالی مقبرہ جو کسی شخص کی یادگار میں جو کہیں اور دفن ہو، بنا دیا جائے۔ [2] سفرنامہ پیٹر منڈے، جلد دوم صفحہ ۱۰۱۔ اور مرے صاحب کی بنگال کی ہینڈ بک صفحہ ۳۴۴۔ نیز پروفیسر بنی پرشاد کی تاریخ جہانگیر صفحہ ۳۲۰۔ [3] موجودہ امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ۔ [4] صفحہ ۵۰۔

بیوریج صاحب فرماتے ہیں[1] "کہا جاتا ہے کہ خسرو کے دو بیٹے بھی خسرو باغ میں دفن ہیں۔"

سلطان خسرو اور شاہ بیگم کے پہلوؤں میں متعدد چھوٹی بڑی قبریں موجود ہیں۔ کوئی کتابہ نہیں نہ کسی تاریخ میں تذکرہ ہے۔ اس لئے ان شاہزادوں کے مرقد کا وثوق و صحت کے ساتھ تعین کرنا اس وقت دشوار ہے۔ آج کل کے بعض کم محنت آسان پسند لوگوں کا شیوہ ہو [illegible] تحقیق و تلاش ہر بات میں دخل در معقولات کرنا اور اپنی ہمہ دانی کے اظہار کے لئے کچھ نہ کچھ لکھ دینا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی مستحسن و پسندیدہ روش نہیں۔ ورنہ یہ کہہ دینا سہل ترین قیاس ہوتا کہ خسرو کی قبر کی بغلوں میں جو دو کے دفن ہیں یہی شاہزادے ہیں۔ کب مرے اور کس عمر میں۔ خسرو سے کتنے دن بعد۔ کیا نام تھا۔ آج ان سوالات کا جواب شافی کون دے سکتا ہے؟

باغ کے اندر داخل ہونے کے بعد بلکہ پھاٹک میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی ان عمارات پر میری نگاہ دفعتاً جس سلسلہ و ترتیب سے پڑی تھی وہ ذیل لکھتا ہوں اور وہ کرنیل نیول کی تحریر کے مطابق ہے۔

داہنی طرف سے سڑک کے ایک جانب

پہلا خسرو کا مقبرہ۔ گنبد در گنبد و دو منزلہ۔ کوٹھڑی ہیں۔ بغلوں میں دو بڑے۔ پھر کچھ ہٹ کر سنگین حوض ہشت پہل مع فوارہ۔ ویران و خشک اسی حال میں۔

دوسرا۔ حسب روایات زبانی و ناقابل اعتماد بلکہ لغو، خسرو کی بی بی کا۔ بلند بنیاد پہلی بیگم جیسا ہی ہے۔ قبر کا نشان ندارد ہے۔ مسٹر نیول و دیگر مؤرخ اس کو خسرو کی بہن سلطان النساء یا سلطان بہار بیگم کا لکھتے ہیں اور یہی قرین قیاس و قابل قبول ہے۔

پھر ویسا ہی ہشت پہل سنگین حوض اور فوارہ۔

تیسرا شاہ بیگم کا۔ سہ منزلہ۔ مختصر گنبد اوپر ہے۔ بیگم کی داہنی طرف دو قبریں۔ بائیں جانب دو۔ پہلو کی صحنچیوں میں بھی قبریں ہیں۔ کواڑوں سے محفوظ ہے۔

ان مقبروں کے پیچھے حوض کی پشت پر قد آدم پردہ کی دیوار جس سے کبھی پانی کے جھرنے اور آبشار رواں رہے ہوں گے۔

دوسرے قطعہ میں پچھم طرف۔ اس عمارت سے علیحدہ تمبولن یا [illegible] بیگم کا۔

---

[1] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی سنہ [illegible] صفحہ ۶۰۰۔

ان کی تعمیری ترتیب تو قدرتی یعنی تعمیر و زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے یہ ہونا چاہئے تھی۔

۱۔ شاہ بیگم - ۱۰۱۴ھ

۲۔ خسرو - ۱۰۳۱ھ

۳۔ سلطان بہار بیگم - ۱۰۳۴ھ

۴۔ تمبولن کا - لامعلوم

پہلی قبر بناتے وقت کس کو خیال ہوگا کہ یہاں دو شاہزادے اور بیٹیں بھی کبھی دفن ہوں گی بعد کی تعمیرات میں بھی سوء اتفاق سے کوئی سلسلہ و ترتیب ملحوظ نہ رکھا گیا۔ بس گنجائش پر نظر ڈالی گئی۔ جہاں جگہ پائی آباد کردی۔

دو چیزیں اور باقی رہ جاتی ہیں۔

ایک شاہ بیگم اور خسرو کے مقبرہ کے درمیان مستطیل چبوترہ۔ جہاں مرزا جہانگیر مرنے کے بعد دفن ہوئے تھے، پھر لاش دہلی بھیجی گئی تھی۔ یہ روایت مرزا صاحب کی حقانیت و تحقیقات سے پایۂ ثبوت خسرو کے مقبرے کی پہلی ہے۔ اس کے بارہ میں مناسب موقع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے گی۔

دوسرا ہشت پہل چبوترہ، جو سلطان بہار کے مقبرہ اور خسرو کے مقبرے کے سامنے روش کے اُس طرف، دوسرے قطعہ میں مثل "شہ نشین" بنا ہوا ہے۔ یہاں لوگوں کی زبان میں "باجا چبوترہ" کہلاتا ہے۔ تین چار برس پہلے تک یہاں بڑے دن (دسمبر) کے سلسلے میں دربار اور عرسوں پر سیر و تفریح کے جلسے اور کھیل تماشے ہوا کرتے تھے۔ اسی چبوترہ پر باجا بجتا تھا۔

زبانی روایت ہے کہ یہ چبوترہ جہیز کے سامان اور تحفوں سے بنا تھا۔ اس کی شکستگی اور شگافتگی کی یکسانی بھی اس پر شاہد حال ہے۔ اب یہ انگریزی میلے تماشے دوسری دوسری جگہ ہونے لگے ہیں اور وہ سو کے ایسا سکوت اور سناٹا اس کی خاموشیاں پر یہاں بھی ہر وقت چھایا رہتا ہے۔ منفرد و متفرق سیاح یا شہر کے بعض بے فکرے کبھی کبھی آ نکلتے ہیں۔ اب نہ کوئی چہل پہل ہونے پاتی ہے نہ زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ تاہم

اے عروسِ شرق! تیرے حسن کو جب آتا ہوں میں
مجھ کو تو اپنے جلوؤں میں چھپے پاتا ہوں میں

(۳)

رانی مان بائی - ''شاہ بیگم''

(جہانگیر بادشاہ کی پہلی محل - خسرو کی)

عمل آقا رضا مصور جہانگیری -

فردوس نشان [illegible] محمد حسین رئیس قنوج کے ذخیرۂ نوادر سے حاصل کی گئی

مقبول صمدی

شاہ بیگم

پُرسکوں حُسن و محبت کا یہ اک طوفاں دیکھ جس کے حُسنِ عشق و عنواں میں وہ رومان دیکھ

سب سے پہلا جنازہ جو اس گور زمین[1] پر اُتارا گیا، وہ شاہ بیگم کا تھا۔ شاہ بیگم جے پور کی راج کماری جہانگیر کی پہلی بی بی اور شاہزادہ خسرو کی ماں تھی۔ شاہ بیگم کا اصلی نام کسی پُرانے مورخ نے نہیں لکھا۔ مسٹر بیل جودھ بائی بتاتے ہیں[2]۔ لیکن اُنھوں نے خسرو کے چند مختصر حالات لکھنے میں کچھ چنداں تحقیق اور کاوش و احتیاط سے کام نہیں لیا۔ پروفیسر کونسل کشور نے "بڑی بیگم" اور "رحمت آرا بیگم" لکھا ہے[3]۔ بڑی بیگم ملکہ کا ہندوانہ نام نہیں ہو سکتا۔ مزید براں "بڑی" کا لفظ اُس وقت تک حرم سرائے سلطانی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ "زن کلاں" رائج تھا اور تاریخوں میں یہی ملتا ہے[4]۔ ابوالفضل نے "آئین الوس مغول" میں "حرم کلاں" لکھا ہے[5] اور محمد شفیع لکھنوی نے اپنی کتاب مرأت واردات میں "سرخیل زوجات" [illegible] رحمت آرا بیگم کسی ترکیب سے نہ ہندوؤں کا نام ہو سکتا ہے نہ مردوں کا لقب۔ رحمت کی آرائش کیا معنی رکھتی ہے۔ رحمت نسا تک لکھتے تو ماننا پڑتا، کیونکہ عالمگیر کی ملکہ نواب بائی راجہ راجو والی ریاست رجوری ملک کشمیر کی بیٹی کا نام تھا[6]۔

---

[1] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد صفحہ ۴۶۔

[2] مفتاح التواریخ صفحہ ۳۳۵۔

[3] آرٹیکل مندرجہ اخبار لیڈر مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء بعنوان تصاویر، اخبار مذکور ۱۱ اکتوبر۔

[4] آگرہ ہینڈ بک از کین صاحب صفحات ۱۹، ۲۷، ۳۰ سلطانہ رضیہ بیگم از [illegible] صفحہ ۱۲۱۔

[5] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۰۲ [illegible] Add [illegible]

ممتاز محل دختر آصف خاں بیگم سرخیل زوجات آں خسرو شیریں [illegible]

ڈاکٹر بینی پرشاد نے "مان بائی" تحریر کیا ہے[۱]۔ وہ مان سنگھ کی بہن تھی۔ اس لئے قرین قیاس ہے۔ اُن کی تحریر راجپوتانہ کی تاریخوں اور روایات پر مبنی ہے مسٹر فرانسیس گلیڈون Francis Gladwin نے بھی مان بائی لکھا ہے[۲] اور دوبار لکھا ہے۔ اُن کی تاریخ ۱۷۸۸ء کی تصنیف ہے۔ لارڈ کارنوالس کی سرپرستی میں شائع ہوئی۔ مسٹر ونسنٹ اسمتھ اس کی بڑی تعریف کرتے اور اُس کو عہد جہانگیر کا سنجیدہ و صحیح اور حسب واقع احوال بتاتے ہیں۔ پرنسپل رنگا سوامی اینگر جہانگیر کے متعلق بہت سی باتوں میں گلیڈون صاحب کی تحقیقات اور تحریرات کو قابلِ ستائش، اور اُن کی تاریخی وقعت بے حد لکھتے ہیں[۳]۔ یہاں کے سابق حاضر باش تعلقداروں کی حالت یہ ہے کہ جتنے مُنہ اُتنی بات۔ کوئی جودھا بائی کہتا ہے کوئی جیا رانی کوئی پریا۔ اگر ان کا کہنا اپنی موروثی معلومات اور پشتینی روایات پر مبنی ہوتا تو یقیناً آج کل کے بعض غیر محقق مورخوں سے ان کی بات زیادہ ماننے کے قابل ہوتی۔ مگر شاید جیا رانی اس کی پھوپھی اور ساس ملکہ مریم زمانی کا عرف تھا۔ اسی طرح جودھا بائی اکی چھوٹی سوت جگت گوشائیں یا بالمتی[۴] شاہ جہاں

۱؎ تاریخ جہانگیر صفحات ۲۸، ۲۹، ۳۰ و ہٹر کس صفحہ ۹۹، ۲؎ تاریخ جہانگیر صفحہ ۷۰ - نوٹ -

۳؎ تمہید تاریخ جہانگیر صفحات ۱، ۱۱ ۴؎ جودھا بائی کی اس پہلی اولاد کی نسبت نواب نصیر حسین خان لکھتے ہیں :-

"خرم کی پیدائش پر جو جشن ہوا اور حرم سرا میں جو خوشیاں منائی گئیں وہ ترکانہ نہیں ہندوانہ تھیں یہ پیدا ہو تو سدا کی رچی ہوئی ریت رسمیں برتی گئیں۔ زچہ خانہ تک گایا در جہد کی موہن سے بڑی بھاوج یا سوتی جی شہزادے کو گود میں لیے ہوئے ہیں مگر ہاتھ نہیں لگاتیں۔ موتیوں کے تھال سامنے ہیں۔ مگر ان کی بہا ابھی نہیں ہے۔ [illegible] سے منا منا کر کہتی ہیں کہ

مانگے ہے جودھا جی کا راج	لالہ جی کا نال نہ چھوا سمسے
تھال بھر موتی جودھا رانی لائیں	وہ بھی نہ لیوسے یہ دا سمسے

یعنی میں تو جب تک رانی جی کا آدھا راج پاٹ تھکا نہ لوں گی نال کاٹنے والی اور شہزادے (لالہ جی) کا نال کاٹنے والی نہیں۔ میرے آگے یہ تھال بڑا مال نہیں۔ (ست اظہار کھوٹہ (مغل اور اردو صفحہ ۱۳)۔"

کی ماں) کا عرفی نام ثابت ہوتا ہے[۵۱] رہا پربھا۔ ممکن ہے کہ کبھی پریا کہلاتی ہو مگر کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا۔ یہ لفظ ان اطراف میں 'بہترین خاتون' کے معنی میں مستعمل ضرور ہے اور عورتوں میں عزت و ادب کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔

صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کا مآثر الامرا میں یہ لکھنا کہ "سلطان خسرو اودے سنگھ عرف موٹا راجہ کی تان ستی' نامی لڑکی کے بطن سے متولد ہوا تھا"[۵۲] ایک فاش بلکہ فاحش غلطی ہے۔ مان ستی' یقیناً بال ستی کی کتابت کی عالم آشکار خرابی ہے[۵۳] جو ہی اودے سنگھ فرمانروائے مارواڑ کی بیٹی تھی۔ جس سے خسرو نہیں' خورم پیدا ہوا تھا۔ معاف رکھئے سوانح نویسوں' اور اس مقہور و بے بس ہندے سلیم کو جو کہنے کو اس وقت بھی ولی عہد اور کشور ہند کا آیندہ شہنشاہ تھا جس پر عہد شباب میں معصیت کوشی' ہوس رانی اور ہوا پرستی کا الزام بار و اغیار ناحق لگاتے ہیں[۵۴] جو حقیقۃً بیچارہ و مجبور' محض معذور تھا۔ جس کی عافیت اور اٹھتی جوانی بلکہ زندگی ہر سال مصالح ملکی' تعدیلاتِ سیاسی و انتظامی' تدابیرِ مملکت و جہانداری کی قربان گاہوں پر نذر چڑھائی جاتی تھی۔ جس کو اپنے بے ترس و ناخدا شناس باپ کی حکمت عملی' مرضی و خواہش پر روز روز تصدق ہونا پڑتا تھا۔ جس کے لئے کم عمری و عدم اشت سن میں بھی خود کام امرائے دولت کے عجز و نیاز' اعاظم سلطنت کی جاہ طلبی اور نمایش ایثار پر بی بیوں کی بھرتی جاری رہتی تھی۔[۵۵]

---

[۵۱] اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۳۰۵۔ ٹونکن کی آئر ہینڈ بک صفحات ۱۹، ۲۷۔

[۵۲] جلد دوم' صفحہ ۱۸۱۔ [۵۳] سیر المتاخرین (سلطنت مغلیہ)' صفحہ ۱۷۹۔

[۵۴] یورپ کے درباروں اور بادشاہوں کی عشرت کوشی و عیش طلبی اور وہاں کے امرا اور درباریوں کی عصمت فروشی اور طمع جاہ و مال کے سامنے یہ الزام و اتہام کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ [نوٹ نمبر م ملاحظہ ہو زیر صفحات ۱۱۴ و ۱۱۵۔]

[۵۵] اکبری عہد کی تاریخوں میں اس کے متعلق بہت سی تفصیلات ملتی ہیں۔ ایک اکبرنامہ جلد سوم کو لیجیے۔

لایا تھا گو مرا دلِ وحشی مصیبتیں　　لیکن تری نگاہ کو بھی اس میں دخل تھا

جو تخت و تاج اور کامل اقتدار و اختیار پاکر ایک[۱] اور صرف ایک' نورجہاں کا ہو کر رہا[۲]

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(۱) حکیم مرزا کی حقیقی ہمشیر سے شاہزادہ سلیم کا عقد' صفحہ ۲۰۹۔

(۲) سعید خاں گکھڑ کی لڑکی جس سے شاہزادی عفت بانو پیدا ہوئی تھی' صفحات ۵۰۹ و ۵۷۱۔

(۳) راجہ رائے سنگھ کی لڑکی سے شادی۔ جس میں خود اکبر راجہ کے یہاں گیا تھا' صفحہ ۵۰۹۔

(۴) خواجہ حسن عم زین خاں کوکلتاش کی دختر' روشن ستارہ' پرویز کی ماں' صفحہ ۵۹۴۔

(۵) شاہزادی دولت نسا کی ماں' صفحہ ۵۹۷۔

(۶) کیشو داس راٹھور کی لڑکی' بہار بانو کی ماں' صفحہ ۶۰۶۔

(۷) موٹا راجہ کی لڑکی۔ جس سے بیگم سلطان پیدا ہوئی' صفحہ ۶۰۶۔

" " " خورم پیدا ہوا' صفحہ ۶۳۲۔

" " " ایک اور بیٹی پیدا ہوئی' صفحہ ۶۸۳۔

(۸) مرزبان تبت کا اپنی دختر کو بھیجنا اور شادی' صفحہ ۶۳۲۔

(۹ و ۱۰) مبارک خاں اور حسین چک کی بیٹیوں کا شاہزادے کے محل میں داخل ہونا' صفحہ ۶۵۹۔

(۱۱) راجہ علی خاں کی بیٹی کا شاہزادے سے بیاہا جانا' صفحہ ۶۸۰۔

(۱۲) عبداللہ بلوچ کی بیٹی' ایک شاہزادی کی ماں' صفحہ ۷۰۴۔

(۱۳) ابراہیم حسین مرزا کی بیٹی' یہ بھی ایک شاہزادی کی ماں تھی' صفحہ ۷۱۵۔

(۱۴) زین خاں کوکہ کی لڑکی' صفحہ ۷۵۶۔

(۱۵) رام چندر والی اوڑچھہ کی لڑکی۔ تزک جہانگیری' صفحہ ۷۷۔ و ترجمہ مآثر الامرا' از بیورج' صفحہ ۲۰۷۔

[۲] ملاحظہ ہو قرونِ وسطیٰ از مسٹر اسٹینلے لین پول' صفحہ ۳۱۷ بحوالہ سیاحت نامۂ پیٹرو ڈی للاویل و سیاحت نامۂ سر ولیم ہاکنز جلد اول' صفحہ ۲۹۰۔ و ٹکن صاحب کی ہینڈ بک' صفحہ ۳۰۔ اور بہارِ مغل' صفحات ۲۲۳' ۲۴۴' ۲۵۳۔

لیکن ایامِ شاہزادگی میں اسی کی شبستانِ عشرت میں سات، (توصرف) رانیاں داخل کی گئی تھیں۔ اُن کا پتہ چلانا، نام و نشان بتانا کیا آسان بات ہے؟ تنہا صمصام الدولہ اور مسٹر بیل ہی نہیں بلکہ بہت سے لکھنے والے ایسی ہی غلط فہمی و غلط انکاری کا شکار ہوئے ہیں۔ کاش! تاریخ کے کسی ہوشیار مطالعہ کرنے والے کو توفیق رفیق ہو اور دودمانِ گورگان کی حریم۔عشوہ و ناز، سراپردۂ خلوت و ناموس میں باریابی۔تاکہ ان اُدرون پردہ، محرمانِ رازِ سلطنت ان راجپوتی رانیوں کا تذکرہ لکھے اور معمولی معمولی غلطیوں کا ازالہ کردے۔

خسرو باغ کی خاموش مگر مستقل آبادی کی بنیاد اسی عالی نژاد، نیک نہاد شاہزادی کے دم قدم سے پڑی، اس سلئے اس باغ کی تاریخ میں اُس کی شادی اور آمد کے تزک و احتشام نیز اندوہناک انجام کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر ہونا لازم ہے۔

غوغائے عشق و شورِ جنوں ماجرائے عقل   افسانہ تو قصہ تو داستانِ تست

عصرِ جہانگیری کے تمام مورخ اس بارے میں متفق ہیں کہ جہانگیر کی پہلی شادی پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہوئی۔ اور بڑے اہتمام اور تزک و احتشام کے ساتھ رچائی گئی تھی۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ملہ" نورجہاں بیگم حسنِ صوری کے ساتھ خوبی ہائے معنوی بھی بے شمار رکھتی تھی۔ اس کی رسائی طبع و درستی سلیقہ، وشعور تند اور فکر بریدہ یگانۂ زمانہ تھیں۔ بادشاہ کہا کرتا تھا کہ جب تک وہ میرے گھر میں نہیں آئی تھی، میں زینت خانہ اور کدخدائی کے معنے سمجھتا ہی نہ تھا۔ اکثر زیور اور لباس اور اسباب تزئین و تقطیع کہ جو ہندوستان میں سو ڈیڑھ سو برس پیشتر رائج و معمول تھے اسی کی اختراع ہیں، جیسے دو دامنی پیشواز کے لئے اور پنچ تولیہ اوڑھنی کے لئے، اور بادلہ و کناری، اور عطرِ گلاب جو عطرِ جہانگیری سے موسوم ہے، اور چاندنی کا فرش۔ یہ بھی اُسی کا وضع کیا ہوا ہے" مرزا عبدالقادر خاں ادبیاتِ مغل (صفحہ ۲۵۶) میں نورجہاں کی دستکاری، ہنرمندی و ذہانت کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔

حقیقۃً تفصیلات کے بیان میں بھی کچھ فرق نہیں کرتے۔ جو کچھ فرق ہے وہ طرزِ ادا، سخن طرازی اور انشا پردازی کا پایا جاتا ہے۔ ہر اہلِ قلم اپنے معاصر یا متقدم سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا اور ایک نقشِ رنگین آراستہ و پیراستہ کرنا چاہتا ہے۔

شاہنشاہی تاریخ نویس ابوالفضل علامی نے "آراستہ شدن بزم کدخدائی شاہزادۂ سلیم" کے عنوان سے اس مبارک تقریب، اس کی مصلحتوں اور اس کے اہتمام کو مع ضروری تفصیلات کے اپنے شاندار طرز اور لاجواب انداز سے اکبر نامہ میں خوب لکھا ہے۔

"سنہ ۲۹ جلوس ۹۹۲ھ الٰہی۔ دریں ہنگام بعرضِ ہمایوں رسید راجہ بھگونت داس کچھواہہ کہ از عقیدتمندی بہ پایۂ والائے امارت برآمد و باگزینِ نسب شرائفِ حسب را کہ ستودۂ خواست فراہم آوردہ دخترے دارد گوہر پارسائی بہ پیرایۂ بزرگ نژادی او ست بسیرت و صورت آراستہ۔ آرزوئے ایں خاندان آنکہ آں پاک سرشت بداں مشکوئے میزشال پیوندِ جاودانی یابد بشہریارِ قدردان خواہش پذیرفت و گروہے را شادی آمود گردانید و از آنجا کہ پیشینان ایں رازِ نہانی بر ملا انداز ندو ہنگامہ آرا جد او رنگ نشینِ اقبال برائے جشن آرائی کارشناسانِ جدگزیں نامزد فرمود۔ در کمتر زمانے دولت خانۂ خاص و عام آئین بستند، نگارگیانِ دشوار پسند را دل از دست رفت جشن ہائے شوق افزو مجلس ہائے غم زدا انتظام گرفت و بخشش و بخشایش را روز بازار شد۔ عشرت و شادمانی را پایہ بلند گشت رسوم و ساچق و نثار و دیگر نیک عادت ہائے بزرگان والا ہمت پدید آمد۔ بزم اسفند ار فرکشورسرانِ ملک و بزرگانِ دولت منزل راجہ بفروغ قدسی لزوم روشنی افزود و پیوند یک جہتی بگزیدہ آئین انجام گرفت و ہماں روز آں ہیکلِ قدسی را بشبستانِ اقبال آوردہ طرب کدۂ زفاف آراستند۔۔۔۔ امید کہ ایں پیوندِ جسمانی فروغ افزائے اقبال گردد و فرزندانِ والاخرد برخیزند۔"[۵۱]

---

[۵۱] اکبر نامہ جلد سوم، صفحات ۴۵۵ و ۴۵۶۔

ایک دوسرے جلیل المرتبت مورخ مُلّا نظام الدین ہروی صاحب طبقاتِ اکبری سنہ الٰہی یا آخر سنہ ۹۹۳ھ کے احوال میں فرماتے ہیں۔

" دریں اثنا ارادۂ جشنِ طوے حضرت شاہزادۂ سلطان سلیم از خاطرِ عاطرِ حضرت بادشاہِ جہاں بیرو وجہت ایں نسبت عظیم پرتو آفتاب عنایت بادشاہانہ بکمال راجہ بھگوانداس تافت صبیۂ اورا لائق ومناسب ایں رابطۂ عظیم دانستند وسبب آنکہ مجلس نشان بہشت بریں آرایش یافت وجہت اہتمام ایں آں حضرت خود بہ نفس نفیس درمنزل راجہ بھگوانداس تشریف قدوم ارزانی داشتہ مجلس عقد در ہمانخانہ بحضورِ قضات واشراف منعقد گردید مبلغ دو کرور تنکہ مہر صبیۂ راجہ مقرر شد۔ واز خانۂ راجہ بھگوانداس تا دولت خانہ زر وگوہر افشاندہ نثاری کردند۔

زبس گوہر وزر کہ افشاندہ شد   زبر چیدنش دستہا ماندہ شد

وراجہ بھگوانداس از اقسام جہیز از ہمہ آلات وپارچہائے نفیس وقمشہ وطویلہائے اسپان ویکصد زنجیر فیل وغلامان وکنیزکانِ حبشی وچرکس وہندوستانی چنداں بہ نظر اشرف گزرانید کہ محاسبانِ وہم اندیشہ از احصاء آں عاجز آمدند مجلسِ بزرگانہ وجشنِ خسروانہ آراستہ شد[1]

شریف الملک مسعود خاں تزک کے دیباچے[2] میں لکھتے ہیں کہ انتیسویں سالِ جلوسِ اکبری میں شاہزادہ کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو ۹۹۳ہجری (۱۵۸۵ء[3]) میں راجہ بھگوانداس کی بیٹی (مان سنگھ کی بہن) سے اُس کی خواستگاری ونسبت

---

[1] طبقات اکبری، صفحہ ۳۷۷۔

[2] صفحہ ۶۰۔

[3] مسٹر ایچ جی کین نے "مغل ایمپائر" صفحہ ۱۱۱ میں ۹۲ دا لکھا ہے۔ فارسی تاریخوں سے ہجری کا ماہ دیوم تحقیق ہونے کے بغیر میں اس کی مطابقت وتصدیق سے قاصر ہوں۔

کی گئی تھی۔ راجہ نے بھی اس موقع پر نیاز و پیشکش کے تمام لوازم ختم کروا کے اداس قربت و شادی کو اپنے سلاف و اخلاف کے اعزاز و افتخار کا وسیلہ سمجھا۔ تمام شاہزادوں اور بیگمات اور امرا و سرداران شاہی اور ملازمانِ خدمت کو اُن کے شایانِ شان سامانِ ضیافت بھیجا۔ شاگرد پیشہ اور احدیوں (باڈی گارڈ) کو نام بنام سراپا (خلعت) بھیجے۔ اس تقریب کی عظمت و جلالت اور مورخ کی تحریر کا انداز شوکت خود اسی کا مختصر نویس قلم ظاہر کر سکتا ہے۔[۵]

"صبیۂ قدسیۂ راجہ بھگوان داس را کہ از اعاظم امراے ایں دولت ابد مقرون بود و در زمرۂ اخصاے نامدار بمزید شوکت و اعتبار اختصاص داشت، بجہت آں حضرت خواستگاری نمودند و دولت خانۂ خاص و عام را آئین بستہ جشن بادشاہانہ ترتیب دادند۔۔۔ حضرت عرش آشیانی بورود مقدم اقبال توام منزلِ راجہ را پایۂ آسمانی بخشیدند و آں بانوے محلۂ عصمت و عفت را بگوہر یکتاے خلافت و سلطنت عقد ازدواج خجستہ امتیاز (امتزاج) بستہ بدولت سراے جاوید آوردند۔"

خلاصہ: راجہ بھگوان داس سلطنت کے بڑے امیروں میں سے تھا۔ نامور راجاؤں میں شمار ہوتا بلکہ اُس کی خصوصیت اور اُس کا اعتبار اوروں سے زیادہ تھا۔ راجا کی بیٹی جہانگیر کے لیے مانگی گئی۔ دولت خانۂ خاص و عام کی آئینہ بندی کی گئی۔ بادشاہانہ جشن منایا گیا۔ خود اکبر

---

[۵] ... بداؤنی صفحہ ۵۵۲، تاریخ فرشتہ جلد اول، صفحہ ۲۲۳۔ سیر المتاخرین جلد اول، صفحہ ۱۸۶۔ مسٹر ڈنکن گرین، جہانگیر، صفحہ ۳۰۔ کرنیل ٹی لیمن اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۲۲۸۔ تاریخ تاج از منشی معین الدین، صفحہ ۳ نوٹ۔

[۶] دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ د۔ بہ تاریخ ۱۱ ج ۱۲ ص ۱۳۰۔

[۷] ... [illegible] کا لقب قرار پایا تھا۔

نے راجہ کے گھر جا کر اُس کی عزت بڑھائی اور لڑکی کا بیاہ شاہزادہ سے کرکے پتے یہاں لے آیا۔"

اسی شادی کا تذکرہ خافی خاں، نظام الملکی ان الفاظ میں کرتے ہیں:[۵۱]-

"بعد کہ پانزدہ سال از نشو ونمائے نہال عمر شریف در گلشن جاہ و جلال گزشت صبیۂ راجا بھگوانداس را کہ از راجہائے نامدار دیار ہند گفتہ می شد برائے شاہزادۂ جوان بخت خواستگاری نمودند۔ وخود بدولت واقبال در جشن طوئے بخانۂ راجہ تشریف ارزانی فرمودہ آں بانوئے حجلۂ عصمت را بعقد در آوردہ بدولت خانۂ اپنے ہمراہ آوردند۔"

خلاصہ "شاہزادے کی عمر جب پندرہ سال کی ہوئی تو راجہ بھگوانداس جو ہندوستان کے نامی گرامی راجاؤں میں مانا جاتا تھا۔ اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کی منگنی کی گئی خود بادشاہ سلامت اس شادی کے جشن میں راجہ کے گھر تشریف لے گئے اور عقد کرکے لڑکی کو اپنے دولت خانے پر لے آئے۔"

خافی خاں ایک مستند و معتمد مورخ ہیں مگر سالِ عقد کے بارے میں یا تو اُن کے قلم نے لغزش کی ہے یا شیخ عبدالقادر بدایونی کے خامۂ سحر نگار نے۔ خافی خاں کے بیان[۵۲] سے پایا جاتا ہے۔ کہ اسی سال جلوس اکبری یعنی ۹۹۴ھ میں شاہزادہ محمد سلیم کا جشن طوئے راجہ بھگوانداس کی بیٹی سے (بسلسلۂ جشن نوروزِ عالم افروز) ہوا تھا کہ کابل سے مرزا محمد حکیم کے مرنے کی خبر پہنچی اور کنور مان سنگھ پسر راجہ بھگوانداس حکومت کابل پر ممتاز کیا گیا۔ ملا بدایونی اس جشن کا ۹۹۳ھ میں ہونا (یعنی سال مذکور کے ذیل میں) بتاتے ہیں مستشرقین نے بھی یہی لکھا ہے[۵۳]۔

۹۹۳ھ کے حالات میں علامہ ہندو شاہ فرشتہ کا بیان ہے[۵۴]:

---

[۵۱] منتخب اللباب، حصۂ اول، صفحہ ۲۳۵-

[۵۲] " " " صفحہ ۱۸۹-

[۵۳] اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۴۳۳ و مفتاح التواریخ ص ۲۰۹-

[۵۴] تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۶۶-

"و ہم دریں سال بہیئہ راجہ بھگوانداس را طوے و جشن عظیم کردہ بعقد شاہزادہ محمد سلیم درآوردہ"
شاہ نواز خاں لکھتے ہیں کہ "سال بست و نہم دختر عفت سیر شبت راجہ را با شاہزادہ سلیم پیوند جہوگانی بستند"[۵۱]

یہ راجہ بھگوانداس کچھواہہ والی جے پور، اکبر کا امیر الامرا، بڑا مقرب و معتمد آزمودہ کار سپہ سالار اور پنجاب کا ناظم صوبہ دار تھا۔ بہت سے کارہائے نمایاں کئے اور بارہا شجاعت و ثبات کے جوہر دکھائے تھے۔ اُس کی تعریف اسی قدر کافی ہے کہ راجہ بہارا مل کا بڑا بیٹا اور مرزا راجہ مان سنگھ فاتح میواڑ و گورنر کابل و بہار کا نامور باپ تھا۔ [لالہ سجان رائے ان دونوں ناموں کو بالترتیب بھگونت داس اور بہاری مل لکھتے ہیں[۵۲]۔]

شیخ عبدالقادر بدایونی نے اس تقریب شاہانہ کی دھوم دھام اور آرائشوں کے حالات کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔ بدایونی نیز بہادر شاہی کا بیان ہے کہ اکبر نے مصالح ملکی اور مہام سلطنت کے لحاظ سے ۹۹۳ھ ہجری میں تجویز کیا کہ شاہزادۂ ولی عہد (جہانگیر) کا عقد قرابت نامور خاندان کچھواہہ سے کیا جائے۔ یا جیسا کہ (بقول علامہ شبلی[۵۳]) بعض اہل راز کی روایت ہے، راجہ بھگوانداس نے اپنی بیٹی دینا، از خود اپنی مرضی و خوشی سے منظور کیا تھا۔

تجاہل کیوں ہے، میں ضامن، ادھر دیکھ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا!!

جوان دولت، جوان بخت، جوان سال شاہزادہ (سلیم) سولہ[۵۴] برس کا تھا۔ بادشاہ

---

۵۱ مآثر الامرا جلد دوم، ص ۱۳۰۔

۵۲ خلاصۃ التواریخ، صفحہ ۴۰۲ و ۳۰۳۔

۵۳ مجموعۂ کلام شبلی صفحہ ۵۱ — و مآثر الامرا، جلد دوم، صفحات ۱۱۱ لغایت ۱۱۳۔

۵۴ پروفیسر بینی پرشاد اپنی تاریخ جہانگیر (صفحہ ۲۹) میں لکھتے ہیں کہ شادی کے وقت سلیم کی عمر پندرہ برس پانچ مہینے تیرہ دن تھی۔ علامہ امین ہروی رشحات الفنون میں سولہ سال کا سن بتاتے ہیں (جلد دوم، قلمی، ورق ۲۲۰)

مع تمام امرا اور درباریوں اور خدم وحشم کے راجہ کے گھر گیا۔ مجلس عقد میں یک طرف شرفائے اسلام مفتی وقاضی رونق افزا تھے؛ دوسری طرف ہندو عمائد، پروہت، برہمن اور پنڈت جلوہ افروز پہلے مسلمانوں کے طریقے پر نکاح ہوا، خطبہ پڑھا گیا۔ دو کروڑ ٹنکے[۹۳] (یا حسب تحریر مآثرالامرا دو کروڑ روپیہ) کا مہر باندھا گیا۔ پھر ہندوؤں کی ساری رسمیں انجام دی گئیں۔ پھیرے پڑے۔ ہوَن ہوا۔ حجلہ گاہِ عروسی یعنی دُلھن کے گھر سے دُولھا کے عشرت کدہ تک خود بادشاہ سلامت (اکبر) عروسی محافہ، چوڈولہ یا پالکی، نالکی، پر اشرفیاں نچھاور کرتا لایا۔ پالکی کو ایک طرف بادشاہ کندھا دیے تھا، دوسری جانب شہزادہ۔ راستہ بھر قیمتی اور پُر تکلف ریشمی کپڑوں کا فرش بچھا تھا[۹۴]۔ راجہ نے جہیز بھی دل کھول کر دیا۔ اصطبل کے اصطبل خالی کر دیے۔ ان میں عراقی بھی تھے، عربی بھی، کچھی بھی، ترکی بھی، کہ اُس زمانہ میں گھوڑوں کی اچھی سی اچھی نسلیں یہی سمجھی جاتی تھیں۔ سو ہاتھی تھے اور سیکڑوں لونڈی غلام۔ ہندوستانی بھی، حبشی بھی، ختنی[۹۵] چرکس بھی۔ مرصع و مکلّل آلات وزیورات، سونے چاندی کے ظروف، طرح طرح کے برتن اور اسباب، جو ٹنکہ سب کچھ دیا اور بہت کچھ دیا۔ امرائے شاہی اور سرداران ہمراہی کو بھی حسب مرتبہ وحیثیت خلعت اور گھوڑے مع بیش قیمت زین اور جڑاؤ ساز وسامان کے عطا کیے۔ ادیاق منزل میں بھی یہی اہتمام اور داد ودہش اور جہیز کا تکلف مذکور ہے[۹۶]۔

---

[۹۳] کرنیل سی لیبن، بحوالۂ شیخ ابوالفضل و مسٹر بلاخ مین (نوٹ صفحہ ۱۱، آئین اکبری) [illegible] کہ ایک ٹنکہ کا وزن دام کے پانچویں حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ دام ایک مسی سکہ تھا [illegible] حصہ مانا جاتا تھا (ایضاً، صفحہ ۳۱)۔ جیسی طلین ٹنکہ = دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ (کہ [illegible] صفحہ ۱۲۱۔ نوٹ)

[۹۴] مآثرالامرا، جلد دوم، صفحہ ۳۰۔ تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ [illegible]۔

[۹۵] محمود کا مشہور غلام، ایاز بھی ختنی الاصل تھا (فرشتہ) اگرچہ صاحب [illegible] کا بیان ہے کہ والیٔ کشمیر کا بیٹا تھا اور ایک شاہزادہ۔

[۹۶] صفحہ ۳۲۳۔

شعر نے دولت نے مبارک بادیں پیش کیں۔ ابوالفیض فیضی نے یہ قطعۂ تاریخ نذر دیا، جس کے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے [1]۔

زہے عقد شاہزادہ سلطان سلیم — کہ پرتو دہد سال اُمید را
ز پیوستن آفتاب و ہلال — قرانے شدہ ماہ و ناہید را (۹۹۳ھ)

ابوالفضل نے عرض کیا۔

دین و دنیا را مبارکباد کیں فرخندہ عقد — از برائے انتظام دنیا و دین بستہ اند
دز نگارستانِ دولت نورِ چشم شاہ را — حجلہ چوں پردہ ہائے دیدہ رنگین بستہ اند

شیریں زبان و شیوا بیان شبلی نے بھی اس تقریب کو تین سو برس بعد یاد کیا ہے [2]۔ اُن کے دلاویز قطعہ کے بہت سے شعر زبانوں پر رہتے ہیں (اول و آخر چھوڑ کر)

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا

تو خود فرمانروا جے پور نے نسبت کی خواہش کی
اگرچہ آپ بھی وہ صاحب دیہیم و افسر تھا

ولی عہد حکومت اور خود شاہنشہِ اکبر
گئے انبیر تک جو تخت گاہِ ملک و کشور تھا

اُدھر راجہ کی نورِ دیدہ گھر میں حجلہ آرا تھی
اُدھر شہزادے پر چترِ عروسی سایہ گستر تھا

دُلھن کو گھر سے منزل گاہ تک اس شان سے لائے
کہ کوسوں تک زمیں پر فرش دیبائے مشجر تھا

---

[1] منتخب التواریخ، صفحہ ۳۰۶ و اکبرنامہ جلد سوم، صفحہ ۴۵۶۔
[2] مجموعۂ کلام شبلی، صفحہ ۱۵۔ (بہار افروز حکومت)۔

دلھن کی پالکی خود اپنے کندھے پر جو لائے تھے

وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر[۱] تھا

نواب نصیر حسین خاں خیال نے اس واقعہ کو دلچسپ انداز اور شیریں عبارت میں لکھا ہے[۱]
بہ تغییر خفیف اس کا نقل کر دینا ناگزیر ہے:-

"ملایان عہد نے لاکھ گھورا اور نظریں لگائیں مگر جو ہونے والا تھا وہ ہو کر رہا۔ یہ (ہندوں
اور مسلمانوں) کا عقد اتحاد بندھا اور خوب بندھا۔ رشتہ مضبوط ہوگیا شہزادہ سلیم دولہا بنا۔
بادشاہ خود بیاہنے گیا۔ رجپوتوں کی عزت بڑھائی۔ برات جمی اور رچی۔ منڈھا چھوا اور خوشی کا
یہ گیت گایا گیا۔

پربت بانس کٹا مورے بابل　　　　نئے کا منڈھا چھوائے رے

منڈھے اوپر کلس براجے　　　　دیکھیں راجا رائے رے

ان بولوں کے ختم پر دلھن کا چنڈول آیا۔ بادشاہ آگے بڑھا۔ دولھا (سلیم) کو بلایا۔
اس سے پالکی اٹھوائی۔ پھر خود کندھا لگایا۔ سب کا دل بھر آیا۔ راجہ راؤ سامنے آئے۔
ہاتھ باندھ کر اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرنے اور بھرے دل سے کہنے لگے۔

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باندی غلام ہے

ہماری　تمہارے　لونڈی　بندے غلام

بادشاہ اس پر بالیدہ ہو کر جواب دے رہا تھا "نہیں، نہیں

تمہاری رہے بیٹی ہمارے محلوں کی رانی۔ تم صاحب سروار رہے۔

تمہاری　　ہمارے

اس پر ایک کوک پڑ گئی۔ دلھن رخصت ہوئی۔ اور رجپوتوں کی بیٹی اکبر کی بہو اور ملکۂ ہندی

---

[۱] مآثر الامراء' جلد دوم' صفحہ ۱۳۰ [۲] سنل اور اردو صفحہ ۱۲۔

بارث راتی کہلاتی ہے۔

شاہ نواز خاں نے مآثر الامرا[۵۱] میں اس تقریب کو تقریباً پوری تفصیل (مندرجہ بالا) کے ساتھ درج کیا ہے۔ مگر جیسا کہ اُن کی اور بعض اور مسلمان مورخین کی روش ہے، اس وادی میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ

"عرش آشیانی بفروغ قدوم، منزل راجہ را روشنی افزود۔ اُو جشن خسروانہ ترتیب دادہ جہاز عروس با پیشکش از نظر گزرانید۔ کہ تفصیل آں محمول بر مبالغہ می شود۔"

صاحب مفتاح التواریخ (مسٹر بیل) نے بھی تقریباً یہی سب واقعات اپنے متقدمین کی تحریرات سے کم و بیش نقل کر دیے ہیں[۵۲]۔ "امرائے ہنود" میں بھی یہی تفصیل مرقوم ہے[۵۳]۔

کرنیل میلی سن اپنی تاریخ "اکبر اور سلطنت مغلیہ کے عروج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ شادی فتح پور سیکری میں بڑے احتشام اور پورے مراسم کے ساتھ انجام دی گئی تھی۔ بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں[۵۴]۔

شیخ ابوالفضل[۵۵]، مولانا نظام الدین[۵۶] اور تمام معاصر مورخین کی تحریرات سے راجہ بھگونت داس کے یہاں بادشاہ کے تشریف لے جانے اور محفل و برات کی رونق بڑھانے کی متفقاً تصدیق ہوتی ہے۔ لیکن اکبر صرف اپنے ہی شاہزادوں کی شادیوں میں خود نہیں جاتا تھا، بلکہ ہندو

---

[۵۱] حصہ دوم، صفحہ ۱۳۰۔

[۵۲] صفحہ ۲۷۶۔

[۵۳] صفحہ ۸۲۔

[۵۴] صفحہ ۱۲۸۔

[۵۵] اکبر نامہ، دفتر سوم، صفحات ۵۷، ۴ و ۵۰۹۔

[۵۶] طبقات اکبری، صفحہ ۳۶۶۔

امیروں اور عزیزوں کی تقریبات میں بھی اسی طرح بے تکلف و تامل شرکت کرتا تھا۔ اکبرنامہ سے پایا جاتا ہے کہ سنہ ۲۶ جلوس یعنی سنہ ۹۸۰ھ میں اس نے رام داس کی لڑکی کی شادی سام سنگھ سے کی تھی تو خود دُلھن والوں کے یہاں گیا تھا۔ عزت افزائی کی تھی۔ پانچ لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا تھا[51]۔

آج کل کی دُنیا شاید اس کو حکمت عملی یا مصلحت کوشی سے تعبیر کرے یا اکبر کی ہمہ گیر وسیع نظریہ پالیسی سے مگر واقعہ یہ ہے کہ اکبر کا یا کسی اور بادشاہ کا بیٹے کی سگائی کے لئے یا شادی بیاہ کے موقع پر سمدھی کے یہاں جانا آئینِ شرافت اور دستورِ قرابت کا پہلا باب تھا۔ اور اب بھی ایشیائی ممالک کے رسوم و آداب میں اُسی قدر ضروری و اہم سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی تقریب کے سال بھر بعد[52] یعنی جب جہانگیر سترہ برس کا ہوا، تو سنہ ۹۹۲ھ میں اس سے بھی زیادہ رفق و التیام، کوکبہ و احتشام، جماعت و انبوہ، فر و شکوہ، شوکت و شان اور آن بان کے ساتھ اس کا نقش ثانی تیار کیا گیا[53]۔ اور نہ تنہا اکبر بلکہ تمام بیگمات و مخدراتِ حرم سرائے سلطانی، دلھن کے لینے کے لئے، اُس کے گھر گئیں۔ خافی خاں لکھتے ہیں[54]:-

"دخترِ فرخندہ اختر راجہ اودے سنگھ پسر راجہ مال دیو زمرزبان مارواڑ کہ در حسب و نسب

---

[51] اکبرنامہ، دفتر سوم، صفحہ ۳۹۰۔

[52] دیباچہ تزک، صفحہ ۵۔

[53] کین صاحب اس شادی کا سال ۱۵۸۶ء، اور شاہزادہ خرم کی ولادت ۱۵۹۲ء میں، اور رانی کا عرفی نام جودھ بائی بتاتے ہیں (مغل ایمپائر، صفحہ ۱۱، تاریخ ہندوستان از مسٹر ڈی لافوس، صفحہ ۹۰۔ سیر المتاخرین، ج ۱، ص ۱۸۶۔ ڈنکن صاحب کی آگرہ ہینڈ بک۔ ص ۲۶۔

[54] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۴۵۔

ددولتِ موروثی برہمہ راج ہائے عالی تبار افتخار داشت، بعقد آں گوہرِ بحرِ سلطنت وجہانبانی نیز درآوردہ خود بذاتِ شریف وہمہ جملہ نشینان سراپردۂ عصمت، رونق افزائے خانۂ وکاشانۂ راجہ گردیدند۔ و بخور رتبہ و دستورِ سریرآرایان ہند لوازم شادی بہ تقدیم رسانیدند۔"

راجہ مال دیو کا بیٹا راجہ اودے سنگھ (والی مارواڑ) حسب ونسب اور موروثی دولت میں تمام بلند مرتبہ راجاؤں سے ممتاز و مفتخر تھا۔ اُس کی لڑکی کے ساتھ شاہزادہ کا عقد ہوا۔ بذاتِ خود بادشاہ اور تمام بیبیاں اور بیگمیں، راجہ کے یہاں گئیں اور ہندوستان کے بادشاہوں کے رتبہ اور دستور کے مناسب لوازم شادی انجام پائے۔

میر غلام حسین خاں سیر المتاخرین[1] میں راوی ہیں کہ (اودے سنگھ عرف) موٹا راجہ نے اپنی عزت و آبرو بڑھانے کے لئے بڑی شاندار مجلس ترتیب دی اور آراستہ کی تھی۔ خود بادشاہ کے آنے کے واسطے درخواست کی تھی۔ اکبر نے پاسِ عزت کر کے اُس کی خواہش قبول کی اُس کے گھر پر گیا اور اعزاز و افتخار بڑھایا۔

شبلی کی تربت منور رہے، سچ فرمایا ہے[2]

یہی ہیں وہ نسیم انگیزیاں عطرِ محبت کی کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

تذکرۂ خسرو میں لکھ چکا ہوں کہ ان مخلوط و مختلط قرابتوں کے متعلق دوست و دشمن سب یکساں رائے رکھتے ہیں۔ رہا باہمی طریقِ عمل اور سلوک و مودت۔ اوراقِ تاریخ شاہد ہیں کہ حق پسند و منصف مزاج دوست بھی اعتراض و حرف گیری سے معاف نہیں رکھتے۔ برملا سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہر حال میں اپنے، اپنے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے اقوال کی آپ کے یہاں وقعت نہیں۔ میرے نزدیک ضرورت نہیں۔ اس لئے

---

[1] جلد اوّل، صفحہ ۱۸۶۔

[2] مجموعۂ کلامِ شبلی، صفحہ ۵۱۔

صرف بعض مصلحت شناس و باخبر انگریز مورخین کی تحریرات نقل کر دینا کافی ہوگا۔

کرنیل ٹی لین اپنی تاریخ اکبر میں لکھتے ہیں کہ سلیم کی شادی اودے سنگھ راجا جودھ پور کی لڑکی، مادر شاہ جہاں سے ہوئی۔ اسی شاہ جہاں کی بدولت راجپوتی خون کو وہ منزلت و حکمت حاصل ہوگئی جس سے ہندوستان میں کوئی آگاہ نہ تھا۔ اور اس شادی سے کیسے کیسے اچھے نتیجے حاصل ہوئے۔ کرنیل ٹاڈ لکھتے ہیں کہ اکبر نے رشوت دے کر اس کو حاصل کیا تھا۔ یعنی چار صوبے مرحمت فرمائے تھے جس سے مارواڑ (جودھ پور) کے محاصل دوچند ہوگئے تھے۔[۵۱]

مسٹر ایچ۔ جی۔ کین، "مغل ایمپائر" میں[۵۲] لکھتے ہیں "اکبر نے وسط ایشیا سے تعلقات قرابت و ازدواج قطع کر دیئے اور امیر کے کچھواہہ خاندان سے شادی بیاہ کر کے اتحاد و یگانگی کی بنیاد قائم کی۔ اس نے ہندوؤں سے رسم و راہ پیدا کر کے اپنی رعایا کے لئے عمل دوافقت کی ایک شاہراہ دکھادی" دوسرے موقع پر کہتے ہیں[۵۳] کہ "نہ تو اکبر نے، نہ جہانگیر نے اپنی ہندو رانیوں یا بیبیوں کو تبدیل مذہب کرایا، نہ اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دی"۔ انجینئر ڈنکن صاحب ان بادشاہوں کی مذہبی رواداری، رانیوں کی ہندوانہ پرستش اور آزادانہ عبادت گزاری کی تحسین کرتے اور محلات سلطانی میں ان کی ضروریات اور پوجا پاٹ کے مناسب حال تعمیرات کا ذکر فرماتے ہیں۔[۵۴] نامور میکس مولر نے اپنی نفیس تصنیف "سائنس آف ریلیجن" Science of Religion کے حصہ اول میں اس بارہ میں سیر حاصل بحث کی اور مشہور کتاب فرینڈس اینڈ فوز۔ Friends & Foes (دوست و دشمن) سے اقتباسات و انتخابات دیئے ہیں۔

ٹامس کاریٹ صاحب Thomas Coryat تو اس درجہ تک بڑھ کر کہہ گئے ہیں[۵۵] کہ جہانگیر اُن لوگوں کو پسند ہی نہیں کرتا ہے جو اپنا مذہب بدل دیتے ہیں۔ وہ اپنے خود ساختہ مذہب کے سوا

---

[۵۱] صفحہ ۱۸۲۔ نیز ۲۲۴۔

[۵۲] صفحہ ۱۱۰۔

[۵۳] آگرہ کی ہینڈ بک، صفحہ ۶۲۔

[۵۴] ایضاً صفحات ۲۲ و ۲۹، ۲۲۹ نوٹ، ۲۳۹۔

بت شکن بھی ہمت اسلام ہے بت گر بھی ہے
قلعہ شاہی میں مسجد ہے جہاں، مندر بھی ہے۔

[۵۵] منقول از مغل ایمپائر صفحہ ۱۱۹۔ اصل کتاب کا نام Crudities خامیاں ہے۔ اور اسکی صفحہ بندی نہیں ہے۔

کسی دوسرے دین کا پابند ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی سلطنت میں تمام مذاہب کا یکساں احترام ہے" کین صاحب کہتے ہیں[۵۰] کہ "جہانگیر جب ولی عہد سلطنت تھا تو اکبر نے اُس کی ہندو رانیوں کے لئے فتح پور سیکری میں مکانات بنوا دئے تھے اور بقول فرگسن صاحب ان محلات پر ہندوانہ خصوصاً جین وضع کی آرائش و تزئین کرائی تھی" مسٹر اسٹینلے لین پول اپنی تاریخ "قرون وسطے کے ہندوستان[۵۱]" میں راوی ہیں کہ اکبر کی جے پوری دلھن آزادی کے ساتھ اپنے مذہب وملت کے تمام رسوم وارکان ادا کرتی تھی۔ اور ہندوؤں کی معینہ قربانیاں بھی کرتی تھی۔ ونسنٹ اسمتھ صاحب کا قول ہے[۵۲] کہ مذہبی معاملات میں جہانگیر اپنے باپ ہی کی طرح رواداری برتتا تھا۔ مسٹر وھیلر بحوالہ منوکی لکھتے ہیں[۵۳] کہ عالمگیر کی ملکہ ایک راجپوتانی شاہزادی، اُس کی پہلی اور جوانی کی بی بی تھی حرم سرائے شاہی میں بڑا رسوخ اور اثر رکھتی تھی۔ محل کے اندر اپنے بتوں پر خوشبوئیں جلاتی تھی۔ اس کا شوہر اگرچہ سخت پابند مذہب تھا، لیکن اُس کے دینی معاملات میں دست انداز نہ ہوتا دخل نہ دیتا تھا" اورنگ زیب اور زوال دولت مغلیہ" میں بھی کم وبیش ایسا ہی تحریر ہے[۵۴]۔ بیچ ہے پروانہ چراغ حرم و دیر نداند۔

خافی خاں منتخب اللباب میں لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کی بی بی نواب بائی بیگم شاہ میر نام ایک سید کی بیٹی تھی۔ کشتوار (علاقہ کشمیر[۵۵]) کے راجہ نے اپنی بیٹی سید کو دے دی تھی۔ سید نے اُس کو مسلمان کر کے عقد کر لیا۔ یک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی راجہ نے تربیت و غمخواری کی۔ سید صاحب حج کو تشریف لے گئے اور وہیں وفات پائی راجہ نے اُن بچوں کی اپنے طور پر پرورش کی۔ شاہ جہاں نے جب اُس راجہ کی بیٹی اور باج وخراج چاہا تو یہی لڑکی سید زادی جو حُسنِ صورت اور سیرت و ذکاوت میں موصوف تھی مع جہیز

---

۵۰ آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۷۱۔
۵۱ صفحہ ۲۵۱۔
۵۲ نوٹ نمبر ایک مسلی مس صاحب کی کتاب پر صفحہ ۵۴ جلد اول
۵۳ تاریخ آگرہ از خان بہادر سید محمد لطیف صفحہ ۴۹ ۔
۵۴ سلسلہ حکمرانان ہند آکسفورڈ صفحہ ۱۰۷ نوٹ۔ و ترجمہ سوانح عمری اورنگ زیب صفحہ ۳۱۶۔
۵۵ ملا نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ ولایت کھتواری کا نام کشتوار تھا۔

اور پیشکش کے بیچ دی گئی۔ شاہ جہاں نے معلم اور اتگہ مغلانیاں آداب سکھانے کے لئے معین کیں اور شاہزادہ اورنگ زیب سے عقد کر دیا۔ اسی کے بطن سے شاہ عالم بہادر شاہ تھا۔[۱]

اسی بدنصیب و بدنام اورنگ زیب کے آخر میں مسٹر ڈنکن تحریر فرماتے ہیں[۲] کہ شاہزادہ ولی عہد محمد معظم کی ماں راجپوتنی تھی۔ واقعہ ذیل اُس کی یادگار ہے۔ حرم شاہنشاہی کی ملکہ دملکہ پہلے شہنشاہ کی بہن روشن آرا بیگم تھی۔[۳] اُس کا درجہ و رتبہ سب سے بلند تھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس نے اپنی عظمت و وقار کو قائم نہ رکھا۔ ۱۶۹۴ء میں اورنگ زیب بیمار پڑا۔ موت کا اندیشہ سب کے پیش نظر تھا۔ اسی حال میں بیگم نے بادشاہ کی مُہر والی انگوٹھی چپکے سے اڑا لی۔ شاہزادہ محمد معظم کو محروم کر کے اُس کے بھائی محمد اعظم کو جو صرف چھ برس کا تھا تخت و تاج دلانے کی سازش میں شرکت کرنے لگی۔ کیونکہ یہ بچہ ایک مسلمان سلطانہ کے بطن سے تھا۔ بیگم کا مقصد یہ تھا کہ اعظم جب تک نابالغ اور ناقابل حکمرانی رہے گا عنانِ سلطنت میرے ہاتھ میں رہے گی۔ اور میں فرمانروائے مطلق بنی رہوں گی۔ معظم کی راجپوت ماں نے محافظین شاہی (گارڈ) کو رشوت دے کر اپنے خاوند کے کمرے تک کسی نہ کسی طرح رسائی حاصل کی لیکن بادشاہ اس

---

[۱] منتخب اللباب، حصہ دوم، صفحہ ۴۰۲۔
[۲] آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۴۲، نوٹ نمبر ایک۔
[۳] روشن آرا بیگم شاہ جہاں کی سب سے چھوٹی بیٹی اورنگ زیب کی بہن اور بڑی خیر خواہ و وفا شعار تھی ۱۰۸۱ھ مطابق ۱۶۶۹ء میں فوت ہوئی۔ شاہ جہان آباد میں اپنے ہی نصب کردہ باغ موسوم بہ باغ روشن آرا میں دفن کی گئی۔ (بیلس ڈکشنری صفحہ ۲۲۵) مورخین لکھتے ہیں کہ عالمگیر و شاہجہاں کے معاملات کو سلجھانے اور عالمگیر کو تاج و تخت دلانے میں ایک حد تک اُس کی مساعی جمیلہ بھی شامل و شریک تھیں۔ عالمگیر نے بھی حق مہر و محبت ادا کرنے میں دریغ نہیں کیا اُس کا مرتبہ و اعزاز کیا تھا؟ حرم سرائے سلطانی کے جلوس کے سلسلہ میں برنیر نے اُس کے تزک و احتشام کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ "جہاں تک ہو سکے آپ اپنے خیال کو وسعت پر وسعت دیجئے۔ آپ کے قیاس میں کوئی مرقع ایسا نہیں آسکتا جو اس سے زیادہ دل پر اثر ڈالنے والا اور شاندار ہو جو اُس وقت پیش نظر ہوتا تھا جب روشن آرا بیگم کی سواری ایک عظیم الشان ہاتھی پر نکلتی تھی۔ فیروزے جڑے ہوئے سونے کے میگھ ڈمبر (ہودج) میں سوار پیچھے پیچھے پانچ چھ ہاتھیوں کی قطار۔ اُن پر ویسے ہی جگمگاتے ہوئے میگھ ڈمبر کسے ہوئے، اور اُن میں ملکہ کی خواصیں بیٹھی ہوئیں، اُن کے پیچھے امرائے دربار کی بیگمات کی سواریاں، سب ملا کر ساٹھ ہاتھیوں کی ایک قطار ہوتی تھی ......" (سوانح عمری اورنگ زیب ترجمہ اردو صفحہ ۲۰۱)۔

وقت بیہوش و بدحواس پڑا تھا۔ اُس کو پہچان بھی نہ سکا۔ روشن آرا نے اس کو جرأت بیجا اور دخل نارواقرار دیا۔ راجپوتنی کو اتنا پٹوایا کہ اُس کا چہرہ داغدار ہو گیا۔ کمرے سے سختی کے ساتھ نکلوا دیا۔ اورنگ زیب نے صحت پائی اور یہ حال سُنا تو شاہزادہ ولی عہد کی ماں کی اہانت وسوءِ ادب کو برداشت نہ کر سکا۔ بہت بُرا مانا۔ مُہرِ شاہی کا چھین لینا ایک ایسا جرم تھا جس کو اُس نے کبھی عفو نہیں کیا۔

اورنگ زیب کی ایک اور بیگم کی نسبت مسٹر اسٹینلی لین پول فرماتے ہیں کہ کام بخش کی ماں اُودے پوری بائی تھی۔ یہی ایک عورت تھی جس کے ساتھ شہنشاہ کو بے حد الفت و تعشق تھا[51]۔ اس ملکہ کی اصل و نسل اور جذبات وفا کے بارہ میں جو کچھ مجھے تحقیق ہو سکا "حیات جلیل" میں گزارش کر چکا ہوں[52]۔

موئلف "امرائے ہنود"[53] اور "تاریخ آگرہ"[54] کا بیان ہے کہ آگرہ کے قلعہ کے محل میں ایک طرف پرکھما اور دوسری طرف مندر کے آثار اس وقت تک موجود ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ محلات شاہی میں راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے مذہب کے رسوم اور عبادت کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ بایالفاظ میر بدایونی یہ راج کماریاں تیموری قلعہ میں آنے کے بعد اپنے دھرم کے مطابق پوجا پاٹ کرتی تھیں۔ ٹھاکر جی کو جل پھول چڑھاتی تھیں۔ تلک لگاتی تھیں۔ پرکرما کرتی تھیں۔ ہَوَن کرتی تھیں۔ مسٹر کین شاہجہاں کے بارے میں بہت سی باتیں الفنسٹن صاحب سے اور کچھ اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں[55]۔ "یہ امر قابل تحریر ہے کہ شاہجہاں نے ہندو خواتین کے ساتھ شادی بیاہ کا رواج اُٹھا دیا جو اُس کے پیشیرووں نے قائم کیا تھا۔"

مسٹر ڈنکن فرماتے ہیں کہ[56] "ترقی اسلام کی سرگرمی میں شاہجہاں کی نقصان رساں روش کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ اُس نے وہ طریقہ جو اُس کے متقدمین نے ہندو خواتین کے ساتھ

---

[51] اورنگ زیب اور دولت مغلیہ کا زوال۔ از اسٹینلی لین پول (سلسلۂ فرمانروایان ہندوستان) مرتبہ سر ولیم ولسن ہنٹر۔ مطبوعۂ آکسفورڈ صفحہ ۲۰۱ نوٹ۔ نیز ترجمہ اردو صفحہ ۳۱۶۔

[52] حیاتِ جلیل حصۂ اول صفحہ ۱۰۷ نوٹ ۸۲۔ [53] صفحہ ۵۰۔ [54] صفحہ ۹۷

[55] مغل ایمپائر، صفحہ ۱۲۱۔

[56] آگرہ ہینڈبک، صفحہ ۳۹ (نوٹ)۔

شادی کرنے کا نکالا عتا بند کر دیا۔ اُس کی سب بی بیاں مُسلمان تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ شاہجہاں کی کوئی بی بی ہندو نہ تھی۔ مگر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اُس کے محل میں کتنی بیگمیں تھیں؟ خود مسٹر ڈکن بمشکل چار کا پتہ دے سکے ہیں[1] مسٹر بیل بھی اس سے زیادہ نہیں بتا سکے۔ پہلی مظفر حسین مرزا صفوی کی بیٹی۔ ایران کی شاہزادی "قندھاری بیگم" تھاں[2] جس سے رجب ۱۰۱۹ھ (ستمبر ۱۶۱۰ء) میں شادی ہوئی تھی۔ پرہیز بانو بیگم اسی کے بطن سے تھی۔ دوسری "ارجمند بانو بیگم" دختر آصف خاں مخاطب بہ ممتاز محل۔ جس سے ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں نکاح ہوا تھا[3] تیسری "شاہ نواز خاں پسر عبدالرحیم خاں" خان خاناں کی بیٹی۔ جس سے بقول مُلا عبدالحمید لاہوری مولف بادشاہ نامہ ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) میں محض بہ تقاضائے مصالح ملکی عقد کیا گیا تھا۔ شاہزادہ جہاں افروز جو سال بھر کا ہو کر جاتا رہا اسی سے پیدا ہوا تھا۔[4] چوتھی "فتحپوری بیگم" یا فتح پوری محل[5] جس کی آگرہ[6] اور دہلی[7] کی فتحپوری مسجدیں یادگار ہیں۔ بڑی سخی و دیندار تھی۔ اور ایک اکبر آبادی محل[8] جس نے آخر وقت تک رفاقت کی۔ اعزاز النسا نام تھا۔ ذی الحجہ ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۷ء) کو اس جہاں سے رخصت ہوئی۔ سر سید احمد خاں[9] اور مسٹر فرنچ[10] نے صرف دو دو بیگموں کا ذکر کیا ہے۔ منشی معین الدین ایک اور ملکہ سرہندی بیگم کا بھی نام لیتے ہیں جس کا روضہ اکبر آباد میں موجود ہے یہ سرہند کی رہنے والی اور بڑی حسین و جمیل تھی۔[11]

پھر شاہ جہاں پر اعتراض کرنے والوں کو بھی (ڈکن صاحب صفحہ ۳۷) تسلیم ہے کہ شاہجہاں ایسا

---

[1] آگرہ ہینڈ بک صفحات ۳۹ - ۳۷ - ۱۸۵۔

[2] تاریخ مرقع آگرہ صفحہ ۴۱۔ [3] تاریخ مرقع آگرہ صفحہ ۴۱۔ بیلس ڈکشنری صفحہ ۵۳۔

[4] معین الآثار صفحہ ۱۱۹ - و - آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۱۸۵ و ... صفحہ ۸۹ - و آثار الصنادید صفحہ ۲۷۔

[5] تاریخ تاج انگریزی صفحات ۵ ، ۷ و ۲۰۲ و معین الآثار ۱۱۵ و - آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۱۸۵۔

[6] بیل صاحب کی ڈکشنری صفحہ ۸۹ و معین الآثار صفحہ ۱۱۶۔ [7] تاریخ مرقع آگرہ صفحہ ۴۱ نیز ڈاکٹر ہوی کا ترجمہ تاریخ فرح بخش صفحہ ۱۳۲

[8] تاریخ تاج صفحہ ۶ ، ۷ - آثار الصنادید صفحہ ۹۰۔ [9] آثار الصنادید مطبوعہ [illegible] صفحات ۱۱۹ ، ۷۰ [10] سیاحت نامہ بالائی ہند [illegible] صفحہ ۱۱۷ - مرقع آگرہ صفحہ ۴۱ - و - ترجمہ فرح بخش ۱۲۰ -

[11] تاریخ تاج صفحہ ۲ ، ۷ - و - معین الآثار صفحہ ۱۱۳۔

سچا، پاکباز اور فدائی شوہر تھا کہ ارجمند بانو[ا] کی وفات (دسمبر ۱۶۲۹ء) تک اُس نے کسی دوسری طرف نظر نہ کی۔ وہ ادھیڑ عمر کی عورت جو شوہر سے بھی کچھ دن بڑی تھی اور چودہ بچوں کی ماں[۲] ہو چکی تھی، کیا ہوس رانی و نشاط انگیزی اور عشرت پسندی کا ذریعہ ہو سکتی تھی ؟!

بہرکیف میں نہیں سمجھتا کہ ان صاحبوں کی تحریر کس تحقیق یا اطلاع پر مبنی ہے۔ ہندوستان کی تاریخیں[۳] اُس کے خلاف شہادت دیتی ہیں۔ یہ سلسلہ جوان بے پوری، جودھ پوری، وہ ادرانیوں کے دم قدم سے چلا تھا، فرخ سیر تک ختم نہیں ہوا۔ سب سے اخیر راجپوتنی مہاراجہ اجیت سنگھ کی بیٹی تھی، جو دلّی کے لال قلعہ میں آ کر دلھن بنی[۴]۔ اس سیہ طالع، سیہ قدم راجکماری کی شاندار آمد، شوہر کی معزولی و ہلاکت اور اُس کی ناشاد زندگی کے بارے میں "حیات جلیل" کے بہت سے ورق سیاہ کر چکا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کے محل میں پانچ ہندو رانیاں تھیں اور جہانگیر کے یہاں سات۔ شاہجہانی چمن دیسی پھولوں کی بہار اور خوشبو سے ضرور خالی رہا۔ لیکن اس کے بھائی پرویز، اس کے دونوں بیٹوں، مراد اور شجاع، کی محل سراؤں میں راج دُلاریاں راج کماریاں رونق افزا تھیں۔ خود عالمگیر اورنگ زیب کی دو بیگمیں راجپوت تھیں

[ا] شاہجہاں سے شادی کرتے وقت جہانگیر نے ممتاز محل خطاب دیا تھا۔ مسٹر کین نے اس کے حُسن و جمال، سلیقہ و کمال، ہمدردی، انسانی، مساکین نوازی، پرورش یتامیٰ کی نگہداشت، وجاہت، نیک دلی و دین داری کی مدحت و توصیف فرمائی ہے۔ آگرہ ہینڈ بک صفحہ ۴۸۔ محمد شفیع لکھنوی بھی بڑی تعریف کرتے اور لکھتے ہیں کہ ممتاز محل دختر نواب آصف خاں کہ سر خیل زوجات آں خسرو شیریں کردار بود۔ (مرأت واردات نسخہ خطی عجائب خانہ برطانوی)۔

[۲] بادشاہ نامہ ملا عبد الحمید لاہوری، جلد اول، صفحات ۳۸۴ لغایت ۳۹۳۔ سوانح عمری اورنگ زیب اُردو (سلسلہ مشاہیر فرمانروایان ہند)، صفحہ ۲۴ نوٹ۔ اورنگ زیب اور سلطنت مغلیہ کا زوال از اسٹینلے لین پول، صفحہ ۱۴۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۴۷ (نوٹ)۔ تاریخ تاج انگریزی از منشی معین الدین، صفحہ ۱۲۔ ترجمۂ مآثر الامرا، از بیورج، صفحہ ۲۹۴۔

[۳] مآثر الامرا، خافی خاں، مآثر عالمگیری، امرائے ہنود، بیل، جدونامۂ سرکار

[۴] حیات جلیل حصہ دوم، صفحہ ۶۳، مثنوی طوطے فرخ سیر از میر عبد الجلیل بلگرامی۔ زبدۃ الاخبار قلمی صفحہ ۱۰۹۔ امرائے ہنود صفحہ ۷۔ بیل کی ڈکشنری، صفحات ۲۳۵، ۱۳۰۰۔ کین کی ہینڈ بک مرمہ ڈنگل، صفحہ ۷۴۔ گلستان ہند دفتر دوم، صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷۔

ایک راجہ کستوار (کشمیر) کی بیٹی یا (حسب روایت منتخب اللباب[51]) نواسی جس کے بطن سے بہادر شاہ تھا۔ دوسری اُودے پوری[52] جس نے مرتے دم تک اپنے تاجدار سرتاج کا ساتھ دیا اور حق وفا ادا کیا۔ اسی طرح اور تیموری شاہزادوں کو لیجئے۔ دارا شکوہ کا فرزند سلیمان شکوہ عالمگیر کے چاروں بیٹے پوتے اور پرپوتے سب اسی شاہانہ سوغات سے مستفید و فیض یاب تھے۔ گورگانی یا صاحب قرانی شجرۂ نسب میں ایسی سات رانیوں کے نام روشن نظر آتے ہیں۔ جن کے "پتی" بھی مکٹ دھاری تھے اور "پتر" بھی مکٹ دھاری ہوئے۔

آیئے اب ہم اور آپ خود بھی تو ان مختلط و پیوندی قرابتوں کے قبائح، محاسن، فوائد و نتائج پر نگاہ ڈالیں اور غور کرلیں۔

جیسا کہ ضحی الاسلام کی فصل اول میں علامہ احمد امین نے تحریر کیا ہے "فاتح و مفتوح قوموں کی آمیزش حضرت عمر بن الخطابؓ کے عہد خلافت سے شروع ہوگئی تھی اور اس ازدواج باہمی یا بین الاقوامی سے ایک نئی قسم پیدا ہوئی تھی جس میں عربی و غیر عربی دونوں خون تھے۔ بلکہ اس میں اُن تمام قوموں کی خصوصیات جمع ہوتی تھیں جن سے اس کا خمیر پڑا تھا۔ خواہ یہ خصائص جسمانی ہوں یا عقلی خلقی ہوں یا روحی۔ حضرت شہر بانو اور سادات حسینی ان کی اولاد کو دیکھ لیجئے۔ اور یہ تو کھلا ہوا راز ہے کہ مختلف قوموں کے بایکدگر ازدواج اور مختلف افکار و خیالات کے باہمی امتزاج سے ادب و شعر، علم و عمل، ہنر و فن، وضع و قطع حتیٰ کہ سادگی و تکلفات اور روحانیات و الہامات ہر چیز میں عروج و ترقی ہوتی رہی[53] ہے۔"

---

[51] خافی خاں حصہ دوم، صفحہ ۶۰۴۔

[52] پوری تحقیق ملاحظہ ہو۔ ادبیاتِ مغل، صفحہ ۱۵۵۔ اورنگ زیب اور زوالِ حکومتِ مغلیہ، صفحہ ۲۰۱ نوٹ۔ نیز ترجمہ صفحہ ۲۱۶۔

[53] مطبوعۂ مصر۔

انگلستان کا مشہور فلاسفر اور ادیب برنرڈ شا مخلوط نسل کے متعلق حسب ذیل نظریہ پیش کرتا ہے:

"میں انگلستان کی بہتر نسل پیدا کرنے کے لئے اس امر کا قائل ہوں کہ اگر ماں ایک قوم کی ہو تو باپ دوسری قوم کا ہونا چاہیے۔ اگر اس اصول پر عمل نہیں کیا جائے گا تو نسل بتدریج کمزور اور خراب ہوتی جائے گی۔ انگریزوں کی نسل کو دیکھو جس میں غیر ملکی اقوام کے خون کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ آمیزش جس قدر زیادہ ہوگی، اُسی قدر اُس کے نتائج بہتر نظر آئیں گے۔[۵۱]"

کرنیل می لیبن "اکبر اور سلطنت مغلیہ کے عروج" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "اکبر کے عہد تک راجپوت شاہزادے حقارت کے خیال سے مذہب اسلام کے شاہزادوں کے ساتھ اتحاد و ازدواج کرنے کا خیال چھوڑے ہوئے تھے۔ انکار تھا۔ مگر اکبر کی آرزو تھی کہ دونوں ایک ہو جائیں۔ نسل و مذہب کے اختلافات کسی انسان میں کوئی اختلاف پیدا نہیں کر سکتے۔ وہ اس اصول پر کاربند ہوا اور عمل میں لایا۔ اُس کو بہت سے تعصبات راہ سے ہٹانا پڑے۔ وہ غالب آیا، خصوصاً اُن پر جو راجپوت شاہزادوں کی طرف سے پیش ہوتے تھے۔[۵۲] ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ اپنے مقاصد اور اتحاد کے حاصل کرنے کے لئے اکبر نے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے، اُن میں سے ایک تو وہ شادیاں تھیں جو اُس نے خود اپنی نیز اپنے خاندان والوں کی اسی ملک کے شاہزادوں کی بیٹیوں سے کیں۔ وہ جانتا تھا کہ شادی سے زیادہ کوئی ذریعہ مساوات کا نہیں ہے۔[۵۳]

اکبر کو حکمرانی کرتے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ اُس نے اس امر کی اہمیت کا اندازہ کر لیا کہ راجپوتانہ کے ہندو شاہزادوں کو اپنے تخت کے ساتھ ایسی گرہ سے وابستہ کرے جو دوستی محض سے کہیں زیادہ قوی و قریبی ہو۔ یہ لکھنا کس قدر دلچسپی کا باعث ہے کہ اُس نے

---

[۵۱] روزنامہ زمیندار، جلد ۲۱، نمبر ۱۸۳، مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۴ء۔

[۵۲] صفحہ ۱۲۸۔

[۵۳] صفحہ ۱۲۹۔

راجستان کے اعلیٰ شاہزادوں کی طبعی و اندرونی تعصبات پر غالب آنے کا کیا انتظام کیا، وہ بھی ایسے اتحاد پر کیسے رضامند ہو گئے جس کو اُن کی کثیر جماعت اپنے دل میں اپنی تحقیر و بے عزتی سمجھتی تھی[51]۔"

شاہزادۂ خسرو کے کتابی تذکرہ میں میں نے سیر حاصل بحث کی اور تاریخوں کی ورق گردانی کر کے اُن رانیوں کا ذکر کر دیا ہے جو اکبر سے بھی پہلے اسلامی فاتحین کے مشکوے حرم میں داخل ہو چکی تھیں۔ مثلاً سلطان معز الدین سام اور راجہ اُچھ کی بیٹی[52] غیاث الدین خلجی اور رانی خورشید، راجہ بگلانہ کی لڑکی[53]۔ ناصر الدین خلجی اور راجہ چوندس کی بیٹی، جو رانی بے پوری کہلائی[54]۔ نیز بھوبی داس لسپر شودا کی بیٹی رانی چتوری[55]۔ جنھوں نے فرط اتحاد و محبت سے اپنے شوہروں کا طریقہ و مذہب اختیار کر لیا تھا۔

نظیری نے سچ کہا ہے۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیرِ محبت نہ رسد　　کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

اس موقع پر پہنچ کر کچھ صاف صاف باتیں بھی کہہ ڈالنا ضروری ہیں۔ اکثر مورخین و اہلِ قلم نے منصف مزاج ہو کر یا بن کر یہ تجویز کیا ہے کہ اکبر اور اُس کے اخلاف و پس آیندگان کی یہ پالیسی نہایت کامیاب ہوئی۔ اور یہ اختلاط و ازدواج باہمی ملک و ملت راعی و رعایا سب کے حق میں نفع رساں اور نعمت و برکت ثابت ہوا ہے۔ اس سے پیشتر کیا کیفیت تھی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی فرماتے ہیں "بابر کے ساتھ راجپوتوں کی بے وفائی اور کجروی خود اُن کی شکست کا باعث ہوئی رانا سانگا فتح پور سیکری میں مغلوب ہوا...... بابر و ہمایوں کی تاریخ کا ایک ورق بھی ہم کو یہ نہیں بتاتا کہ ایک راجپوت نے بھی کسی وقت اُن کا ساتھ دیا ہو۔ ہمایوں کی شکست اور شیر شاہ کی فتح کا سب سے بڑا سبب یہی تھا[56]۔ بخلاف اس کے ان تعلقات و قرابت کے پیدا ہو جانے پر (بقول اسٹینلے لین پول) اس

---

[51] صفحہ ۱۸۱۔

[52] تاریخ فرشتہ مقالہ دوم، صفحہ ۵۶۔

[53] تاریخ فرشتہ مقالہ پنجم، صفحہ ۲۵۷۔ تاریخ ظفر الوالہ بمظفر و آلہ۔ از حاجی دبیر جزو دوم، صفحہ ۲۰۹۔

[54] " " صفحہ ۲۴۳ [55] طبقات اکبری، صفحہ ۵۷۳۔

[56] مقدمہ رقعات عالمگیر مطبوعہ دار المصنفین صفحات ۳۴۴ و ۳۴۵۔

ملک کے بعض بعض راجا بیس بیس ہزار سوار کا لشکر لے کر اورنگ زیب کی رفاقت میں لڑنے کو جاتے تھے اور ایسے راجاؤں کا شمار سو سے متجاوز تھا۔[ا]

لیکن یہ نظریئے صرف بیگانہ ممالک اور غیر اقوام کے اہل الرائے نے نکالے ہیں۔ ہمارے عزیز وطن کے دانشمند مدبروں نے اس کو بُری نگاہوں سے دیکھا اور ناپسندیدہ بتایا ہے۔ اس کے نتائج دونوں فریق کے لئے مُضر اور نقصان رساں ثابت کئے ہیں۔ مولوی محمد یحییٰ فرماتے ہیں[ب] "حقیقت یہ ہے کہ مسلمان من حیث القوم اکبر کی پالیسی اور اس کی لامذہبی کو نظرِ استحسان سے نہیں دیکھتے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو سلطنت مغلیہ کے زوال کا پیش خیمہ اکبر کی پالیسی تھی۔ اکبر نے راجپوتوں سے رشتے ناتے کر کے ان کو اندر اور باہر سلطنت میں دخیل کر لیا۔ حالانکہ محکوم قوم کا تالیف قلوب کرنا کتنا ہی عمدہ اور قابل ستایش فعل کیوں نہ ہو لیکن حاکم کو اپنی گردن اُس کے ہاتھ میں دے دینا موت اور زوال کی نشانی ہے" شاید یہی راز تھا کہ بنی اسرائیل کی پرانی متمدن قوم غیر قوموں سے ازدواج و مناکحت ناپسند کرتی تھی۔[ج]

خود ہندوؤں کا خیال اس بارہ میں کیا ہے؟ اس کو بھی ایک روشن خیال تعلیم یافتہ اہل الرائے کی زبان سے سن لیجئے مسٹر نانالال مہتا اپنے مقالہ موسومہ ہندوستانی تمدن میں اسلام کا حصہ میں لکھتے ہیں۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین بادشاہوں کی شادی بیاہ نے اتحاد کا کام نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اسلام جو آزاد ہے کھانے پینے اور پرستش کے بے معنی قیود کی جانب التفات نہیں کرتا بلکہ نظر حقارت سے دیکھتا ہے وہ کسی مستوی سطح پر ایسی سوسائٹی (جماعت) سے کیسے مل سکتا تھا جو ابدی طور پر رسمی طہارت و صفائی پر راغب ہے۔ اس لئے ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے یہ باہمی ازدواجات دوستی و محبت کے گہوارہ جنباں نہ تھے۔ بلکہ یہ ان کی تذلیل اور خود اپنے لوگوں کو اپنے جماعتی مدارج کی حرص و ہوا کے اندر

[ا] سوانح اورنگ زیب ترجمہ از مسٹر ہیر فرمانروایان ہندوستان صفحہ ۱۶۰۔

[ب] سیر المصنفین جلد دوم صفحہ ۲۱۹۔ مطبوعہ جامعہ پریس۔

[ج] از رسالہ ناظر ماہ ستمبر ۱۹۳۲ء نمبر ۳۔

رکھنے کی ناقابلیت ظاہر کرنے کی محض ایک صورت یا تدبیر تھی اس لئے ان مخلوط شادیوں سے جو شاہی نسلیں یا اولاد ہوتی تھیں وہ اگر کوئی شے بھی نہ ہوں تاہم بت پرست ہندوؤں کے لئے خاص خون والے مسلمانوں سے کہیں زیادہ مخالف و متعصب ہوتی تھیں۔ اس کے متعلق مجھے صرف فیروز تغلق اور شاہجہان کا نام لے دینا کافی ہے[1]۔"

رہا شاہجہان کا اپنی ہندو رعایا اور راجپوت امرا اور رؤساء کے ساتھ طرز عمل، اتحاد اور اخلاص۔ اُس کی بے تعصبی کی شہادت کے لئے کسی مسلمان مصنف کا قلم درکار نہیں، بلکہ یورپین سیاحوں اور مورخوں کی تحسین و تحریر موجود ہے۔ برنیر صاحب کا بیان ہے کہ شاہجہاں کی حکومت ایسی عمدہ اور مشفقانہ تھی جیسی کہ باپ کی خاندان پر ہوتی ہے[2]۔ مسٹر اسٹینلے لین پول فرماتے ہیں کہ ہندو لکھنے والے شاہجہاں کے انصاف اور رواداری وغیرہ کی بڑی تعریف کرتے ہیں[3]۔

کیا شاہجہاں کے متعلق مسٹر کین اور مسٹر ڈکمن کا یہ الزام لگانا اب بھی حق بجانب سمجھا جائے گا؟

کرنیل می لیسن Malleson اپنی "تاریخ اکبر اور سلطنت مغلیہ کے عروج" میں لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی آبادی کل میں بڑی تھی جو مسلمانوں کے زیر حکومت تھی۔ ان کو اپنے فرائض مذہبی آزادی سے ادا کرنے کی اجازت تھی۔ البتہ جزیہ ادا کرنے کے مستوجب تھے، جو ادیانِ غیر کے اشخاص اور غیر جنس کی رعایا پر عائد ہوتا تھا مگر حکومت کے تمام صیغوں میں ہندوؤں کا عنصر بہت غالب تھا۔ اکثر صوبوں میں اسی مذہب کے اعلیٰ طبقے گورنروں کے ماتحت موروثی عمل و دخل رکھتے تھے اور زمانۂ جنگ میں اپنی افواج کا حصہ میدان کارزار کی خدمات کے لئے لاتے تھے۔ جیسا کہ تمام متقدم اور معاصر شاہد و ذرائع سے پایا جاتا ہے[4]۔

---

[1] اخبار لیڈر صفحہ ۸، مورخہ ۷ جنوری ۱۹۳۶ء، چہار شنبہ۔

[2] اورنگ زیب اور زوال سلطنت مغلیہ (سلسلۂ حکمرانان ہند) مرتبہ سر ولیم ولسن ہنٹر، صفحہ ۵۔

[3] " " " " " " " " " صفحہ ۱۵۔

[4] مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۱۶ء، صفحات ۴۷ و ۵۔

جہانگیر کی بے تعصبی اور غیر مذہب والوں خصوصاً مسیحیوں پر التفات و توجہ کے اعتراف و ستایش میں سرٹامس رو اور پیٹرو ڈیلاویلے نے صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں[1]۔

باز آمد جہانگیر کی اس پہلی شادی کے پہلے ہی سال ۹۹۴ہجری میں شاہزادی سلطان النسا پیدا ہوئی جو سلطان بیگم بھی کہلاتی ہے[2]۔ یہ تاریخ انگریزی حساب سے ۲۶ اپریل ۱۵۸۶ء کے مطابق ہوتی ہے۔ دوسرے برس ۲۴ امرداد کو (بماہ رمضان ۹۹۵ھ ہجری۔ اگست ۱۵۸۷ء) بڑے بیٹے کی[3] (لاہور میں) ولادت ہوئی۔ دادا جان (اکبر/عرش آشیاں) نے سلطان خسرو نام رکھا۔ یہ بڑے لڑکے کا بڑا بیٹا تھا، اپنا پہلا پوتا۔ بڑے جشن منائے۔ خوب خوشیاں کیں[4]۔ فرشتہ کہتا ہے[5]۔

دریں سال ۹۹۶ھ ہجری ولادت سلطان خسرو ولد شاہزادۂ عالمیان شاہزادہ محمد سلیم از دختر راجہ بھگوانداس روے نمود عرش آشیانی از طلوع اولین کوکب نبیرہ خوشحال شدہ در آرایش جشن باقصے الغایۃ کوشید۔

ملا نظام الدین احمد ہروی طبقات اکبری میں لکھتے ہیں:۔

دریں سالِ فرخندہ فال (۳۲ الٰہی۔ ۹۹۴ھ) ولادتِ سلطان خسرو ولد شاہزادۂ جواں بخت سلطان سلیم از مہد عصمت دختر راجہ بھگوانداس روی نمودہ و از آرایشِ جشن طوے ولادت ایں شاہزادہ کہ

---

[1] سیاحت، مراصفحات ۹۰ و نوٹ ۱ و ۲، جلد اول صفحہ ۵۲ [2] دیباچہ تزک جہانگیری صفحہ ۲ ۔ شاہزادی سلطان برس بعد ہی تھی۔ [3] دیباچہ تزک، صفحہ ۲۔ منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۲۴۵۔ سال ولادت ۹۹۶ھ الفاظ و ہندسہ دونوں میں لکھا ہے۔ ظاہراً طباعت کی غلطی نہیں ہوسکتی۔ مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۳۰ ۔ اور مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۳ اور قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۲۳ میں ۹۹۵ھ تحریر ہے [4] سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۱۸۷ میں لکھا ہے کہ۔ جب بھگونت داس کی لڑکی سے سلطان سلیم کے بیٹا پیدا ہوا، خسرو نام رکھا گیا تھا۔ رشحات الفنون، جزو دوم میں بھی یہی مرقوم ہے۔ (ورق ۲۲۰ قلمی)۔ [5] ترکوں میں دستور تھا کہ ایسے موقعوں پر ضیافت عام کرتے تھے۔ دولت مند لوگ اپنے نوکروں اور ملازمین خدمت کو جوڑے دیتے تھے بلکہ جو پہلے آکر خوش خبری دیتا تو جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ اس کو اتار کر دے دیتے تھے۔ (قصص ہند، حصہ دوم، صفحہ ۸۲)۔ [6] تاریخ فرشتہ، جلد اول، صفحہ ۲۶۰۔

کہ طلوعِ اولین کوکبِ سعادت روزِ میمنت فرجام بہ بانیانِ مسندِ عیش و کامرانی درود داد[۵۱]

اس مبارک موقع پر شاہزادہ سلیم نے اس پری پیکر گوشۂ جگر کا خطاب دیا تھا۔ شاہ بیگم بڑی عقیل، دانشمند، زیرک و دور اندیش، وفا کیش اور غیور تھی۔ اس کو اپنے شوہر سے الفت نہیں عشق تھا۔ شوہر کی محبت بھی جنونِ محبت تک پہنچی ہوئی تھی۔ جس کو دوسری بی بی "جودھ بائی" دختر راجہ اودے سنگھ[۵۲] بھی کم نہ کر سکی۔ اور اس کے حسن و جمال، ناز و نیاز، کرشمہ و انداز کے تمام حربے بیکار ثابت ہوئے ع۔

میں بھی دیکھوں تو پلٹتی ہیں نگاہیں کیوں کر !

حالانکہ دونوں کے سوانح، لطیفے اور بذلہ سنجیاں دیکھ کر خشک مزاج و خشک دماغ "مقبول" کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ جودھ بائی[۵۳] (جگت گوسائیں) وہ خوش سلیقہ و خوش مزاج ملکہ، وہ نگار آتشیں، وہ محشر در آستیں تھی،[۵۴] جس کی چٹکلوں اور حاضر جوابی نے نقشہ ادا ناوک افگن نورجہاں بیگم کی جودتِ فہم و رسائیٔ طبع[۵۵] بلکہ تابشِ حسن کو بھی ماند کر دیا تھا۔ جہانگیر کی ایک تیسری بیگم "صاحب جمال"[۵۶] اسم بامسمیٰ تھی،[۵۷] بڑے نامور اور کارگزار باپ کی بیٹی۔ اکبر نے سلیم کی شادی اس سے کر دی تھی۔ یا جیسا کہ دربارِ اکبری[۵۸] میں تحریر ہے "مینا بازار

---

[۵۱] صفحہ ۱۰۰۔ [۵۲] منتخب اللباب حصہ اول صفحہ ۲۲۵۔ تاریخ ایلیٹ صاحب جلد ششم صفحہ ۲۹۸۔ و مجلس جہانگیری کی ذکر ہا' صفحہ ۱۵۲۔ و قاموس المشاہیر صفحہ ۲۷۴۔ و ترجمۂ تزک جہانگیری از بیورج' صفحہ ۲۰۔ [۵۳] منشی سید احمد لکھتے ہیں کہ جگت گوسائیں جو عام طور سے جودھ بائی کے نام سے مشہور ہیں نہایت دانش مند، نیک طینت، خوش بیان، شیریں کلام، حاضر جواب اور باسلیقہ بیگم تھیں۔ ان کی حاضر جوابی کے کثیر لطیفے مشہور ہیں۔ (مرأت ہنود صفحہ ۴۹) بکرم جیت لعل فرماتے ہیں کہ وہ بڑے مضبوط ارادے اور دل و دماغ کی شاہزادی تھی۔ (اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج صفحہ ۹۰۔ قصص ہند حصہ دوم صفحات ۱۰۱ تا ۱۰۲) سیر المتاخرین میں بھی ایسا ہی مرقوم ہے۔ صفحہ ۲۰۵۔ [۵۴] اس قبیل کے چند چٹکلے ذیل میں ایک معمولی سی بات مگر دلچسپ مثال کے طور پر انہی کے الفاظ میں اُسی کے لفظوں میں نقل کر دینا کافی ہے۔ نورجہاں نے جہانگیر سے کہا کہ آپ کے منہ سے بڑی بو آتی ہے۔ بادشاہ نے یہ بات بی بی سے کہی (جودھ بائی سے) کہ تم بھلا منہ کی بو بھی نہیں بتاتیں۔ وہ بولیں جانتی ہے جو جا بجا لیا کرے، ایک مرد کا جو منہ سونگھے کہ دوسرے کی کب تمیز ہو سکتی ہے۔ (صفحہ ۳۳۔ مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس۔ [۵۵] شمس العلماء آزاد دہلوی قصص ہند میں لکھتے ہیں کہ محل میں راجہ مان سنگھ کی بہن، اعمادہ بیگم جودھ پور کی بیٹی وغیرہ رانیاں اور مہارانیاں تھیں مگر نورجہاں نے سب کے چراغ گل کر دئیے تھے۔ (صفحہ ۱۱۱) یہ صحیح نہیں ہے۔ مان سنگھ کی بہن تو بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ [۵۶] صفحہ ۱۵۵۔

کی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی پر آیا اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ اسکی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے خود شادی کر دی۔[1] بہرکیف شوہر کی بڑی محبوب، رفیق اور چہیتی بی بی تھی۔ لیکن سیرت نگاروں سے پوچھیے۔ شاہ بیگم کے سامنے صاحبِ جمال کی کیا حقیقت تھی؟

برقِ جمال، مرحبا، پیکرِ ناز، آفریں!

{ عذر۔ پردگیانِ عصمت و عفاف کے بارے میں میں خیال کی ادنیٰ سی جولانی یا قلم کی شوخی روا نہیں رکھتا لیکن یہ اظہارِ حقیقتِ حال تھا جو قلم سے بے اختیار نکل گیا۔ تہذیبِ جدید کی ضیاپاشی یا دورِ حاضر کے اثر پر محمول نہ کیا جائے۔ ابھی آپ سنیں گے کہ خود جہانگیر شاہ بیگم سے (مومن کی زبان میں) کیا کہہ رہا ہے۔

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں　　　وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا }

---

[1] مقبول: "یہ واقعہ ہے یا فسونِ جنون — دو جملوں میں پورا فسانہ!"
"آزاد! تمہاری تلاشِ مضمون آفرینی اور فنکاری آج بھی روح کو تڑپا دیتی، دل کو گرما دیتی ہے۔"
"تاریخ والو! تم ہی بتاؤ کہاں ہو؟"
"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی"
ہم نے نہ آوازۂ عشق و عاشقی سنا۔ نہ کسی تعلق و تعشق کی خبر ہے۔"
خافی خاں۔ ہم بھی کسی صاحبِ جمال کے اس تیر نگہ جمال سے آگاہ نہیں۔ ہم تو کہہ چکے "و ہم دریں سال خجستہ مآل ۹۹۰ دخترِ خواجہ حسین ولدِ زین خاں برائے آں شاہزادہ عالی نژاد خواستند" (صفحہ ۲۲۴)۔
جہانگیر میں خود اسی قدر کہہ سکتا ہوں "پرویز از صبیۂ صاحب جمال زین خاں کوکہ کہ نسب ہم سنگ مرا عزیز کوکہ بود (صفحہ ۲ تزک)
البتہ سرکاری مورخ شیخ ابوالفضل کی تحریر سے اس کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے۔ بے شبہ اس کی تمام تحریروں میں) شاہزادہ کے ساتھ شیخ کی مخالفت کی بو اس کی ہر جنبشِ قلم سے آجاتی ہے لیکن جہاں تک کہ اس واقعہ کا تعلق ہے مجھے نقل کر دینا ناگزیر ہے۔
"سنہ جلوس بستم درمیان بزرگ شاہزادہ را شگرف دلبستگی بدخت زین خاں کوکہ شد و بیگانگی نگاشت از ہر گرفت گیتی خدیو دل بے وحشی دل گراں شد و چون فرط سستگی از اندازہ بیروں دید ناگزیر دستوری داد۔ والا جشنِ پیرایش زیب و نشاط زینت برساد۔

والاں بدکہ ریاست کردند　　　زمین ز چرخ انجم نثارے کردند
زہرہ پردہ بر درگاہ بستند　　　حق را تازہ نو راز ماہ بستند

در آں قیاس مریم مکانی فرح پیوند خرمی افزود و آں بہ ساعت خوش مرا شبستان سپردند" شادی کی تقریب گیارہ رات میں ہوئی۔

شاہ بیگم کا اندوہناک انجام، یا اس تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ طلب ہے۔ وہ شاہزادہ (خسرو) جس کے ساتھ ساری چغتائی قوم کی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، جس کی آمد نشوونما اور ترقی سے تیموری خاندان کو مسرت تھی، جو ماں (شاہ بیگم) کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھا، باپ سے بگڑ جاتا اور تھوڑی سی سمجھ پا کر سرکشی اختیار کرتا ہے۔ دعوائے سلطنت اور اکبر کی جانشینی کے خیالِ خام میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ درگزر کرنے والے شفیق باپ پر جو کچھ گزری اُسی کا دل جانتا ہے۔ یہاں اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ماں عزیز بیٹے کی شوخیوں اور سیاسی غلط کاریوں سے تنگ آگئی تھی۔ خسرو کو بغاوت و سرکشی سے روکتی اور حتی الوسع باز رکھنا چاہتی تھی، مگر برگشتہ نصیب خسرو کب ماننے والا تھا۔ وہ جہانگیر کی بجائے تخت و تاج کا وارث اور حقیقۃً اہل اپنے ہی کو سمجھتا تھا۔ ماں کی کوفت اور سوزشِ دل بڑھتی رہی۔ اُس نے عاجز آکر افیون کھالی اور جان دیدی۔[1]

جہانگیر لکھتا ہے[2]:-

والدۂ او ہم در ایامِ شاہزادگی از ناخوشی اطوار او و ضع او و سلوک برادر خوردش مادھو سنگھ تریاک خوردہ خود را گشت۔ از خوبی ہائے و نیک ذاتی او چہ نویسم۔ عقلے بہ کمال داشت۔ و اخلاص او بہ من در درجہ بود کہ ہزار پسر و برادر را قربانِ یک موئے من می کرد۔ مکرر بہ خسرو مقدمات نوشت و او را دلالت بہ اخلاص و محبت من می کرد۔ چوں دید کہ ہیچ فائدہ نہ دارد و عاقبت نامعلوم است کہ بکجا منجر خواہد شد از غیرتے کہ لازمۂ طبیعت راجپوتانی است خاطر بر مرگ خود قرار دادہ۔ و چندیں مرتبہ گاہ گاہے مزاج او در شورش می آمد۔ چنانچہ ایں حدیث میراثی بود کہ پدران و برادران او ہمہ یکبار دیوانگی خود را ظاہر می کردند و بعد زمانے علاج پذیر می شدند۔ در ایامے کہ من بشکار متوجہ گشتہ بودم، روز بست و ششم ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ افیون بسیار در عین شورش دماغ خوردہ در اندک زمانے درگذشت گویا کہ ایں احوالِ پسر بیدولت خود را پیشتر می دید۔ اول کدخدائی

---

[1] بیل، اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری، صفحات ۳۴۴، ۱۵۲ - دام اے بنود، صفحہ ۸۳ - ڈکن صاحب صفحہ ۲۶ -

[2] تزکِ جہانگیری صفحہ ۲۶ - و دیباچہ تزک، صفحہ ۱۲ -

کہ در آغاز جوانی و نوروسی مرا دست داد، نسبت او بود۔ بعد از تولد خسرو اُو را شاہ بیگم خطاب دادہ بودم۔ چون بدسلوکی ہائے فرزند و برادر را نسبت بہ من نتوانست دید، از سر جان در وقت دماغ پریشان شدن درگذشتہ خود را ازیں کلفت و اندوہ باز رہانید۔

"میری شہزادگی کے زمانے میں خسرو کی ماں بھی خسرو کے ناپسندیدہ اطوار و وضع اور اپنے چھوٹے بھائی مادھو سنگھ کے برتاؤ کے سبب سے افیون کھا کر مر گئی تھی۔ اُس کی خوبیاں اور نیکیاں کیا لکھوں۔ انتہا کی عقلمند تھی میرے ساتھ اُس کا خلوص اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ میرے ایک ایک رونگٹے پر ہزاروں بیٹے اور بھائی قربان کر دیتی۔ اُس نے خسرو کو بار بار سمجھایا اور محبت و اخلاص کی راہ دکھاتی رہی۔ جب دیکھا کہ کچھ فائدہ نہیں نکلتا۔ انجام معلوم نہیں کہاں تک پہنچے۔ تو غیرت کے باعث، جو راجپوتوں کی طبیعت کا خاصہ ہے، اپنی جان کھو دینے کی ٹھان لی۔ کبھی کبھی پہلے بھی اُس کے مزاج میں کئی مرتبہ شورش نمودار ہو چکی تھی۔ یہ تو موروثی بات تھی۔ اُس کے باپ دادا اور بھائی سب نے ایک نہ ایک بار پاگل پن ظاہر کیا تھا اور مدت کے بعد ٹھیک ہوا تھا۔ جن دنوں میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا ۲۶ ذی الحجہ ۱۰۱۳ھ[۱] کو عین شورش دماغ میں اُس نے بہت سی افیون کھا لی اور تھوڑی دیر میں چل بسی۔ گویا کہ وہ اپنے نالائق بیٹے کی حالت پہلے ہی سے دیکھ رہی تھی۔ میری پہلی شادی جو شروع جوانی یا لڑکپن میں مجھے نصیب ہوئی، اُسی کے ساتھ ہوئی تھی۔

[یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے   دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے]

خسرو کے پیدا ہونے پر میں نے اُس کو "شاہ بیگم" خطاب دیا تھا۔ جب وہ اپنے بیٹے اور بھائی کی بدسلوکی میرے ساتھ دیکھ نہ سکی تو دماغ کی پریشانی کی حالت میں اپنی جان کھو دی اور اپنے کو اس رنج و تکلیف سے چھڑا لیا۔" اور مجھے وہ سزا دی جو محبت کے گنہگار کی تھی۔

---

[۱] ۶ مئی ۱۶۰۵ء۔ لیکن اگر سال ۱۰۱۳ ہجری ہے تو ۶ مئی ۱۶۰۴ء ہو گا۔ ڈاکٹر بینی پرشاد تاریخ جہانگیر (صفحات ۴۱۳، ۴۲۳) میں ۱۶ مئی ۱۶۰۵ء لکھتے ہیں۔

مادھو سنگھ اور اُس کے خاندان والوں کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ اس سچی وفاشعار و غمگسار بیوی کی جدائی کا جو ماتم جہانگیر کے سادہ نگار قلم نے کیا ہے[۱] اُس کو نقل کر دیا کافی سمجھتا ہوں کہ اس دردِ دل کے ظاہر کرنے کی قوت اور کون سا انشا پرداز رکھتا ہے۔

افسانہ حُسن کا ہے اور عشق کی زباں ہے

از فوت او بنابر تعلقے کہ داشتم ایامے برمن گزشت کہ از حیات و زندگانی خود ہیچ گونہ لذتے نداشتم۔ چہار شبانہ روز کہ سی و دو پہر باشد از غایتِ کلفت و اندوہ چیزے از ماکول و مشروب وارد طبیعت نہ گشت چوں ایں قصہ بہ والد بزرگوارم رسید۔ دلاسا نامہ در غایت شفقت و مرحمت بدیں مُرید فدوی صادر گشت و خلعت و دستار مبارک کہ از سر برداشتہ بودند ہماں طور بستہ بہ جہت من فرستادند۔ ایں عنایت آبے بر آتش سوز و گداز من زدہ اضطراب و اضطرار مرا فی الجملہ قرارے و آرامے بخشید۔

"اُس کے مرجانے پر میرے دل کے لگاؤ کی وجہ سے مجھ پر زمانہ گزر گیا۔ زندگی و حیات کی کسی قسم کی کوئی لذت میرے لئے باقی نہ تھی۔ چار رات دن جس کے بتیس پہر ہوتے ہیں، انتہا درجہ کا رنج اور تکلیف رہی۔ کھانے پینے کی کوئی چیز مُنہ تک نہ گئی۔ میرے بزرگ باپ نے جب یہ قصہ سُنا تو بڑی شفقت و مہربانی کے ساتھ اس فدوی ارادتمند کو دلاسے کا خط لکھ، خلعت اور بندی بندھی ہوئی پگڑی سر سے جس طرح اُتاری تھی اُسی طرح بندھی ہوئی میرے لئے بھیجی۔ میرے سوز و گداز کی آگ پر اس مہربانی سے پانی پڑ گیا۔ اور اضطراب و بےچینی میں کم یا زیادہ قرار و آرام پہونچا۔"

یہ خون کے آنسو جہانگیر کا قلم نہیں، آنکھ نہیں، دل بہا رہا ہے۔ ایک ایسی عورت کے غم میں جس کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ دماغ کے پیچ و تاب نے اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ گلچین جمال، ہوس پیشہ جہانگیر بھی وہی ہے، جس کی بیس بیگموں کی فہرست مسٹر بلاک مین نے آئینِ اکبری کے ترجمہ میں پیش کی ہے[۲] کپتان ولیم ہاکنس جس کی تین سو بیویاں بتاتے ہیں، اور اُن میں سے اصلی

---

[۱] تزکِ جہانگیری، صفحہ ۲۶۔

[۲] صفحہ ۶۱۹۔

ملک چار[1] پادری ٹیری (Edward Terry) شہنشاہ کی "عورتوں" کا شمار ایک ہزار لکھتے ہیں[2]۔ جو شاہ بیگم کی دائمی جدائی کے بعد بھی بہت سی بی بیوں کا خاوند ہے۔ جس کی نسبت کین صاحب کا قلم شوخی سے کام لے کر لکھتا ہے کہ "خود جہانگیر کو بھی ہمیشہ یہ خبر نہ رہتی تھی کہ اُس کے کون سے بیٹے کی ماں کون ہے"[3]۔ جس کو فرنگستان کے اہلِ قلم[4] مست الست بتاتے ہیں اور رند ہزار شیوہ جس کو طاعت حق

---

[1] سفرہائے بحری، صفحہ ۱۴۲۔

[2] پادری صاحب سر طامس رو سفیر انگلستان کے چیپلین تھے اور انھیں کے ساتھ ۱۶۱۵ء میں ہندوستان آئے تھے جہانگیر کا دربار اور بادشاہانہ شوکت و احتشام دیکھا تھا۔ اپنی کتاب "مشرقی ہندوستان کے بحری سفر" (A voyage to East India) میں یہاں کے بہت سے حالات لکھے ہیں۔ بعض باتوں کو اپنے ملک کی باتوں سے اور شہروں کو انگلستان کے دار السلطنت سے زیادہ آباد و بارونق بتایا ہے۔ ۱۶۱۸ء میں واپس گئے۔

[3] مشرقی ہند کا سفر بحری، صفحات ۴۰۵ و ۴۰۶۔

[4] شائقینِ علم فراموشکاران سرسری کتاب بینی کی علت و کثرت زیادہ یاد رکھنے کی اجازت نہیں دیتی یا اُدھمان نظر دری کے عمل عزیز سے دست اور اپنے خواہ مخواہ دور پڑ جاتے اور انھیں کے ملک و قوم کی تاریخیں اور روایتیں ان کے شرف مطالعہ و حوالت محروم رہ جاتی ہیں۔ بہرصورت ان کے وقوف و آگاہی کے لئے دو اقتباس پیش کر دینا ضروری ہیں۔

(۱) سر یجمود دولارمین نے ولایت کے مشہور رسالہ جرنل آف انڈین ہسٹری بابت ماہ اگست ۱۹۲۳ء میں ایک عالمانہ مقالہ "ڈاکٹر برنیئر شاہجہان کے دربار میں" شائع فرمایا تھا۔ اس کے ضمن میں سلاطین یورپ کے درباروں کی اخلاقی حالت کا دربار مغلیہ سے موازنہ کیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"میں امید کرتا ہوں کہ میں عام رائے کے خلاف کسی غلطیات کی مدافعت کرنے کا مجرم نہ خیال کیا جاؤں گا" گر میں یہ کہوں کہ سترھویں صدی میں "مغل اعظم" کا دربار جو عیش پرستی و شاہد بازی کے نہ صرف ظاہراً مہذب اور شائستہ نظر آتا تھا، بلکہ باطناً بھی وہ فرانس اور انگلینڈ کے درباروں کی بہ نسبت زیادہ با اخلاق تھا۔

"عہد مغلیہ کی تاریخ میں اُس مسرت انگیز اشتیاق کا وجود نہیں پاتا جو انگلینڈ اور فرانس کے اُمراء اپنی بیٹیوں کی عصمت کو بادشاہ کی ہوسناکیوں پر قربان کر دینے کے لئے پیدا ہوا کرتا تھا۔ عین اُس عمر میں جب کہ ہمارے خیال کے مطابق ابھی ان کو اسکول میں زیر تعلیم ہونا چاہئے تھا نوجوان لڑکیاں دربل یا وہائٹ ہال بھیج دی جاتی تھیں

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

میں سجدہ کے لئے سر جھکانا بھی گراں تھا آج اپنی صنم پرستی کی بدولت گم صُم ہو رہا ہے اور نیم دیوانہ اللہ دری محبت کی قربانیاں :

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تاکہ وہ شاہی نوازشات سے سرفراز ہو کر متمول بن جائیں۔ بقول سینٹ سائمن ہر والدین کی دلی تمنا یہی ہوتی تھی کہ اُن کی لڑکی سب سے بڑا انعام حاصل کرے۔ دربار شاہ کی معشوقہ بن جائے۔ اس معاملہ میں انگلینڈ کا اخلاقی معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔

"جب آرا بیلا چرچل، جیمس (ڈیوک آف یارک) کی منظورِ نظر بن گئی تو بقول لارڈ میکالے، اُس کے والدین اس عجب خیز احساس مسرت میں پڑ گئے کہ سیدھی سادھی لڑکی کس طرح اس شاہی معیار انتخاب پر پوری اُتری! اہل یورپ کی نظروں میں ایک شادی شدہ عورت سے بادشاہ کا عشق کچھ بھی قابل اعتراض و ملامت نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مادام دی مونتیسپون کو لوئی چہاردہم (شاہ فرانس) کے ساتھ بیوی کے عشق کی خبر پہونچی تو اس نے کہا کہ "خدا کا شکر ہے اب تمول ہمارے گھر میں داخل ہونے لگا ہے۔" (مترجمات قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، صفحات ۷۰ و ۷۱ ۔ رسالہ زبان منگروں، ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء) یہ سنے خیر کے تر فقتہ بھجے گئے جو چھپائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سرا کس پر۔

(۲) دوسری حکایت تعدد و تکاثر ازدواج کے متعلق ہے۔ جس پر فاؤ ۔ نبوت و آیات کے انتساب سے مذہبی تقدس و عظمت کا رنگ بھی جلوہ افروز ہے، اس لئے ہمارے ادب و احترام کی مستحق ہے مگر تقلید و اتباع کی نہیں۔

لارڈ آکسفورڈ اپنی کتاب "یادو افکار" "Memories and Reflections" by Lord Oxford and Asquith

میں لکھتے ہیں "بادشاہوں کی پہلی کتاب کو میں نے خوب پڑھا ہے خاص کر حضرت سلیمان کی داستان کی سات سو بی بیاں تھیں اور تین سو آشنائیں (مجھے تو حیرت ہے کہ دونوں میں فرق کیا تھا!) یہ سب کی سب یا زیادہ تر غیر ملک و قوم کی مشرکہ تھیں۔ اس لئے انھوں نے اورشلیم (بیت المقدس) میں ان کے لئے مرتفعات (altars) بنوا دئے تھے۔ تاکہ اپنے وطن کے خداؤں کی پرستش بدستور کرتی رہیں۔ در باوجود اس قدر حد سے زیادہ سوتوں کے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک ہی بیٹا پیدا کیا تھا۔ رحبعام نام جس نے سلطنت کھو دی۔ کیسی تضیع حق!" (اخبار لیڈر، روز شنبہ ۱۴ نومبر ۱۹۳۳ء صفحہ ۱۹)۔

کتاب مقدس کے عہد نامۂ قدیم (ترجمہ عربی، بیروت ۱۸۰۴ مسیحی) میں بھی یہی مذکور ہے۔ بی بیوں کے لئے "سیدات" اور کنیزوں کے لئے "سراری" کا لفظ استعمال ہوا ہے (صفحہ ۵۰۲)۔ لیکن علامہ ابن ہروی رشحات الفنون میں لکھتے ہیں "سلیمان بن داؤد علیہما السلام۔ سی صد زن در عقد نکاح او بود و ہفت صد کنیزک سر تیت داشت" (جزو اول، ورق ۱۱ قلمی)۔

جہانگیر کے ایسے عیش پسند و عشرت کوش کا بار بار شبانہ روز بھوکا پیاسا رہنا، اُس کے انتہائی رنج و قلق، دل کی بے قراری اور بےچینی کی کیفیت کو اُسی کی زبان سے ادا کر گیا ہے۔

ملک رحبعام کے متعلق عرب کا پرانا و مستند مورخ شاہزادہ ابوالفدا اسماعیل بھی شکوہ گزار ہے۔

"جسم پسر سلیمان بدصورت بدنگاہ فاسق و کافر تھا۔ حضرت موسیٰ کی وفات کے پورے چھ سو برس بعد تخت نشین ہوا تھا" (تاریخ۔ جلد اول صفحہ ۲۶)۔

گر یہ دور کی باتیں متصور ہوں، دور پرانی کہانیاں، تو خود ہندوستان کے ایک گوشے میں گوا کی حالت دیکھ لیجئے جو سترھویں صدی (اپریل ۱۶۲۳ء) میں ہو رہی تھی اور جس کو پیٹرو دیلا دیلے Pietro Della Valle نے اپنے سیاحت نامہ میں بڑے درد و گداز کے ساتھ لکھا ہے اور جس کا پورا ایک صفحہ (۱۶۰) پرتگیزوں کی عیاشی کے نذر کر دیا ہے" اور ان پر تو بہت کچھ۔ "گر یہ لوگ خود اس قسم کے معاملات (معاشرت و نمود) میں نہایت بے روک ٹوک ہیں۔ اپنی قریب سی قریب کی رشتہ دار کو نہیں چھوڑتے حتیٰ کہ اپنی بہنوں کو بھی جیسا کہ میں نے سنا ہے۔ رضاعی اور گھر کے پروردہ بچوں کا کیا شمار و قطار" اس بحث پر مسٹر ایڈورڈ گرے نے اضافہ کیا اور ڈی کلون کے اسکیچ آف گوا De Kloguen's Sketch of Goa (صفحہ ۱۷۱) اور فان سیکا Fonseca (صفحہ ۱۹۳) پر توجہ دلاتے ہیں۔ جس نے تحریر کیا ہے "تعیش و بدکاری دسیوں و پنچ طبقوں میں فی الحقیقت رنج روگ یا سلطنت فنا عیب بن گیا ہے۔ اور اُن کے اخلاق و اطوار جو اصلاح و درستی کی امیدوں کے حدود سے گزر چکے ہیں بگڑتے ہوئے و خراب ہو رہے ہیں۔"

لیکن شہنشاہ اکبر بھی اس سانحۂ غم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ دلبند فرزند کی تسلی و دلداری کے لئے خط لکھا۔ سر سے پگڑی اتار کر جیسی بندھی ہوئی تھی ویسی ہی بھیجدی کہ زخمِ دل کے اندمال کے لئے یہی ایک مرہم تھا۔

ایسی سلیقہ مند، وفا سرشت، نیک نہاد بیگم کی خوبیوں و خوبیوں کا اعتراف جو انیس (۱۹) بیس (۲۰) سال کی رفاقت و یکجائی کا نتیجہ تھا، اور شوہر کا بیوی کو اور بیوی کی محبت و خلوص کو اس طرح یاد کرنا[1] صنف نازک کے ہر فرد کے لئے قابلِ فخر اور موجبِ شرف ہے۔ شاہ بیگم کا خیال جہانگیر کے دل سے کبھی محو نہیں ہوا۔ تزک کے اوراق پر وہ بار بار اُس کا ماتم کرتا نظر آتا ہے۔ آخر یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

اُٹھیں گے آذر ہزاروں حُسن کے بتخانے سے
مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون!

تنہا جہانگیر ہی نہیں بلکہ ادر معاصر مورخ بھی اُس کے اخلاقِ حسنہ، خصائلِ حمیدہ، پاکدامنی اور پاکیزہ روشی کو مدِ نظر رکھ کر ادب و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ مرزا ہادی تزک کے دیباچے میں[2] لکھتے ہیں کہ ایک خلفشار کے بعد، جب جہانگیر الٰہ آباد واپس پہنچا تو اکبر نے اُس کے لئے خلعت و انعامات بھیجے۔ ہر طرح کا سامان تسلی و دلداری کیا تب وہ کچھ روز یہاں مطمئن و فارغ البال رہ کر بسر کر سکا تھا۔

قضارا والدۂ سلطان خسرو نقاب آرائے نہاں خانۂ عدم گشت۔ تفصیل ایں اجمال آنکہ در تیولا

---

[1] ڈاکٹر بینی پرشاد (صفحہ ۴۹) تحریر کرتے ہیں کہ یہ الفاظ بیگم کے مرنے کے دو برس بعد جہانگیر کے قلم سے نکلے تھے۔

[2] صفحہ ۱۲۔

بہ پیوستہ در دماغ آں عفت سرشت بہم رسید و سودائے بر مزاج استیلا یافت و چوں خسرو از بیراہ روی در ملازمت حضرت عرش آشیانی ہموارہ بہ شکوۂ شاہنشاہی می پرداخت۔ ایں غم سربار آں گشت۔ در روزے آنحضرت بشکار تشریف بردہ بودند پوشیدہ از پرستاران افیون خوردہ سر بہ بالین فنا نہاد۔ و چوں مسرآمد پردگیان حرم سرائے سلطنت بودہ اُنس و محبت تمام باو داشتند۔ خاطر قدسی مظاہر ازیں سانحہ بہ نہایت ملول و بغایت اندوہ گیں شد و بر دلِ مہر منزل ایں مصیبت سخت گرانی کرد۔ حضرت عرش آشیانی از استماع ایں حادثۂ ناگزیر و آشفتگی ضمیر فیض پذیر فرمان از روے کمال مہربانی و غمگساری فرستادہ تسلی بخش خاطر عاطر شدند۔

"اتفاقاً قضائے الٰہی سے خسرو کی ماں نے دنیا سے پردہ کیا۔ ان دنوں، اُس نیک بی بی کے دماغ میں خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ سودا مزاج پر غالب تھا۔ ادھر خسرو کی بے راہی اور ناہنجاری کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ اکبر کے حضور میں جہانگیر کی شکایتیں کیا کرتا تھا۔ بیگم کو اس کا غم روز بڑھ گیا تھا۔ ایک روز جہانگیر شکار کو گیا ہوا تھا۔ بیگم نے لونڈی باندیوں سے چھپا کر افیون کھائی اور اپنے کو ختم کر دیا۔ حرم سرائے شاہنشاہی کی بی بیوں میں یہ سب سے بلند مرتبہ والی تھی۔ جہانگیر کو اس سے نہایت اُلفت و محبت تھی۔ شاہزادہ کے دل پر اس سانحہ سے بڑا رنج و اندوہ ہوا۔ یہ مصیبت بڑی بھاری تھی۔ اکبر کو اس حادثے اور جہانگیر کے قلق و تاسف کی اطلاع ہوئی تو کمال مہربانی و غم خواری فرمائی۔ فرمان بھیجا اور جہانگیر کی دلداری کی۔ دلاسا دیا۔"[۵۱]

اسی واقعہ کی نسبت منتخب اللباب میں تحریر ہے۔

درہمیں آوان چوں والدہ خسرو کہ ہمشیرۂ[۵۲] راجہ مان سنگھ می شد سودائے مزاج بہم رسانیدہ بود

---

[۵۱] خافی خاں، حصہ اول، صفحہ ۲۲۷۔

[۵۲] یہی صاحب صفحہ ۲۲۸ پر لکھتے ہیں کہ راجہ مان سنگھ کی صبیہ (لڑکی) جہانگیر سے منسوب ہوئی تھی۔ بہن (خواہر یا ہمشیرہ) لکھنا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کہ طابع کی غلطی ہو۔ یا یہ کہ بہن کے مرنے کے بعد بیٹی بیاہ دی ہو۔ ایسا عقد شرعاً و رواجاً جائز ہے۔

ازادہائے خارج واطوار ناہموار خسرو ناخلف کہ سہ سال از شاہزادہ عالی نژاد بلند اقبال محمد خرم کلاں بود
و نظر بر عنایات و توجہات جد بزرگوار و پدر نامدار کہ نسبت بہ خسرو در حق آں عزّۂ جاہ و جلال زیادہ
مبذول می گردید از راہ حسد بہ خود ہموار نمی توانست بود و در خدمتِ پدر گستاخانہ و بے ادبانہ سلوک می نمود
و عند الفرصت بخدمتِ جدِ بزرگوار طریقہ غمازی از طرف شاہنشہ[1] بکار بردہ شعلہ افروزی عنادی نمود
و مادر اُو در منعِ آں می کوشید و فائدہ نمی بخشید۔ علاوہ مرض سود گردیدہ بود۔ دریں آوان روزے خود را
از غصۂ اطوار آں فرزند بدعاقبت از افیون مسموم ساخت۔ در خاستہ رفتنِ عبداللہ خاں و واقعۂ والدۂ
خسرو معاً بعرضِ شاہزادہ نامدار رسید و باعث الم خاطر گردید۔

"اسی زمانے میں خسرو کی ماں کا مزاج سودائی ہوگیا تھا۔ جو راجہ مان سنگھ کی بہن ہوتی تھی۔
نالائق خسرو شاہزادہ خورم سے تین سال بڑا تھا۔ مگر اس کے طور طریق کی کیفیت یہ تھی کہ اکبر جب
خسرو کے مقابلہ میں، شاہزادہ (جہانگیر) پر عنایت و توجہ زیادہ کرتا، تو اس کو بڑا رنج و حسد ہوتا
تھا۔ باپ سے گستاخانہ اور بے ادبانہ برتاؤ کرتا۔ موقع پاتا تو دادا جان کے سامنے جہانگیر کی
شکایتیں کیا کرتا اور دشمنی و عناد پھیلاتا۔ اس کی ماں ہر چند باز رکھنے کی کوشش کرتی، فائدہ نہ
ہوتا۔ اس کے سوا مرض سودا تو ہو ہی گیا تھا۔ انھیں دنوں کمبخت بیٹے کے اطوار سے غصہ ہو کر زہر
(افیون) کھالیا۔ عبداللہ خاں کا اُٹھ کر چلا جانا اور خسرو کی ماں کا واقعہ، شاہزادہ نے ایک ساتھ سنا
تو بڑا رنج ہوا۔"

جیسا کہ جہانگیر کہتا ہے یہ سودا اور آشفتہ سری بیگم کا خاندانی مرض تھا۔ خود اُس کے نامور اور
بہادر باپ امیر الامرا راجہ بھگوان داس میں، جب وہ صوبہ داری کابل پر ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں متعین
و سرفراز ہوا، تو دیوانگی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ راجہ جدھر

---

[1] شاہزادہ سلیم سے مراد ہے۔ ولی عہد مقرر کرنے کے بعد اکبر نے "جہانگیر" کا لقب دیا تھا۔ منتخب اللباب،
حصہ اول، صفحہ ۲۳۰۔ دربار اکبری، صفحہ ۹۳۔

کھینچ کر پیٹ مار لیا۔ زندگی باقی تھی۔ بادشاہی طبیبوں کے علاج و پرداخت سے کچھ دن بعد بمشکل شفایاب ہوا۔[1]

جب تک دردو غم کی دنیا میں بنا ہے   افسانہ رہے گا مری شوریدہ سری کا

ہیں۔ افیون کھا لینے" یعنی اس طرح خودکشی کا خراب، ورنا پاک عمل ہمارے ملک میں کم ہو چلا ہے، مگر اب بھی باقی ہے۔ بعض وقت طبقۂ ادنیٰ کی کوتاہ اندیش، نادان عورتیں جب کسی صدمہ یا رنج کو برداشت نہیں کر سکتیں تو افیون کھا کر جان دے دیتی ہیں۔ اسی کو آسان سمجھتی ہیں۔ قدیم زمانے میں اس کا رواج اونچے اونچے طبقوں میں بھی تھا۔ تین چار سو برس پیشتر کی متعدد مثالیں عہد جہانگیری کی تاریخوں میں ملتی ہیں۔ سال سوم جلوس یعنی ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) کے واقعات میں لکھا ہے[2] کہ جلال الدین مسعود پسر میر گیسو دراز نے جب انتقال کیا تو اُس کی ماں نے کمال دلبستگی و تعلق سے اُس کی حالت احتضار میں اُسی کے ہاتھ سے افیون کھالی اور بیٹے کے مرنے کے ایک دو گھڑی بعد خود بھی اس جہاں سے چل بسی۔ قریب ہی زمانہ میں[3] لعل خاں[4] شاہی کلاونت[5] بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اکبر اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ لعل نے بچپن سے اُس کے زیر نظر تربیت پائی تھی۔ ملازم خدمت خاص تھا۔ فن موسیقی خصوصاً ہندی گانے میں نظیر نہیں رکھتا تھا۔ وہ پینسٹھ بلکہ ستر برس کے سن میں فوت ہوا۔ کلاونت کی ایک کنیز تھی، اس کی دلفریب

---

[1] مآثر الامرا جلد دوم صفحہ ۱۰۳ و [illegible] صفحہ ۸۵۔

[2] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۳۳۔ توزک جہانگیری صفحہ ۶۷۔ ترجمہ راجرس صفحہ ۱۴۲۔ و ترجمہ مآثر الامرا بیوریج صاحب صفحہ ۵۷۶۔

[3] اقبال نامہ جہانگیری صفحہ ۳۳۔ توزک جہانگیری صفحہ ۷۱۔

[4] ہندوستان کا مشہور گویا اور فن موسیقی کا ماہر کامل تھا۔ جہانگیر کے جلوس کے چوتھے سال ۱۰۱۸ھ (۱۶۰۹ء) میں راہی عالم بقا ہوا۔ (بیل۔ بایوگرافیکل ڈکشنری صفحہ ۵۹۔)

[5] کلاونت۔ ہندی لفظ ہے۔ مطرب و گانے والوں کو کہتے ہیں۔

صورت کا وہ عاشق، اور فسوں ساز چشم کا مسحور تھا۔ معمولاً اُسی کے ہاتھ سے افیون کھاتا تھا۔ لعل خاں کے مرتے پر اس نے بھی افیون کھائی۔ اور عدم کی راہ میں بیگ کی رفاقت اختیار کی۔ جہانگیر[1] لکھتا ہے کہ مسلمانوں میں کسی عورت نے اس درجہ وفاداری کا حق کم ادا کیا ہوگا۔ سچ کہ فخرِ عاشقی و نازشِ وفا تھی وہ۔

میر جلال کے سلسلے میں بختی معتمد خاں (مولفِ اقبال نامۂ جہانگیری) کا بیان ہے کہ ہندوستان کی یہ رسم تو بہت پرانی ہو چکی کہ شوہر کے مرجانے پر ہندوؤں کی عورتیں خود کو آگ میں زندہ جلا دیتی اور اپنی جانِ عزیز اپنی محبت و وفا کیشی پر فدا کر دیتی ہیں۔ بارہا ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دس بیس عورتیں خواہ بی بی رہی ہوں خواہ باندی، آگ میں خود گھس گئی ہیں اور پورے استقلال کے ساتھ اپنے کو جلا دیا۔ مگر بیٹے کی جدائی میں ماں کی یہ کیفیت اس سے پہلے نہیں سنی گئی۔ جہانگیر بھی تزک میں لکھتا ہے[2] کہ ماؤں سے خواہ مسلمان ہوں خواہ ہندو، ایسا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔

شاہ بیگم کے مرنے کے بارے میں یہ تو وہ مسلمہ اور متفقہ بیان تھا جو بلا اختلافِ الفاظ تمام ہندو اور مسلمان مورخوں اور اُن کے ریزہ چین انگریزوں نے کیا ہے[3]۔ مگر با ایں ہمہ ایک اور روایت بھی ہے جو بداہتہً لغو اور ناقابلِ التفات یا کسی افسانہ کی ٹوٹی ہوئی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک ذمہ دار و نامور اہلِ قلم کے قلم سے نکلی ہے، اس لئے یہاں اس کا نقل کرنا ناگزیر ہے۔ سر ولیم سلیمن اپنی دلچسپ کتاب "سیاحت و تذکار" میں ایک موقع پر لکھتے ہیں[4]

"جہانگیر کے بڑے بیٹے خسرو کی آنکھیں باپ کے حکم سے نکلوا لی گئی تھیں، کیونکہ وہ بغاوت پر بغاوت کیا کرتا تھا۔ بغاوت کی ترغیب دینے والے دو سبب تھے ایک خود اُس کی خواہش کہ ماں کے قتل کا انتقام لوں۔ دوسرے اُس زمانہ کے بھائی ہندو شاہزادہ مان سنگھ اور خسرو کے خسر خان اعظم، اکبر کے وزیر اعظم کی یہ آرزو کہ اپنے عزیز کو تخت پر دیکھیں۔ نورجہان نے

---

[1] تزک جہانگیری۔ صفحہ ۱، [2] ایضاً صفحہ ۱۰۔

[3] بیلس بیاگرفی کل ڈکشنری صفحہ ۲۴۴۔

[4] سیاحت نامہ و تذکرہ، صفحہ ۲۰۴ جلد اول۔

خسرو کی ماں یعنی راجہ مان سنگھ کی بہن کو بلایا تھا کہ ہمارے یہاں آکر ایک کنوئیں میں جو ہماری محل سرا کے صحن میں ہے، چاندنی رات میں میرے ساتھ جھانکو۔ جب وہ جھانکنے لگی تو اُس کو کنوئیں کے اندر ڈھکیل دیا۔ نورجہاں نے جب دیکھا کہ اس نے ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیے ہیں تو شور و غل کیا۔ اور بات بنائی کہ رانی اتفاقیہ گر پڑی ہے۔"

ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ سا ژرف بین و محتاط تاریخ نویس اس پر حاشیہ لکھ کر اپنا خیال ظاہر کرتا ہے:۔

"ممکن ہے کہ یہ حکایت صحیح ہو۔ مگر اس قسم کا الزام قطعاً ناممکن الاثبات ہے اور محلات کی فضا میں نشوونما پاجانے والا[۱]۔"

ایلیٹ اور ڈوسن صاحبان نے تکمیل اکبرنامہ کے حوالہ سے اس خودکشی کا باعث بیگم اور اُس کی ایک سوت کے جھگڑے کو لکھا ہے[۲]۔ ڈاکٹر بینی پرشاد اس کو بے بنیاد سمجھتے ہیں[۳]۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے رد و قبول میں بعض یورپین مورخ ایک روش خاص، یا اُن کی اصطلاح میں ایک "اصول" رکھتے ہیں۔ اُن کا دستور ہے کہ مسلمان بادشاہوں اور بیگموں کی نسبت کیسی ہی بے بنیاد و بیہودہ بات بتائی یا سنائی جائے تو اُس کو باور یا بیان کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ یہ آپ ہی کی طبعزاد ہو۔ مخالف و موافق تمام روایتوں کے مطابق جہانگیر کے زمانہ شاہزادگی میں والدہ خسرو نے آخر ۱۰۱۳ھ یعنی مئی ۱۶۰۴ء میں افیون کھا کر جان دی تھی۔ سر ٹامس ہربرٹ بیل اور بدک مین صاحبان اس بارے میں متفق اللسان ہیں کہ شمسی حساب سے نورجہاں چونتیس (۳۴) سال کی تھی جب ۱۶۱۱ء (۱۰۲۰ھ) میں شبستان شاہی یعنی جہانگیر کے عقد میں آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اُس کے بعد مہرالنساء کو

---

[۱] نوٹ زیر صفحہ ۲۰۲ مذکور۔

[۲] جلد ششم صفحہ ۱۱۲۔

[۳] تاریخ جہانگیر صفحہ ۱۶۴۔

نور محل[1] اور نور محل سے نور جہاں بننے میں بھی کچھ زمانہ لگا ہوگا۔ وہ ۱۶۱۱ء میں شیر افگن کی بی بی تھی بنگالہ میں رہی ہوگی۔ تو نور جہاں اور شاہ بیگم کی یکجائی اور جوشِ رقابت و عناد کو کون ہوشمند باور کرے گا!!!

جو تمہاری طرح تم سے کوئی جھوٹ بات کہتا
تمہیں منصفی سے کہدو تمہیں اعتبار ہوتا

بعض صاحبوں نے سال وفات ۱۰۱۱ھ لکھا ہے[2]۔ اس زمانہ کی تاریخوں اور اصلی تحریرات و اسناد کے دیکھنے سے یہ غلطی کھل جاتی اور قلم کی لغزش صاف نظر آتی ہے۔

اسی طرح مسٹر نیوبی کا یہ خیال کہ خسرو کے معاملات میں اس کی ماں مدد و معاون تھی[3]، سرتاسر خلاف قرائن و خلاف واقع ہے۔ خود جہانگیر کی تحریرات اور تمام معاصر مورخین کے تذکروں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ موصوف نے ایلیٹ صاحب کی تاریخ سے[4] دھوکا کھایا ہو۔

ان حضرات کی تلاش اور ذوقِ تحقیق قابل داد ہے۔ لیکن بعض کی بے پروائی اور احتیاط کی کیفیت بھی لائق اعتناء ہے۔ مسٹر ہیو مرے Hugh Murray اپنی تاریخ ہند برطانوی History of British India میں تحریر فرماتے ہیں کہ "نور جہاں آگرہ کے ایک روضہ میں جو تاج محل کہلاتا ہے دفن ہے[5]"۔ ایک اور صاحب جب "شورش ہندوستان کی تاریخ" لکھنے بیٹھتے ہیں تو رقم طراز ہوتے ہیں کہ شاہ جہاں اور اس کی محبوب بی بی نور جہاں کا یہی روضہ تھا[6]۔

شاہ بیگم کی نسبت مسٹر گلیڈون اپنی تاریخ جہانگیر[7] میں لکھتے ہیں کہ "یہ شاہزادی (مان بائی) بہت ملنسار بھی علاوہ اس کے حد سے زیادہ حسین، بڑی اچھی سمجھ والی، نہایت دلکش، ملائم طبیعت والی تھی۔ اطوار دلآویز و شیریں تھے[8]"۔

---

[1] نور جہاں کا عروج، دیباچہ تزک صفحہ ۲۰۔ سیاحت نامہ سلیمن صاحب جلد اول صفحہ ۱۰۴۔ ترجمہ تزک صفحہ ۱۹۲، نوٹ جلد اول۔ نور جہاں جہانگیر کے مرنے کے بعد اٹھارہ سال زندہ رہی۔ بہتر برس کی عمر میں ۱۰۵۵ھ یا ۱۶۴۵ء میں دنیا سے رخصت ہوئی۔

[2] مآثر [illegible] جلد اول صفحات ۵۵، ۵۶۔ خافی خاں، منتخب اللباب حصہ اول، صفحہ ۲۲۷۔

[3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد، سلسلہ جدید، صفحہ ۱۷۹، جلد ۲۳۔ و سابق صفحہ ۱۲۸، جلد ہشتم۔

[4] جلد ششم، صفحہ ۲۶۰۔ [5] صفحہ ۲۳۰۔ [6] صفحہ ۱۰۹۔ [8] صفحہ ۱۳۔

پروفیسر بنی پرشاد فرماتے ہیں[۱] "کہ سلطنت کے بلند اغراض و فوائد کے درمیان آجانے سے
جو بےشکل شادیوں سے اکثر متعاقدین کی مسرت و انبساط کا خون ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں تو کچھ اور ہی
صورت تھی۔ مان بائی کے حسن و جمال، ذہانت اور دلکش سلیقوں سے شاہزادہ سلیم اس پر مفتون تھا۔
اور باوجودیکہ ایک مالیخولیائی رنگ یا کیفیت، اس کے خاندان میں متوارث چلی آتی تھی اور جس کو مرض
بخاری آسانی سے دیوانگی کے حدود تک پہنچا سکتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے دل کو گرم اور زندگی کو
پر لطف رکھتی تھی۔"

اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتی تو جہانگیر کے تاج و تخت پانے پر اُس کا مرتبہ کیا ہوتا۔ وہ سب سے
بڑی ملکہ یا "بانوے بانویان" ہوتی اور تمام بیگمات شاہی حتیٰ کہ جودھ بائی اور نور جہاں[۲] پر اختیار و اقتدار رکھتی۔
ابوالفضل علامی کی شہادت ہے کہ "آئینِ الوس[۳] ملکی است کہ حرمِ کلاں در نگاہداشتِ دیگراں اختیار
دارد۔[۴]" مولانا ظفر علی خاں لطائف الادب[۵] میں راوی ہیں "مغلوں میں قدیم سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ
خاقانہ اپنے شوہر کی دوسری بی بیوں کو اپنی باندیاں سمجھ کر جسے چاہے بخش سکتی تھی جیسا کہ ۱۳۳۲ء
میں خاقان الب ارسلان بغا والی ماوراء النہر کی بڑی بیگم سالمش خاتون نے اپنی سوکن مالک کو جذبۂ رقابت
سے بیتاب ہو کر ایک امیر کبیر وختوی شیراول کے نکاح میں دیدیا تھا۔"

مرنے کے وقت بیگم کی عمر تینتیس برس کے قریب تھی۔ اُنیس (۱۹) سال دلدار و دلنواز
خاوند کی خدمت گزاری، اطاعت و رفاقت میں گزارے تھے۔

نیرنگِ حسن و عشق کی وہ آخری بہار ۔۔۔ تربت تھی میری اور کوئی اشکبار تھا

---

[۱] تاریخ جہانگیر صفحہ ۲۹
[۲] ولی نور جہاں کی نسبت خود جہانگیر نے تزک میں تسلیم کیا تھا "تا نور جہاں بمحلسرائے من آمدہ شدہ بود از مزۂ خانہ داری
و انتظام مصالح بیت واقف نبودم۔ حالا سردار چار حد حرم محترم من است" (صفحہ ۱ تاریخ پادشاہان دہلی موسوم بہ تاریخ حبیب،
مطبوعہ ۱۲۷۳ھ لکھنؤ مطبع حسنی)۔
[۳] قوم کو ترکی زبان میں کہتے ہیں قبیلۂ بزرگ۔ [۴] اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۸۲۔
[۵] مطبوعہ لاہور، صفحہ ۱۳۔

مقبرۂ شاہ بیگم

مقبرۂ شاہ بیگم

خلوص ووفا کی پیکر، بے قرار اور درد مند دل والی بیگم آج اپنے شوہر کے قُربِ ظاہری سے محروم اور اُس کی آخری آرام گاہ سے منزلوں دور ہے۔ وہ الٰہ آباد میں دفن ہے اور جہانگیر لاہور میں۔ مگر اُس کی بے چین روح کو تسکین وتسلی ہے کہ خسرو باغ کی یہ ڈھائی گز زمین اسکی ابدی خواب وراحت کے لئے اُس کے غمگسار سرتاج نے پسند کی تھی۔ اسی کے نازبردار ہاتھوں نے سپردِ خاک ہوئی۔ وہ جیسی نفیس مزاج، جمیل وخوبصورت تھی نصیبوں سے ویسی ہی حسین ودلکش قبر بھی پائی یہ مقبرہ نہایت خوش قطع غیر معمولی طرز کا ہے ہندوؤں اور اندلسی مسلمانوں کے ملے جلے طریق تعمیر کا بہتر نمونہ بیگم نے ایک ہندو راجہ کے گھر جنم لیا تھا، ایک مسلمان بادشاہ کے یہاں دم توڑا۔ اس لئے اُس کا مدفن دونوں کی مخلوط ومتحد یادگاروں کی نظیر ہے۔ اکبر کے عہد کا رُجحان تھا، اور جہانگیر کی ذاتی نگرانی اور توجہ۔ ایسی چیز تیار ہوگئی جس کی مثال دوسری جگہ کم ملے گی۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

اس کے بعد (یا اس کے سوا) جو اس قسم کی شاہی عمارت کبھی بنائی گئی تھی وہ دھاکری محل بی بی المیتروی کا سنگ سرخ کا مقبرہ آگرہ میں ہے۔ یہ کوئی راجپوت بیگم تھیں۔ اکبر کی ہوں یا جہانگیر کی؟ تاریخ نہیں بتا سکتی[1]

سلاطینِ اسلام کے مختلف خاندانوں اور مختلف دوروں کے طرزِ تعمیر سے صاحبانِ فن و اہلِ نظر کو اطلاع وآگاہی ہے۔ اس لئے صراحت وتشریح کی ضرورت نہیں۔ اس قدر یاد دلا دینا کافی ہے[2] کہ

---

[1] مرقع اکبرآباد از مولوی سعید احمد مارہروی صفحہ ۱۷۰۔

[2] " " " " " " " " صفحہ ۹۔

"اکبر جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں عربی تعمیرات کا اثر ختم ہو کر ہندوؤں اور ایرانیوں کا اثر قائم ہو گیا تھا یا یوں کہئے کہ عربی طرز تعمیر کے بجائے ہندی طرز تعمیر غالب ہو کر جدید مغلیہ طرز تعمیر کی بنیاد پڑی تھی۔ جہانگیری طرز تعمیر میں جو مغلیہ طرز تعمیر کا وسطی یا دوسرا دور ہے، عربی اور ایرانی طرز کے ساتھ ہندوؤں اور بودھوں کا طرز تعمیر بھی نظر آتا ہے"۔ انھیں اصلاحات اور ترمیمات اور ان کے مطابق تعمیرات کو دیکھ کر وسیع النظر ویج ووڈ ہیتھ (Wedgwood Heath) کو اقرار کرنا پڑا تھا کہ شاہان مغلیہ فن تعمیر کے بھی بادشاہ ہیں۔ یہ مقبرہ اس اتحاد کی زندہ یادگار اور جہانگیری عمارات میں نقش اولیں ہے۔

یہ سنگین و خوشنما نازک عمارت باغ کے پچھم جانب 'خسرو باغ' کا تیسرا[۱] مقبرہ ہے، مسٹر بیل[۲] کے حساب سے دوسرا، اور زمانۂ تعمیر کے لحاظ سے پہلا۔

باغ کے صدر جنوبی دروازے سے دو سَو اسّی[۳] قدم کے فاصلہ پر بالکل سامنے یہ سہ منزلہ عمارت واقع ہے۔ اتفاق سے آج کل اس کے قریب ہی املی کے ایک پرانے درخت کی شاخیں راستہ پر بڑھ آئیں اور پھیل گئی ہیں، جس سے نگاہ کو دفعتہً رُک جانا پڑتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اس کا سایہ سایۂ رحمت اور باعث راحت و فرحت ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرا ہی قدم یا دوسری ہی نظر ڈالنے پر مقبرہ کا سنگین چبوترہ، بلند کرسی، سطح زمین سے ملا ہوا دروازہ، بلکہ عمارت کی ہر چیز گنبد مع کلس سامنے آجاتا ہے۔ پھاٹک سے یہاں تک پہنچنے کے لئے فراخ و کشادہ سڑک موجود ہے، جو تقریباً آدھے راستہ تک خوب پختہ، سواری لے جانے کے قابل بنی ہے۔ اس کے دونوں جانب دلآویز روشیں، سرسبز و شاداب پھولوں کی کیاریاں، خوشنما جھاڑیاں اور جا بجا بڑے بڑے گھنے درخت بھی ہیں۔ بقیہ نصف راہ صرف پیادہ طے کرنا ہوتی ہے، کیونکہ گھومنے والوں کے لئے پختہ سڑک یہاں سے بائیں کو گھوم جاتی ہے۔ اور چند پتھر یہاں سدّ راہ ٹکڑے کر دئے گئے ہیں۔ بائسکل لے جانے

---

[۱] آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا، جلد دوم یعنی دی مانومینٹل انٹی کوئٹیز اینڈ انسکرپشنس مؤلفہ ڈاکٹر اے فوہرر، پی ایچ ڈی، مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۳۰۔ اور ہیرالڈ کے بالائی بادکی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس، صفحہ ۵۴۔ ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق الٰہ آباد، جلد ہشتم مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۳۹۔ و جلد ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۹۔ تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد صفحہ ۲۳۴ [۲] مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۵

کی بھی ممانعت ہے۔ مرنے والوں کی عظمت منزلت اور قبروں کی حرمت ادب واحتیاط کا اقتضا یہی تھا یہ تجویز پرانی ہو یا حال کی اصلاح ضرور قابل تحسین واعتراف ہے۔

اس مقبرہ اور اس کے حوالی کا ایک مکمل نقشہ صاف اور اچھا خفیف رنگین امیر الدولہ گورنمنٹ لائبریری لکھنؤ میں موجود ہے جس کے نیچے ذیل کی عبارت لکھی ہے۔ Mausoleum of the Ranee wife of the Emperor Jahangir near Allahabad. Drawn and engraved by Thos. Daniell.

یہ نقشہ نامور چابکدست نقاش و مصور طامس دانیال کی صناعی و ہنرمندی کا شاہکار ہے اور ڈیڑھ صدی پہلے کی نقشہ کشی وطباعت کا کارنامہ۔ پیمانہ بڑا ہے۔ قرینہ ہے کہ نظری ہوگا لیکن اصل سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ اور اصول پیمایش کے مطابق مانا جاسکتا ہے۔ مقبرہ کے پچھم پرانی دیوار اور کنواں[1] مع تماشائیوں اور تفریح کرنے والوں کے انبوہ کے اپنی پوری شان وسامان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ شہر و حوالی شہر کی مخلوق کا ایک جم غفیر پانی لینے کے لئے ہر قسم کے برتن، پکھالیں، اور جانور ہمراہ لے کر امنڈ آیا ہے۔

موجودہ حالت میں بھی مقبرہ کا منظر اور اس کا گرد وپیش نہایت دلپسند و دلکش ہے پچھم جانب وسیع میدان ہے۔ لان (LAWN) ہیں۔ پورب کو دو عمارتیں ہیں۔ پہلی اسکی بڑی بیٹی سلطان النساء نثار بیگم کا خوبصورت گنبد۔ دوسری اس کے لخت جگر سلطان خسرو کا مرقد۔ شمال میں روشیں اور کیاریاں ہیں، اور خیابان دریا میں کچھ زیر زراعت زمین بھی ہے۔ سرسبز اور لہلہاتے ہوئے قطعات ہیں۔ دیوار بھی قائم ہے۔ کنواں بھی۔ مگر ایک بڑی حد تک بے مصرف۔ حوض بھی ہیں لیکن خشک۔ سرو کے پودے حال میں لگائے گئے ہیں۔ تاڑ کے دو پرانے درخت بھی باقی ہیں۔ معلوم نہیں کس کی رعایت ذوق کارفرما ہوئی۔ کچھ اور سدا بہار درخت بھی ہیں۔

---

[1] الہ آباد کی ہینڈ بک، مرتبہ ماڈرن ریویو آفس میں بھی اس کا ذکر ہے، ص ۵۲۔

مقبرۂ شاہ بیگم کا سطحی خاکہ
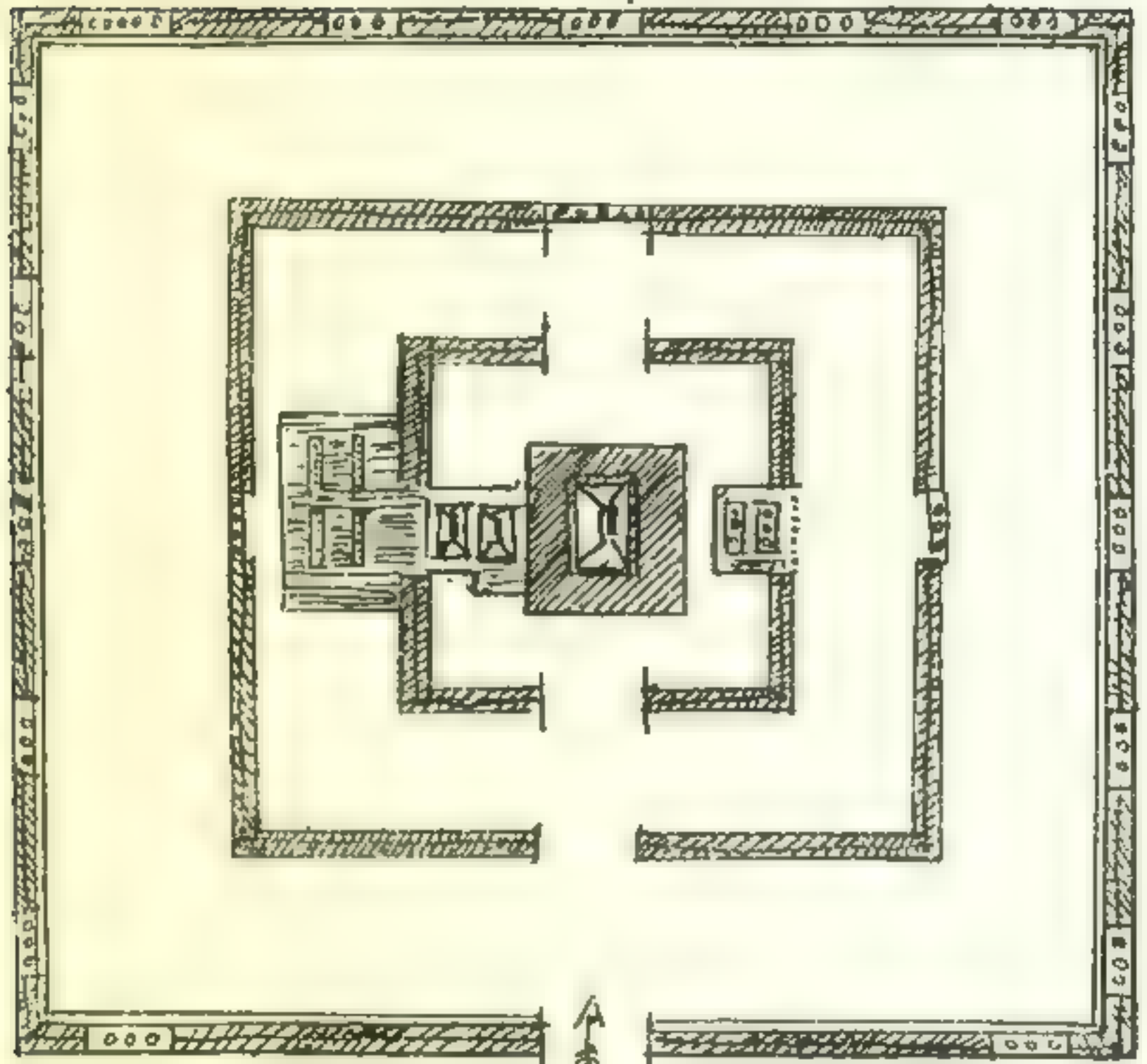
ترتیب و نگہداشت کے لحاظ سے بلکہ ہر حیثیت سے کوئی چیز کسی طرح انگشت نمائی کے قابل نہیں، ور یوں تو علم کیسی ہی ٹھیک بات ہو حسن کو اختلاف ہے۔

یہ تعمیر چار فٹ کی بلند کرسی پر کی گئی ہے، عمارت کے سب سے نیچے درجہ کا ہر پہلو اکتالیس گز ہے۔ وہ پر چڑھنے کے لئے ایک ایک فٹ اونچی تین تین سیڑھیاں ہیں یعنی آسایش و فراغت کے ساتھ پہنچ جانے کے لئے صدر دروازہ کے دونوں جانب ایک ایک چھوٹا سا زینہ موجود ہے۔

نیچے اوپر مقبرہ کی تینوں منزلیں جدا جدا نظر آتی ہیں مگر یہ ایک ہی بنیاد یا دیوار پر قائم نہیں ہیں۔ بلکہ تینوں طبقے یا مرتبے یکے بعد دیگرے بنے ہوئے ہیں۔ مرتبہ اُس عہد کی دفتری و کتابی اصطلاح میں منزل کے معنی میں مستعمل[1] ہوتا تھا۔ یہ مرتبے مختلف انداز اور بہ عدا عرض و طول کے ہیں۔ پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا چھوٹا' لمبائی چوڑائی اور بلندی میں کم ہوتا چلا گیا ہے۔ یہاں تک کہ تیسری منزل کی وسعت بقدر مقدور اختصار کے ساتھ نیز اُس کی انتہائی بلندی، گنبد اور گنبد کے کلس پر پہنچکر ختم ہو جاتی ہے۔ فن ڈرائنگ کے ایک ماہر کا ارشاد ہے کہ مقبرہ کا فوٹو ایک مثلث نما چوکھٹے میں بڑی آسانی و خوبی سے آسکتا ہے۔

باہر سے دیواریں تمام و کمال سرخ ٹائل سنگ سفید کی ہیں۔ کہیں کہیں زرد کھٹو مرمریں پتھر بھی استعمال ہوا ہے۔ نیچے والے طبقہ (منزل) میں دیواروں کے باہر اٹھارہ فٹ چار انچ چوڑا چبوترہ ہے۔ اس چبوترہ میں تین سمت تو پانچ پانچ سنگین جالیاں چار فٹ تو انچ لبی ایک فٹ چوڑی لگی ہیں۔ چوتھی طرف یعنی دکن کو' سامنے کے رخ صرف دو جالیاں ہیں۔ اور ان سب کے بیچ میں (صدر کا ایک) دروازہ۔ سب ملا کر سترہ جالیاں ہوئیں۔ یہ جالیاں اصول فن پیمایش و تعمیر کے مطابق بنائی گئی ہیں، اور روشنی کا اچھا کام دیتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وضع و طرز خاص کو اکبر کے اعتقاد و ایجاد سے کچھ لگاؤ رہا ہو۔ شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد دہلوی ناقل ہیں کہ "ایک مرید خاص مر گیا تو اس کی قبر میں جالی رکھی گئی کہ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے بلکہ چراغ کی لو بھی منہ کو لگائی کہ روشنی اور آگ پاک کرتی ہیں[2]"

شاہ بیگم کے مقبرے میں داخلے کی کھلی ہوئی محراب یا گھونگھٹ میں دروازہ ہے۔ اس کے داہنے

---

[1] جہانگیر نامہ معتمد خاں۔ [2] قصص ہند حصہ دوم، صفحہ ۹۰۔

پہلو یا دیوار پر ایک پتھر پر ہندی میں "گنیش" لکھا ہوا ہے۔ بے احتیاطی یا عدمِ التفات سے اس پر حسبِ معمول سفیدی سال بہ سال پھیری جاتی ہے۔ تاہم صاف اور نمایاں پڑھا جا سکتا ہے۔ کیا کسی نے تعمیر کے بعد اس کو یوں ہی کھود دیا تھا؟ غالباً نہیں۔ کیونکہ کسی قدر گہرا کھدا ہے کیا تعمیر کے وقت یہ نام برکت کے لئے کھود دیا گیا تھا؟ یقیناً نہیں۔ اگر حکماً اور اطلاع سے کندہ ہوتا تو حروف اس سے زیادہ خوبصورت اور باقاعدہ ہوتے۔

داخلہ کا دروازہ چبوترہ سے گزر کر یعنی چبوترہ کو کاٹتا ہوا بارہ فٹ نو انچ کے فاصلہ پر ملتا ہے۔ عمارت کے علو و رفعت اور اپنے اطراف و جوانب کی بلندی و شان کے لحاظ سے آج کل تنگ اور نیچا سمجھا جاتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ تین چار سو برس پیشتر یہی صورت پسند و رائج تھی۔ ہندوانہ تعمیرات میں یہ بات عام پائی جاتی ہے۔ موجودہ چوکھٹ اور کواڑوں کی حالت اُن کی دیرینہ سالی و کہنگی کم از کم کثرتِ استعمال پر دلالت کرتی ہے۔ تختے کمزور، نسبتاً پتلے، قدرے ناہموار اور ناپیوستہ سے ہو رہے ہیں۔ بالائے دروازہ محراب کی بلندی اُس کی چوڑائی کی مناسبت سے نہیں، بلکہ کچھ زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس محراب کے دونوں طرف یعنی آمنے سامنے دوسری منزل کو جانے کے لئے غیر مُسقف (کھلے ہوئے) زینوں کی دوہری قطار ہے۔

دیواریں پورا بوجھ اُٹھا لینے کے قابل خوب مضبوط۔ موٹی موٹی اینٹ اور چونے کی بنائی گئی ہیں۔
تعمیر میں یہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ منزلِ زیریں کے پہلے حصّہ کی کُھلی چھت دوسری منزل کے لئے چبوترہ کا
کام دیتی ہے۔ اور دوسری منزل کی چھت تیسری یعنی سب سے اوپر والی منزل کے ساتھ کارآمد
ہے۔ اندر کی تیسری دیوار پر دو منزلوں کا بار تھا اس لئے وہ زیادہ مستحکم اور عریض ہے۔ پہلی دیوار
صرف تین فٹ سات انچ ہے۔ دوسری چار فٹ ساڑھے چار انچ۔ اور تیسری پانچ فٹ نو انچ۔
دیواروں کا موٹاپا بقدرِ ضرورت بتدریج بڑھتا گیا ہے۔ اسی لئے بمقابلہ پہلے حصّے کی دیوار کے دوسرے
اور تیسرے حصّے کی دیواریں زیادہ چوڑی رکھی گئی ہیں۔ چھت یہاں دس فٹ سات انچ بلند رہ جاتی
ہے۔ اس (دوسری) منزل کی دیواروں میں ہر چہار طرف ہر ضلع کے وسط میں ایک ایک
کُھلا ہوا دروازہ ہے ان دروازوں میں چوکھٹ بازو نہیں ہے۔ ان کی بغلی دیواروں میں نیچے اوپر
دو دو ٹکڑے لوہے کے لگے ہیں، جن کی شکل یہ ہے [ ] قیاس ہوتا ہے کہ ان قلابوں پر کبھی کواڑ
رہے ہوں گے۔ یا ان پائیزوں پر کواڑ لگانے کا ارادہ رہا ہوگا۔ مگر تکمیل کی نوبت نہیں پہنچی۔ ہر دروازے
کے دونوں طرف محرابوں کے دو دو نشان بھی ہیں۔ یعنی ہر دیوار میں چار چار دروازوں کی بلندی ملے
کرنے کے بعد دیواروں پر ہر آٹھ محرابوں کے اوپر آرائش و زیبائش کے لئے پتھر میں کُھدے ہوئے
معمولی نقش و نگار ہیں۔ ایسے ہر پھول کے گرد، ہر نقش کے ساتھ محرابوں سے اوپر خوشنما سنگی حاشیہ
نظر افروز ہے۔ نقشی کارنس کے نیچے پتھر میں جال بنے ہیں۔ یہ کل جگہ خالی اور غیر مکمل ہی نظر آتی ہے۔
حتیٰ کہ دروازوں کے خشتی پہلو چونے کے پلاسٹر سے بھی محروم ہیں۔ اور پلاسٹر پر تیغی تو کسی جگہ نہیں
پائی جاتی۔ صورتِ حال شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ یا یہ کہ اس منزل کے
نیچے شاہزادی دفن تھی اور اس کے اوپر نقلی تربت ہے، اس لئے اس درمیانی طبقہ کو سادہ چھوڑ دیا۔
صرف بالا و پست درجوں کا احترام مدِ نظر رکھا گیا۔ حتی الوسع ہر نوع کی آرائش و تکلفات تعمیر سے
درگزر کیا گیا ہے۔ معمولی محرابیں اور جدولیں کافی سمجھی گئی ہیں۔ دروازے بھی مستقل دروازوں کی ہیئت
و حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ دیواروں میں مستطیل شگاف نکاس کے لئے بنے ہوئے ہیں۔ یہ منزل

منزلِ اسفل (نیچے والی) کی چھت یا اندرونی گنبد کے گرد کے اکہرے حصّے پر اُٹھائی گئی ہے۔ سرسری نظر ڈالنے سے یہ کھل جاتا ہے کہ تیسری منزل جدید اٹھائی گئی ہے۔ کھمبوں کے نیچے والے حصّے چھوٹے ہوں یا بڑے، نئے ہوں یا پرانے، اپنے اپنے جوڑ تک رکے رہتے ہیں۔ باہمی جوف خاصا بڑھ گیا ہے۔ دوسری منزل سے تیسری پر جانے کے لئے زینہ داخلہ کے دروازے کے قریب چھت کے نیچے ہو کر ہے۔

تیسری منزل یا "مرتبہ سوم" نے پوری عمارت اور اُس کے حسن کو انتہا پر پہنچا دیا ہے۔ یہ مجر یا "منظر" مستطیل بارہ دری آج بھی حجلۂ عروسی یا نیرنگِ کمال و جمال ہے۔ یہ جگہ مربع ہے۔ ہر طرف تین تین در ہیں۔ بیچ کا در زیادہ فراخ اور کشادہ ہے۔ باقی دونوں دائیں بائیں کے اس سے کم چوڑے ہیں۔ اوپر ایک خوشنما سبک قبہ ہے۔ بیگم کی نقلی یا مصنوعی قبر اسی مرمریں مجر (کٹہرہ) کے اندر بنی ہے۔ اس سے ایک گز نیچے سنگِ سُرخ کی غلام گردش ہے۔ اور اُس پر ہموار مسطح چھت۔ غلام گردش کے اوپر پتھر کے صاف ستھرے تختے "باہر نکال کر دھوپ اور بوچھارت بچانے کیلئے چھجّے بنا دیا ہے۔ مقبرہ کا یہ حصّہ حسین سے حسین ہے۔ ممالک مغربی کے سیّاحوں" انگریز مہندسوں (انجنیروں) اور اہلِ قلم[۱] نے قنوج کے مخدوم جہانیاں کی مسجد کو (جو عہد سلاطینِ شرقیہ کی یادگار ہے) پتھر پر نقاشی ودستکاری کے لحاظ سے نہایت خوب اور قابلِ تحسین بتایا اور لاجواب لکھا ہے۔ لیکن میں عرض کرونگا کہ مقبرۂ شاہ بیگم کے اس حصّہ میں جیسا خوب اور باریک ونازک کام نقاشی اور بیل بوٹے کا کیا گیا ہے، مسجد کا کام اس کے مقابلہ میں کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شاید اس کی یہ وجہ معقول ہو کہ مسجد کی تعمیر اس

۱؎ مقالات واقع بر جزیرہ نما و بر اعظم ہندوستان کا سرسری تذکرہ۔ از مسٹر ہنٹر [illegible] مشرقی متفرقات جلد اوّل [illegible] مطبوعہ کلکتہ ۱۷۹۸ء۔

Cursory Remarks on Places in the Peninsula and on the Continent of Hindoostan. By W Hunter, Esq. – Page 118, Oriental Miscellany, Volume The First. Calcutta. MDCCXCVIII.

۲؎ [illegible] ۱۹۲۵ء۔

مقبرہ سے دو ڈیڑھ سو برس پیشتر ہوئی تھی۔ اتنے زمانہ میں زمانہ بہت ترقی کر گیا تھا۔ اور مغلوں کی سرپرستی اور دستگیری نے سنگ تراشی و نقاشی کے ہنر کو منتہائے کمال پر پہنچا دیا تھا۔ اس ایوان میں پہنچ کر نظر واپس آنا نہیں چاہتی۔ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

قبر کا تابوت، لوحِ سرِ بالیں، سنگِ پائیں، ہر چیز مرمر کی اپنی اپنی جگہ بے مثل ہے۔ تعویذ کے دونوں پہلوؤں پر یہ رباعی جلی حروف میں پاکیزہ نستعلیق میں کندہ ہے۔ سرہانے تابوت یا تعویذ بالائی کے پہلو میں

یا فتّاح

(بائیں جانب تابوت کے دلے میں)

بیگم کہ ز عصمت رخِ رحمت آراست   اقلیمِ عدم ز نورِ عزت آراست

(داہنی طرف کے دلے میں)

سبحان اللہ زہی کمالِ عفت   کز حُسنِ عمل چہرۂ جنت آراست

لوحِ مزار شاہزادی کے شایانِ شان، خوب بلند ہے۔ اس پر یہ کتبہ ہے۔

اللہ اکبر

چوں چرخِ فلک ز گردشِ خود آشفت   در زیرِ زمیں آں ہمہ پنہفت
تاریخِ وفاتِ شاہ بیگم جستم   از غیب ملک بخلد شد بیگم گفت

لکاتبہ عبداللہ[1] مشکیں قلم جہانگیر شاہی۔

---

[1] میر عبداللہ مشکیں قلم دولتِ جہانگیری کے نامور کاتب و خوشنویس تھے۔ قلعہ الٰہ آباد میں اشوک کے مشہور سنگین ستون پر ہندی عبارت کے نیچے ۱۰۱۴ھ میں جہانگیر نے اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام فارسی میں کندہ کرایا ہے۔ وہ انھیں کا کمال ہے۔ (مفتاح التواریخ صفحہ ۱۹۷)۔ تبریز کے رہنے والے، شاہ نعمت اللہ مشہور ولی کی اولاد سے تھے۔ دینی و دنیوی، صوری و معنوی علوم میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔ "مشکیں قلم" دربارِ جہانگیری سے خطاب ملا تھا۔ مختلف مقامات پر اکثر بادشاہی کتبے آپ کے ہنر و جادو نگاری کی یادگار ہیں۔ ۱۰۳۵ھ ۱۶۲۵ء میں رحلت فرمائی۔ فرزندِ صالح

مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ[1] میں "آمنہ مہ" کی جگہ "آمنہ خود" اور مسٹر بیوریج نے اپنے مقالہ[2] میں "آمنہ مہر" لکھا ہے۔ مسٹر ڈیو ہرسٹ نے اپنی تحریر[3] میں تصحیح فرمادی ہے۔ بیل صاحب نے پہلی رباعی میں "عزت" کی جگہ "غیرت" لکھا تھا شاید چھاپے کی غلطی ہو۔

باز آمد ان پتھروں پر نہایت خوبصورت نستعلیق حروف کندہ ہیں۔ ہر مصرع کے گرد نفیس بیلیں اور گلکاریاں ہیں۔ یہ حروف اس قدر باقاعدہ، سڈول، دبیز اور باہر کو ابھرے ہوئے ہیں کہ آج کل کے موٹے موٹے انگریزی حروف جو پیتل وغیرہ کی چادروں پر ڈھالے جاتے ہیں، ان کے آگے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔ مصرع ؎

ظرف اور نستعلیق حرف، کا
عروس جمیل و لباس حریر

اوپر یعنی تعویذ قبر مسطح ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان اطراف میں تختی اور قلمدان کے امتیازی نشانات[4] بنادینے کا رواج اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ البتہ بیلوں، پھولوں اور گلکاریوں سے مالامال ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) عالیشان مقبرہ آگرہ میں ہے۔ یاقلمی کے خاندان میں خوش نویسی پشتہاپشت تک قائم رہی (حیات جلیل، حصہ دوم، صفحات ۲۰۲ و ۲۰۳ - نوٹ) خسرو باغ کی یہ رباعیاں تو نستعلیق میں لکھی ہیں، لیکن امیر الشعراء رضا قلی خان، ہدایت، فرماتے ہیں کہ میر عبداللہ نسخ کے بڑے خوشنویس تھے۔ باپ کا نام میر سید مظفر تھا۔ سلسلۂ نسب برہان الدین خلیل اللہ بن شاہ نور الدین نعمت اللہ ولی ماہانی تک پہنچتا ہے۔ ان کے آباد ایران سے ہندوستان چلے آئے تھے۔ طبقۂ شعرا میں بھی ممتاز درجہ حاصل تھا۔ مگر اپنے تخلص "وصفی" (کرمانی) کے لحاظ سے (بہ سلسلۂ حروف تہجی) صحف آخر میں جگہ پائی ہے۔ (مجمع الفصحا، مطبوعۂ ایران، جلد اول، صفحہ ۱۵) متعدد مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔

[1] ملخصاً، صفحہ ۳۳۵۔ [2] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۳۔

[3] جرنل مذکورہ بابت جولائی ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۹۔ J.R.A.S., 1909.

[4] تختی ایک چارگوشہ تختہ چوبیں مع دستہ کے ہوتا ہے جس پر ہمارے ملک میں لکھنے لکھانے کی مشق کرائی جاتی ہے مگر اب یورپ و اہل یورپ کی بدولت اس کی جگہ سلیٹ لے رہی ہے۔ قلمدان کو سب جانتے ہیں یعنی وہ چیز جس میں قلم وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ مسلمان عورت کی قبر پر تختی کی اور مرد کی قبر پر قلمدان کی شکل بنائی جاتی ہے (تاریخ آگرہ یعنی مرقع اکبر آباد، مولوی سعید احمد صاحب ۱۹۰۰ء۔ آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۲۵)۔

پتھر کے پہلوؤں پر کوئی روغن سُرخی مائل پھرا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ ماند ہوتا جاتا ہے۔ سنگِ بالیں ایک بلند بالا تختہ مرمر کا، لمبا چوڑا اور خوب موٹا ہے۔ خوبصورت، دلفریب، پشت کی جانب چھ پہل کا تراشا گیا ہے۔ اور نقش و نگار سے بھی مکلف ہے اس پر نہایت عمدہ کام ہے۔ پائینِ قبر کا تختہ بھی ایک ڈال سنگِ مرمر کا، سرہانے والے پتھر کے بالکل مشابہ اور ہمشکل ہے۔ اس پر بھی ویسی ہی نفیس بیلیں اور باریک کام ہے۔ البتہ کچھ لکھا نہیں ہے۔ یہ سنگِ بالیں کا ہر لحاظ سے پورا جواب ہے، اور خود لاجواب۔ یہاں مرمریں دِلہوں اور تختوں پر مختلف اقسام خصوصاً کنار کی بیلیں، خوبصورت دوہری تہری ابھری ہوئی نگہ افروز ہیں۔ کہیں کہیں کچھ پتھر یا اُس کا کوئی ریزہ اُکھڑ بھی گیا ہے۔ مگر اُن کے نشانات و داغ زیادہ نمایاں نہیں، کم ہیں اور خفیف۔ روغن جو یہاں پھرا ہوا تھا اب بھی جاذبِ نگاہ ہے۔ مگر اُس کی آب و تاب ویسی باقی نہیں رہی۔ ماند پڑ گیا ہے۔ قبہ، گنبد مختصر و ہندوانہ ہے، جنّی وضع سے بہت ملتا جلتا، یا بالکل بدھوں کا سکھر۔ جہاں ایوان کی دیواروں کی بلندی ختم ہو جاتی ہے، یعنی عمارت کے چوکور حصہ سے پتھر کے تختے بڑھتے گھٹتے ہوئے لگا کر، بتدریج اُٹھا اُٹھا کر، چاروں پہلوؤں کو اوپر لے جا کر ملا دیا ہے۔ حقیقتہً یہ کوئی بُرج نما (مدور) یا گنبد نہیں ہے بلکہ اپنی وضع کی ایک خاص چیز ہے۔ اس پر گنبس بھی اسی شان کا زرنگار و زر راندود مناسب حال چڑھایا گیا تھا، اب بے رونق ہو گیا ہے۔ اس طبقہ کا یہ قبہ، اس کا فرش، اس کے مرمریں تختے اور جنابین، اس کے حسین ستون، ان سب پر نازک نقاشیاں، غرض کہ اس کا ہر جزو و کل قابلِ ناز اور سلاطینِ تیمور کی عظمتِ ماضیہ اور صنعتِ کاملہ کا آئینہ دار ہے۔

حکومتوں کے انقلاب اور یار و اغیار کی دست درازی و دست بُرد نے اس کے ساتھ جو کچھ ظلم کیا ہوگا، کس کی زبان بتا سکتی ہے۔ لیکن امن و امان اور تہذیب و روشنی کے زمانہ میں یعنی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد عوام نے جو قدر دانی کی اور سیاحوں اور زائرین نے جس قدر ضرر پہنچایا وہ بھی ناقابلِ تلافی ہے۔ فرش کے چکنے ہوئے پتھروں پر بہت سے حضرات نے انگریزی، فارسی، ہندی اور عربی میں اپنے نام نامی اور دستخطِ گرامی نقش فرما دئے ہیں۔ کسی

مسٹر جیمس نے اپنے نام کے ساتھ سنہ ۱۸۶۶ء بھی چاقو سے کھود دیا ہے۔ شاید یہ ہی سب سے پہلا ظلم اور فتنہ برپا ہوا تھا، جس کی اور لوگوں نے تقلید کی ہے۔

[اس سے بھی پرانی مثالیں کاغذ و قلم کے خزانہ میں موجود ہیں۔ فرخ آباد کے جان باز و نام آور رئیس اور الہ آباد کے زبردست محاصر[1] نواب احمد خان بنگش کی قبر بہشت باغ (شہر فرخ آباد) میں ہے۔ مسٹر سی ایل ولیس Mr. C.L. Wallace فرماتے ہیں کہ اس پر مسٹر ولیم انتھونی کے وہ دستخط موجود ہیں جو انھوں نے مقبرہ کی دیوار پر کھرچ کر ۱۸۲۸ء میں کئے تھے۔ اسی کے قریب دو نام اور ملتے ہیں۔ ایک میں رابرٹ مارس نے پس آیندگان کے لئے ۱۷۹۳ء میں اپنا یہاں آنا درج کیا ہے۔ دوسرا نام جان میک لین اور سال ۱۸۱۰ء کا ہے[2]

یہ فعل سیاحوں اور آوارہ گردوں کو ہمیشہ محبوب رہا ہے۔ وہ اپنے نام کو بقائے جاوید دینے کی سعی میں ایسے ہی عمل کرتے تھے۔ اور یادداشت نگ داشت، موقع پا کر اب بھی باز نہیں آتے۔ ایران اور ماوراء النہر کا مشہور امریکن سیاح ولیم جیکسن (W. Jackson) اپنی کتاب "از قسطنطنیہ تا بہ وطن عمر خیام" From Constantinople to the home of Omar Khayyam کے اٹھارویں باب (مقبرۂ عمر خیام) میں تربت خیام کے متعلق لکھتا ہے "وحشی القاب سرگشت کرنے والوں نے (جن کی حالت ایران میں بھی وہی ہے جو کہیں اور ہے) اس چبوترہ کو تختۂ مشق بنایا ہے۔ اور نوک خامہ سے اُس کی تزئین کی ہے۔ برابر کی دیوار پر بھی اپنے نام کھود دئے ہیں....."]

اوپر کی دونوں منزلوں کی آپ سیر کر چکے اور اس سیر سے تمام باغ بلکہ حد نظر تک کا لطف اُٹھا لیا۔ آئیے۔ اب باقی ماندہ، پست ترین طبقہ کو بھی اندر سے دیکھ لیجئے۔ در اصل

---

[1] خزانۂ عامرہ، علامہ آزاد بلگرامی، صفحہ ۴۳، مطبوعہ کانپور ۱۸۷۱ء۔ جدید ڈسٹرکٹ گزیٹر الہ آباد، جلد ۳۳، صفحہ ۱۷۵

[2] فتح گڑھ کیمپ، صفحہ ۸۰۔

یہی منزل' منزلِ اوّل ہے۔ زمین پر واقع ہے' مگر بہت وسیع' فراخ اور کافی روشن ہے۔ اس کے داخلہ کا دروازہ وُہی ایک ہے' جس کا ذکر ابتدا میں آچکا ہے۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی یہ تہ زمین یا بالائے زمین حصّہ عمارت کا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک لمبا چوڑا' چوکور کمرہ شاہ بیگم کا مدفن ہے جس پر کسی قدر اُٹھی ہوئی محراب چھت ہے۔ اس کمرہ کے اردگرد دوہری دوہری غلام گردشیں' طواف اور پے کرما کرنے کے لئے خوب لمبی چوڑی بنی ہیں۔ یعنی صدر دروازے سے اندر آکر پوری وُسعت وطوالت کا ایک لمبا سا کمرہ ملتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دروازہ ہے۔ اس دروازے کے بعد پھر ویسا ہی چوڑا چکلا گر دگھما (مَطاف) گرداگرد حجرۂ مدفن ہے۔ مگر یہ پہلے سے طول میں کم ہے۔ ان دونوں دروازوں سے گزر کر حجرۂ قبر میں پہنچتے ہیں۔ باقی تین طرف کوئی دروازہ نہیں' لیکن روشنی کی شعاعیں' سنگ سُرخ کی سادہ مگر قابل تو جالیوں' درخانوں سے ہو کر اندر آتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ پہلی دیوار سے جو تین فٹ سات انچ عریض ہے' اور اس کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد اس کنارے سے اُس کنارے تک آپ کو پانچ سَیمتے یا کمرے ملیں گے۔ پہلا دروازہ سے لے کر دوسری دیوار و دروازہ تک۔ یہ بارہ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے بعد دوسری دیوار چار فٹ ساڑھے چار انچ موٹی ہے پھر دوسرا کمرہ سات فٹ ساڑھے چار انچ چوڑا۔ بعدازاں تیسری دیوار پونے چھ فٹ موٹی۔ بعدازاں حجرۂ قبر۲۱ انیس فٹ مربع۔ گویا وسطی یا مرکزی کمرہ کے گرد ہر چار سمت دوہرے درجے ہیں۔ دو داہنے دو بائیں' دو سرہانے اور دو پائیں۔ مرکزی حجرہ پر دوسری اور تیسری منزلیں واقع ہیں۔

قبروں کا تہ خانہ میں بنانا تو ایک مدت دراز سے چلا آتا تھا۔ لیکن سلطنت مغلیہ کے عروج یعنی اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اس کو اور بھی ترقی ہو گئی تھی۔ بالخصوص بیگمات کی تدفین میں پھر کچھ زمانہ بعد تو دولت مند اور صاحب مقدرت طبقوں میں اس کا رواج عام اور دستور سا ہو گیا چنانچہ شاہ بیگم کی ساس (اکبر کی پہلی ہندو بی بی جہانگیر کی ماں) ملکہ مریم زمانی [1] آگرہ کے یک لیسے

---

[1] تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد مارہروی صفحہ ۱۹۴۔

ہی مقبرہ میں سو رہی ہے۔ اس سے بھی روشن اور شہرت یافتہ مثال ممتاز محل[۱] (روضۂ تاج) کی ہے جسے شاہجہاں کی ملکۂ قندھاری بیگم نے مدفن کی۔ اس گئی گزری حالت میں بھی دہلی و آگرہ میں ایسی زیر زمیں قبریں بہ تعداد کثیر[۲] موجود ہیں۔

شاہ بیگم کا جسدِ خاکی کسی سفید و تابندہ مرمر کے تابوت کے اندر دفن نہیں ہے۔ بلکہ اس کی قبر اینٹ چونے کی سادہ و بے تکلف تعمیر ہے۔ قبر کے چبوترے کا طول دس فٹ، عرض سات فٹ دو انچ ہے۔ قبر کا تابوت والا یعنی اونچا حصہ پانچ فٹ پانچ انچ لمبا، دو فٹ پانچ انچ چوڑا ہے۔ قبر کے چبوترہ کی بلندی ایک فٹ ایک انچ ہے۔ اور تعویذ کی ایک فٹ چار انچ، دونوں کی ملا کر دو فٹ پانچ انچ ہوئی۔ اسکی چھت کسی قدر پست مگر محدب ہے، چاروں دیواروں کے پہلوؤں کو کچھ کچھ اٹھا کر اوپر ملا کر پاٹ دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس کو ایک قسم کا نیم گنبد کہہ سکتے ہیں۔ شاید ایک تہ خانہ یعنی زمین دوز حصۂ عمارت کے لئے یہی مناسب و کافی تھا۔ اس پورے طبقۂ زیریں میں معمولی پتھر کے چوکوں کا ہموار صاف ستھرا فرش ہے۔ کثرتِ استعمال و پامالی سے چکنا ہی ہو گیا ہے۔ یک وسیع مسقف رقبہ میں ایسا فرش نہایت اچھا پیروں کے لئے ٹھنڈا اور آرام دہ اور آنکھوں کے لئے راحت بخش اور زائر کے واسطے سکون آفرین و فرحت فزا ثابت ہوتا ہے۔ شاید یہ درجہ بھی چاروں طرف سے بند رہا ہوگا۔ جیسا کہ مسٹر ہیل نے لکھا ہے اور منافذ اور جھنجریوں سے روشنی کا بقدرِ قلیل انتظام ہوگا۔ مفتاح التواریخ[۳] کے الفاظ یہ ہیں "اصل تربت او اندرون روضہ ہست و آں مسدود است از ہر چہار طرف"۔ بظاہر اس کی تعبیر دشوار ہے۔ اور اگر آمد و رفت کے اعتبار سے بند ہونا مراد ہو تو چاروں طرف سے مسدود ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایک دکھنی رُخ تو دروازہ ضرور کھلا ہوا موجود ہے۔ بہر کیف اب کوئی بگڑی

---

[۱] تاریخ آگرہ، صفحات ۵ و ۳۳۔

[۲] تاریخ آگرہ، صفحات ۵۸، ۹۰، ۹۲، ۹۲، ۹۳، ۱۲۳، ۱۴۸، ۱۷۳۔

[۳] صفحہ ۳۲۵۔

ہوئی کیفیت باقی نہیں۔ غالباً کُل اصلی حالت میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہاں کبھی نقش و نگار یا رنگینیاں رہی ہوں، مگر اس وقت سفیدی اور چونے کی تہوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ چھت کی استرکاری میں البتہ کچھ جدولیں اور دائرہ بناتے ہوئے جال در جال پیدا کر دیئے گئے ہیں۔ اور وہ خوشنما ہیں اور نظر فریب۔

بیگم کی گود جس طرح جیتے جی بھری پُری رہی، اُسی طرح آج بھی ہے۔ اُس کی آغوش و دامانِ عاطفت میں کئی بچے کھیل رہے اور قبر کے پہلوؤں اور بغلی حصّوں کو آباد کئے ہوئے ہیں۔ اس کی قبر کے پاس داہنے کو دو چھوٹی چھوٹی قبریں ہیں۔ تختی اور قلمدان کی معمولی پہچان کے بھروسہ پر کہتا ہوں کہ پہلی شاہزادی کی ہے، دوسری شاہزادہ کی، جو پہلی سے کسی قدر چھوٹی ہے۔ اس کے بعد اینٹوں کی جالی سے ادھر کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ بائیں طرف بھی دو قبریں ہیں ۔ ایک شاہزادہ کی، دوسری شاہزادی کی۔ اس کمرہ سے باہر یعنی دوسرے درجہ میں بھی اسی طرح پر بائیں طرف دو قبریں چھوٹی چھوٹی برابر کو ہیں۔ ایک شاہزادی کی، دوسری شاہزادہ کی۔ اور تین قبریں جو کسی قدر ہٹ کر ہیں ان میں پہلی شاہزادی کی معلوم ہوتی ہے، دوسری شاہزادہ کی۔ تیسری پھر شاہزادی کی ہے۔ تیسرے درجہ میں ایک معمولی چبوترہ اینٹوں کا نظر آتا ہے۔ جو تقریباً ایک گز مربع اور ایک بالشت اونچا ہوگا۔

"بجلد شد بیگم" سے ۱۰۱۲ عدد نکلتے ہیں جو سنگ بالیں پر مرقوم ہے۔ مسٹر بیل اپنی اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری[1] میں ۱۰۱۲ = ۱۶۰۳ع لکھتے ہیں۔ تزک[2] میں سال وفات ۱۰۱۳ھ چھپا ہے۔ ممکن ہے کہ ٹائپ کی غلطی ہو۔ مسٹر بیورج کی رائے[3] ہے کہ تزک کی مندرجہ تاریخ یعنی ۲۶ ماہ گزشتہ ۱۰۱۳ھ ۶ مئی ۱۶۰۵ء کے مطابق ہوتی ہے۔ غالباً خود جہانگیر یا اُس کے نقل کنندہ و کاتب سے ایک سال بڑھ گیا ہے۔ صحیح تاریخ ۲۶ ذی الحجہ ۱۰۱۲ھ یا ۱۶ مئی ۱۶۰۴ء ہے۔ اکبرنامہ سے بھی یہی سال پایا جاتا ہے۔

---

[1] صفحہ ۱۵۲۔ [2] صفحہ ۲۶۔ [3] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۳۔

ڈاکٹر فوہرر نے شاہ بیگم کا سالِ وفات ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں۔ وہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سب سے بڑے افسر تھے۔
اُن کی کتاب یادگار عمارات قدیمہ پر سرکاری استناد، سرکاری حکم اور سرکاری خرچ سے سرکاری مطبع میں
چھپی۔ یہ مقبرہ اور اس کا کتبہ اُن کی نگرانی و سایۂ عاطفت میں تھا۔ اُن سے ایسی غلطی کا سرزد
ہونا عجب سے خالی نہیں۔

کرنیل نیول[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید میں رقم فرماتے ہیں، کہ کتبہ سے سالِ وفات ۱۰۲۲ معلوم ہوتا ہے۔[۲]
گزیٹیروں کے فاضل مولف بھی انسان ہیں۔ باوجود وسعتِ نظر و تحقیق و قابل معاونین کی ایک جماعت
کے ان کا قلم بھی کبھی کبھی فحش غلط نگاریاں کر جاتا ہے۔ ان کا یہ لکھنا کہ خسرو کی ماں کا سال وفات
۱۰۲۲ معلوم ہوتا ہے ایک فحش غلطی ہے۔ "معلوم ہوتا ہے" کے معمولی فلسفیانہ و دیرینہ عذر کے
کمزور جملے اُن کی ذمہ داری و جوابدہی سے اُن کو سبکدوش نہیں کرتی۔ اس شہزادی نے ۲۶ ذی الحجہ
۱۰۱۳ھ کو وفات پائی تھی جو تقویمِ عادلِ موجودہ وار تخ کے حساب سے ۶ مئی ۱۶۰۴ء کے مطابق ہے
قطعۂ تاریخ اس وقت آپ کے سامنے موجود تھی۔ ۱۰۱۲ھ یکم جون ۱۶۰۳ء سے شروع ہو کر ۱۹ مئی
۱۶۰۴ء کو ختم ہوا۔ ۱۶۰۴ء کا پہلا دن ۵ صفر ۱۰۱۳ھ کے مطابق تھا۔ پندرہ برس کا تفاوت کیا
چونکہ غلطی سے اس سالِ وفات کے بجائے بیٹے کا سمجھ گیا ہو۔ اس لئے کہ سلطان خسرو آخر جنوری
یا شروع فروری ۱۶۲۲ء میں فوت ہوا تھا۔ اور ۱۰۳۱ھ کا آغاز ۲۶ نومبر ۱۶۲۱ء کو اور انتہا ۱۴ اکتوبر
۱۶۲۲ء کو ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک تقویم سے دوسری میں تحویل کرتے وقت دنوں کا خفیف
فرق نظر انداز یا ناقابل لحاظ سمجھا جاتا تھا، لیکن ہفتوں، مہینوں اور سالوں کا نہیں!

صفحاتِ تاریخ بتاتے ہیں کہ مغلوں کے عقد میں آنے والی ہندوستانی شہزادیوں میں
مان بائی شاہ بیگم سب سے پہلی رانی تھی جس نے حرم سرائے سلطانی میں جان دی۔ دراصل

---

۱ [illegible] فہرست [illegible] عمارات [illegible] آثار قدیمہ [illegible] صفحہ ۱۰۳
۲ صفحہ ۱۹۹۔ گزیٹیر سابق، صفحہ ۲۰۳

شوہر پر نثار و تصدق ہو گئی۔ تیمور کے پوتے نے بھی نیازمندی و وفا کا حق ادا کیا اور اس کے جسدِ خاکی کی بڑی
آسایش کے لئے دامنِ فردوس میں ایک قابلِ رشک نشیمن مہیا کر دیا۔ اُس کا مقبرہ جس تمام نفاست اور تعمیری
دلسوزی رعایتوں کے ساتھ اس سرسبز و سدابہار چمن کی آغوش میں تیار کرایا گیا اُس کے شایانِ شان تھا۔
مغلوں[1] کے بہت سے شاندار مقبرے اور مدفن میں نے آگرہ اور دہلی میں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر دیکھے
ہیں، لیکن شاہ بیگم کے مقبرے کو بے تکلف و تامل اور بلا خوف تردید فن کے سلیقۂ تعمیر کا حسین ترین
نمونہ اور خوشنمائی و نزاکت کا مجسمہ کہہ سکتا ہوں۔ اس کی سادگی و نظر فریبی مسلم ہے۔ یہ ساتھ ہی جدتِ وضع،
اندازِ تعمیر اور مجموعی اختصار نے جو خوبی و رعنائی پیدا کر دی ہے، اُس کی دادِ تحسین مجھ ناشناس کی آنکھیں
کیا دے سکتی ہیں۔ میں نے ایک بلیغ نظر[2] کو اس وجہ خاص سے اس کو تاج پر بھی فوقیت و ترجیح دیتے
دیکھا ہے۔ یہ رائے تاج محل کی اہانت و گستاخی پر محمول نہ کی جائے۔ وسیع النظر اور جہاں دیدہ سیاح
بعض عمارات کو ممتاز محل کے روضے سے بھی ممتاز بتاتے آئے ہیں۔ حال ہی میں بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر
ہنری ہیرس ہسپانوی نے انجمن ادبی کابل کو جو قابل قدر مقالہ بھیجا تھا اُس میں فرمایا تھا کہ "میرے خیال میں
تاج محل" اپنی دلکشی و دلفریبی کے اعتبار سے بے نظیر ضرور ہے۔ لیکن شیر شاہ کا مقبرہ اپنی عظمت اور اپنی
شان و نمود کے لحاظ سے تاج محل سے بھی زیادہ بلند درجہ رکھتا ہے۔ [شیر شاہ سوری کا مقبرہ سہسرام
میں ایک مصنوعی تالاب کے وسط میں بنایا گیا ہے۔ اس کی عمارت افغانی فطرت کا آئینہ ہے۔ چونکہ شیر شاہ
افغان تھا اس لئے اُس کا یہ عظیم الشان مقبرہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ قبر ہندو کش اور افغانی سلسلہ کوہ

---

[1] صحیح یہ ہے کہ [illegible] مغل نہیں [illegible] کی نسل کو تیموری [illegible] ہندوستان کے مسلمان [illegible] نے مغل کا لفظ [illegible]
مغلوں [illegible] مغل کا نام تمام مسلمانانِ شمال [illegible] افغانوں [illegible] ترکوں [illegible] یہ نام ماخوذ ہے [illegible] Alanza or Alinji ترکوں کے [illegible] کی اقوام میں یہ ترکوں کا قبیلہ
تھا۔ ملاحظہ ہو [illegible] صفحہ ۱۳۸ [illegible] حصہ اول صفحہ ۲۹۔ [illegible]
Sir Selwyn Howe [illegible] Fremantle.
[2] [illegible]

کی بلندیوں کو اپنے مُنہ رکھ دینا چاہتی ہے]"[1]

ایک عورت کے روضہ کی تعمیر میں خصوصیت یا صفت اس کی نسوانیت کو ہونا چاہیے۔ گر اکبری دَوَر کی ٹھوس تعمیرات کا سا مردانہ پن، استواری و استحکام کی نمایش اور اہتمام اس میں بھی کیا جاتا تو لطافت و نزاکت، دلکشی و دلربائی خواہ مخواہ مفقود یا نظر انداز ہو جاتی۔ یہ نسوانیت یہاں ارادۃً پیدا کی گئی ہے، اور بدرجہ اتم زیب دے رہی ہے۔ یوں کہیے کہ روضہ کی عمارت محض روضہ نہیں بلکہ شاہ بیگم اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ اس رشکِ فردوس مقام پر جلوہ افروز ہے۔ پھر یہ اس کی انتہائی خوبی ہے کہ صبحِ درخشاں ہو یا نیمروز تاباں، شام کا دھندلکا ہو یا رات کی گھنگھور سیاہی، یہاں رانی اپنی اُترتی عمر یا ڈھلتی ہوئی جوانی میں نہیں، بلکہ چڑھتے ہوئے شباب میں رونق بخش نظر آتی ہے۔

میں نے جب اپنی جوانی اور نئی عمر میں اس کو پہلے پہل دیکھا تھا تو اپنے نزدیک فیصلہ کر لیا تھا کہ جہانگیر نے یہ خوبصورت اور نازک یادگار بنا کر بیگم کی مہر و وفا کا صلہ یا حقیقۃً اپنا خراج عشق ادا کیا ہے۔ اور اُولوالعزم شاہجہاں نے بلند حوصلگی کے ساتھ ممتاز محل کا روضہ بنوانے میں محض باپ کی تقلید یا پیروی کی ہے زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنے سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

نگارندہ سطور عبرت و وفا کا سبق حاصل کرنے شاہ بیگم کے مرقد پر بارہا گیا، اور زبانِ حال سے کسی کی غفلت و بے خبری کا شکوہ سنج پایا ہے۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے　　　نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

---

[1] رسالہ شاہکار، دہلی، جنوری ۱۹۳۵ء، صفحات ۴۳، ۴۴۔

(۵)

سلطان خسرو

(فرزند اکبر شاہنشاہ جہانگیر)

عمل ابوالحسن اصفہانی نادر العصر عہد جہانگیر شاہی

مرسومہ [illegible] قنوج کی نایاب چیزوں میں دستیاب ہوئی

منقول صدقی

خسرو اور مقبرۂ خسرو

مرقدِ خسرو الٰہ آباد اور نواحی الٰہ آباد بلکہ صوبۂ الٰہ آباد کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے، جس کے سامنے لاکھوں بندگانِ خدا سرِ ادب خم کرتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ دعویٰ تامل کے ساتھ مانا جائے گا۔ کیونکہ اس صوبہ میں بہت سے مشہور مزارات و معابد، آثارِ عتیقہ، پاک تیرتھیں اور مقدس مقامات موجود ہیں۔ مذہبی تعلق و تقدس کے لحاظ سے خود پریاگ کا کہن سال پتال پوری مندر اور اُس کا اکشے وٹ درخت یہاں کی بڑی پرستش گاہ سمجھے جاتے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں عقیدت مندوں اور عبادت گزاروں کا مرجع ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روضۂ خسرو کا حدِ احترام کسی خاص جماعت یا قوم و ملت کے دین کے ساتھ وابستہ و محدود نہیں۔ شاید اُس کا طواف، کم از کم نظارہ مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلم کرتے ہیں۔ یعنی وہ ریاضت کش جاتری اور تارک الدنیا سادھو جو دشوار گزار و پیچیدہ راستے طے کرکے دور دراز مقامات اور پہاڑوں سے اپنے اپنے طریقوں پر پرستش اور یادِ الٰہی کے لئے یہاں آتے ہیں، جو تربینی کے سنگم کے اشنان کو گناہوں سے برات کا وسیلہ و ذریعہ مانتے اور حلاوت و برکت ابدی کی دستاویز سمجھتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کا وہ مغرور و متکبر سیّاح جو اپنی ذاتی نخوت، قومی تفاخر اور ملکی خصوصیات اور آن بان کے سامنے پرانی دنیا بلکہ سارے جہان کو ہیچ اور حقیر سمجھتا ہے، یہاں پہنچکر وہاں کی سربلندی و رفعت کا خیال دور کر دیتا اور بے اختیار سرِ اطاعت جھکا دیتا ہے۔ وہ ہراس و ہیبت پیدا کر دینے والی ہیبت، جس نے اس بیسویں صدی میں دارا و سکندر کے تاج کو بھی ناچیز و بے حقیقت ثابت کر رکھا ہے، بادۂ پندار سے سرمست و سرشار انسان کے پرغرور سر سے خود بخود ہٹ جاتی اور تعظیم و ادب کا خراج پیش کرتی ہے۔ ادھر ایک متواضع و کریم النفس ایشیائی نژاد دور ہی سے دیکھ کر بے ہوش سا ہو جاتا ہے۔ اس خاک کے پتلے منکسر مزاج صافی مشرب کے آئینِ عجز و نیاز کی پہلی دفعہ اور جادۂ ارادت و عبرت کا پہلا قدم یہی ہے۔ عرفی[1] کی روح جو جیتے جی جہانگیر کے لئے مضطرب اور اُس کی پرستار رہی تھی، لاہور ہوتی ہوئی تاکستانِ شیراز سے آجاتی ہے۔ ان دونوں نوواردوں کو عجز و فروتنی کا یکساں مظاہرہ کرتے ہوئے پاتی ہے۔ تحیر و استعجاب کا تاثر دل سے نکل کر زبانِ حال پر آجاتا ہے۔ وہ اس مٹے ہوئے عظمت و جلال کو سراہتی ہے، جس نے

---

[1] اکبر نامہ شیخ ابوالفضل، مطبوعہ نول کشور، جلد اول، تقریظ شارح، صفحہ ۲۔ ایضاً دفتر سوم، صفحہ ۹۲۳

بیگانہ زتاں کرد تا رک ـــــــ آورہ ز کفش کرد پارا

الغرض دور آباد شہر (الٰہ آباد) کی آبادی کا بیشتر حصہ بلا کسی امتیاز فرقہ و جماعت کے ہر روز، ہر ہفتہ، ورنہ کم سے کم سال میں دو تین مرتبہ تفریحاً یا کھیل تماشوں کے سلسلہ ہی سے خسرو باغ ضرور پہنچ جاتا ہے اور پھر وہاں پہنچکر ہر آنکھ والے کی نظریں اور عبرت و حسرت بھری نگاہیں بے اختیار مقبرہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس دور آزادی و آزاد خیالی اور روشنی و روشن دماغی میں بھی "یادگارِ خسرو" کی عظمت و ہیبت برقرار بلکہ روز افزوں ہے اور سروشِ غیبی کی یہ صدا قائم ہے۔

چشم تو نہ در کو صرف چمن آرائی کر ـــــ شاید آجائے پئے سیر گلستاں کوئی

آغازِ سلسلہ یہ واقعات کو سمجھ لینے کیلئے اتنا یاد دلا دینا ضروری ہے کہ خسرو، جہانگیر کی بیوی بیگم، راجہ بھگوان داس کی بیٹی رانی مان بائی مخاطب بہ شاہ بیگم کے بطن سے ۲۴ امرداد ماہ الٰہی رمضان ۹۹۵ھ[1] سن بتیس جلوس اکبر شاہی میں پیدا ہوا تھا۔ مسٹر بیورج پد کے حساب سے اس کی انگریزی تاریخ ۴ اگست ۱۵۸۷ء لکھتے ہیں[2] میرے شمار سے دو دن بعد یعنی ۶ اگست ہوتی ہے۔ باپ کا بڑا بیٹا اور دادا کا پہلا پوتا تھا۔ اس لئے بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں جن کا تذکرہ "تذکرہ خسرو" میں کر چکا ہوں۔ اور بقدرِ ضرورت اس کتاب میں بھی شاہ بیگم کے سلسلہ میں آ چکا ہے۔

اکبر و جہانگیر کے زمانے کی تاریخوں میں خسرو کی زندگی کے متعلق بہت کم مذکور ہے البتہ تلاش سے اکبر نامہ میں کچھ باتیں مل جاتی ہیں۔

ولادت ـ دو جگہ پر (۱) سال جلوس ۳۱ سنہ ۹۹۴ھ پنجاب میں چناب کے قریب شب شانزدہم در خانہ شہزادہ سلیم از دختر راجہ بھگونت داس فرزند سعادت چوند پدید آمد۔

---

[1] قاموس المشاہیر نظامی بدایونی صفحہ ۲۲۳۔ ... بنشی ساگر نیل ڈکشنری صفحہ ۴۳۔

[2] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں مسٹر بیورج کا مضمون بابت جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۵۹۷۔

وگوناگوں نشاط رو آوردہ۔ طالع بروشِ یونانیان بردہ درجہ قوس وبہ آئینِ ہندیاں یک درجہ جبل ویک دقیقہ شہریار دیدہ در بہ سلطان خسرو خود نامور گردانید و بر خلاف زایناں انجمن سپاس گزاری بر آراستہ شد۔ در منزلِ مریم مکانی بزرگ جشنے پیراستہ آمدہ و سیاق و بخشش را روز بازار شد[1]

[ترجمہ] سولھویں کی رات شاہزادہ سلیم کے گھر میں راجہ بھگونت داس کی بیٹی سے لڑکا پیدا ہوا۔ طرح طرح سے خوشیاں کی گئیں۔ زائچہ دیکھا گیا۔ بادشاہ نے خود سلطان خسرو نام رکھا۔ شکرانہ کی محفل آراستہ ہوئی۔ مریم مکانی (حمیدہ بانو بیگم۔ اکبر کی ماں) کے محل میں بڑا جشن منایا گیا۔ داد و دہش خوب ہوئی۔

(۲) سال جلوس ۳۲۔ ۹۹۵ھ

..... بشہرِ لاہور در شبستانِ شاہزادہ سلطان سلیم از دختر پاک فرزندِ راجہ بھگونت داس آں گوہرِ سعادت پرتو چہرہ بر افروختہ بفرخ ساعتی نوید خجستگی نشاط آورد و زمانہ بہ تہنیت گزاری برنشست و روز بعشرت بزمے برخواست رازداران آسمانی بچشم دوربین باز کشادند و لختے از شگرف کاری سپہر و اختر دریافتہ بر گزاردند۔ نظم

بسیر سپہر انجمن ساختند | ترازوئے انجم بر افراختند
چناں طالعے کامد آں پور ازو | چہ گویم زہے چشم بد دور ازو

طالع ..... کیوان خدیو آں عزرانہ فرزند را بسلطان خسرو نامور گردانید امید کہ بہ ہمیں دمسازان آگہی بالد و شایستہ خو بار روز افزوں گیرد۔[2]

[خلاصہ] شہر لاہور میں شاہزادہ سلیم کے محل میں راجہ بھگونت داس کی بیٹی سے لڑکا ہوا۔ مبارک ساعت میں خوش خبری پہونچی۔ بڑی خوشی ہوئی۔ دنیا بھر میں مبارک سلامت ہونے لگی۔ اکبر نے خسرو نام خود رکھا۔ طالع دیکھا گیا۔ امید ہے کہ ہوش مندی کے ساتھ بڑھے گا۔ اور نیک عادتوں میں دن بہ دن ترقی کریگا۔

اہلِ دربار اور مقربانِ سلطنت کی دعائیں اتنی تو پوری ہوئیں کہ خسرو نیک خصال و نیک کردار ثابت ہوا۔ مگر نیک مزاج و نیک بخت نہیں۔ اُس کی زندگی تمام تر کلفت و اذیت میں گزری۔ انجام اندوہناک تر ہوا۔

(۳) ۳۳ سنہ جلوس، مطابق ۹۹۷ھ۔ سفرِ کشمیر میں شاہزادہ سلیم کو حکم ملا کہ اردوئے شاہی میں

---

[1] اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۰۰۔ [2] اکبر نامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۴۵۔

جا کر سلطان خسرو اور چند بیگمات کو لو لائیں۔[1]

(۴) سنہ ۳۵ جلوس مطابق ۹۹۹ھ میں بسم اللہ ہوئی۔ مکتب میں بٹھایا گیا۔ اکبر نے پہلا حرف "الف" خود بتایا۔ باقی تعلیم شیخ ابوالفضل کے ذمہ ہوئی، تاکہ کچھ نہ کچھ روزانہ سکھا دیا کریں۔ شیخ نے پھر اپنے بھائی شیخ ابوالخیر کے سپرد کر دی، جو یکسر داتی اور دانش آموزی میں یکتا تھے۔[2]

(۵) سال جلوس ۳۸ مطابق ۱۰۰۰ھ میں رہتاس کی راہ میں شہر کے قریب شاہزادہ خسرو نے حاضر ہو کر دادا جان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا۔[3]

(۶) ماہ آذر سنہ ۳۵ ج = ۱۰۰۱ھ میں سلطان خسرو کو ہندی علوم کی تعلیم شروع ہوئی۔ بھودت برہمن جو بھٹاچارج کے لقب سے معروف تھے اور اُس زمانے میں تمام فنون میں یکتا سمجھے جاتے تھے اس خدمت پر مقرر ہوئے۔[4]

(۷) سنہ ۳۹ جلوس ۱۰۰۲ھ میں جب شاہزادہ کلاں (سلیم) کے رتبہ و منصب میں ترقی ہوئی تو باوجود خورد سالی کے سلطان خسرو کو بھی بوجہ خرد بزرگی (عقل میں بڑا ہونے کے) پنج ہزاری مرتبہ مرحمت ہوا۔[5]

(۸) سنہ ۴۲ جلوس = ۱۰۰۷ھ میں اکبر جب دکن سے مالوہ کی جانب شکار کو چلا تو سلطان خسرو بھی ہمرکاب تھا۔[6]

خسرو کی ذات و صفات کی نسبت فارسی کے قدیم مورخوں نے قطعاً سکوت اختیار فرمایا ہے۔ البتہ مولانا غلام محمد ہفت قلمی مصنف تذکرۂ خوش نویسان نے سلطان خسرو کو طبقۂ خوش نویسان میں شمار کیا ہے اور خرم و پرویز و دارا شکوہ شاہزادگان بلکہ زیب النسا کو بھی پیچھے جگہ دی ہے۔ ہمارے معاصرین میں سے کرنیل میلی سن اُس کو جامع اوصاف بتاتے اور لکھتے ہیں کہ تمام امرا بھی اُس کو ایسا شاہزادہ مانتے تھے، جس کا طریقہ بے داغ تھا۔[7]

---

[1] اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۵۷۵۔ [2] ایضاً صفحہ ۵۸۳۔ [3] ایضاً صفحہ ۶۰۰۔ [4] ایضاً صفحہ ۶۲۳۔ اسی مورخ (ابوالفضل) نے آئین اکبری میں "شناسائے عقلی کلام و دانش اندوز جدید دولت" کے زیر عنوان ممتاز سد فضلا کے جو نام لکھے ہیں، ان میں کوئی "بھودت" پڑھا نہیں جاتا، خالی "بھٹاچارج" ایک ضرور ہے۔ غالباً یہی ہے مراد ہے۔ باقی دو بھٹاچارجوں کے نام بھی بتا دیے ہیں۔ [5] اکبرنامہ جلد سوم صفحہ ۶۸۰۔ [6] ایضاً صفحہ ۷۱۰۔ [7] اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج، صفحہ ۱۳۲۔

جب راجگانِ احمد نگر و برار کے مقابلے کے لئے میدان جنگ کو چلا ہے تو بڑے اصرار و لجاج سے جہانگیر سے
اجازت لے کر اور آنی رائے سنگھ دلن[51] اور آصف خاں کی حفاظت سے خسرو کو باہر نکلوا کر اپنے ہمراہ لیتا
گیا تھا[52]۔ جہانگیر نے شاہجہاں کو کامل اختیارات[53] دے دیئے تھے کہ جس طرح مناسب ہو خسرو کے ساتھ
برتاؤ اور سلوک کرنا۔ سب اُس کی تمیز و صوابدید پر چھوڑا تھا۔

اقبالنامۂ جہانگیری میں بخشی الممالک معتمد خاں کے الفاظ یہ ہیں "و خسرو را کہ در زندانِ مکافات
محبوس بود و بند ہائے شاہی محافظت و محارست او می نمودند حکم شد کہ ہمراہ خود بُردہ بضابطہ کہ خاطر آں فرزند
مطمئن باشد مقید دارد......" یہ کہہ کر جہانگیر خود اکبرآباد چل دیا اور شاہجہاں کو روانہ دکن کر گیا تھا۔ معتمد خاں[54]
کی بھی اسی لشکر میں ماموری تھی۔ خدمت بخشی گری پر مقرر ہوا تھا۔

خافی خاں لکھتے ہیں "و حکم شد کہ خسرو خسران مآل را ہمراہ بُردہ قسمے کہ خاطر از وجمع باشد نگاہ دارند[55]"
سرکاری رپورٹ اور تزک[56] کی خبر تو یہ ہے کہ خسرو نے وہاں درد قولنج سے یکایک وفات پائی۔ مگر
ایک جماعت کا اشتباہ بلکہ دعویٰ ہے کہ شاہجہاں نے اُس کو مروا ڈالا تھا" تاکہ مقابلہ کا سب سے بڑا دعویدار
اور امرا و مقربینِ شاہنشاہی کا سب سے زیادہ محبوب و عزیز[57] شاہزادہ دنیا سے رخصت ہو جائے اور تاج و تخت
اس کے لئے خالی رہے۔

---

[50] مسٹر بورج کا مضمون۔ بابت جولائی ۱۹۱۶ء صفحہ ۱۰۰۔ قاموس المشاہیر میں (صفحہ ۲۲۲ پر) ۱۴ ربیع الاول ۱۰۳۱ھ تحریر ہے اور انگریزی تاریخ ۱۷ جنوری ۱۶۲۲ء عمر ۳۵ سال (صفحہ ۱۰۲)۔ [51] انوپ سنگھ رہبر گوجر کو انی رائے سنگھ دلن خطاب تھا۔ اس نے اتفاقاً ایک شاہی چیتے کو شکار کر لیا تھا۔ ماخوذ ہو کر کچھ دیر پر رہا کر دیا گیا۔ ملازمت میں داخل ہوا۔ میرزا کا بیٹا تھا۔ جہانگیر کے شیر کے شکار میں ساتھ تھا۔ مجروح ہوا۔ بادشاہ کی جان بچائی۔ صلہ میں مرصع تلوار عطا ہوئی اور خطاب انی سنگھ دلن شیر کا مارنے والا۔ جہانگیر کا نہایت معتبر و معزز و مقرب میر تھا۔ قاموس المشاہیر صفحہ ۱۱۔ ادبیات مغل صفحہ ۲۵۲۔ اقبال نامۂ جہانگیری صفحہ ۲۶۶ تا ۲۶۸۔ [52] مسٹر بورج صاحب کا مضمون رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جولائی ۱۹۱۶ء صفحہ ۵۹۱، ۶۰۰۔ ڈکن صاحب کی تحریر ہینڈ بک صفحہ ۲۳۳۔ [53] تاریخ جہانگیر از گلیڈون صفحہ ۶۵۔ [54] صفحہ ۲۴۴۔ [55] منتخب اللباب حصہ اول صفحہ ۳۲۸۔
[56] تزک جہانگیری صفحہ ۳۳۲ ترجمہ انگریزی جلد دوم صفحہ ۲۲۸۔ اقبال نامۂ جہانگیری صفحہ ۱۹۱۔ [57] اکبر سے سلطنت مغلیہ کا عروج از کرنیل میلی سن صفحہ ۱۴۴۔

دعویٰ یا ہزار اُس بُت سفاک نے مگر ۔۔۔ دھبے ہمارے خون کے خنجر میں رہ گئے

مسٹر بیل نے مفتاح میں کم و بیش پُرانی کتابوں سے دونوں روایتیں نقل کر دی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "شاہزادہ خسرو مدت تک محبوس رہا۔ آخر باپ کے خوف سے اکبرآباد سے بھاگ کر الٰہ آباد چلا آیا اور وہیں اقامت اختیار کی۔ حتّٰی کہ وفات پائی"..... "بعض تواریخ میں مرقوم ہے کہ شاہجہاں جب ولایتِ دکن کی تسخیر کو گیا تو بھائی کو بھی لیتا گیا اور وہیں شہید کرا دیا۔ جہانگیر نامہ میں تحریر ہے کہ وہ دکن میں دردِ قولنج سے فوت ہوا۔ اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے کہ اس کا مزار الٰہ آباد میں کیسے بنا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ تکفین و تدفین کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کی نعش احقاقِ شہادت کے لئے قبر سے نکالی گئی تھی۔ شاید اس کے بعد الٰہ آباد بھیج دی گئی ہو اس لئے کہ اس کی ماں کی قبر وہیں تھی۔"[1]

مسٹر بیل کے بعد کے ایک مورخ صاحب "اویاق مغل" اسی قدر لکھ کر خاموش ہو گئے کہ اسی سال شہزادہ خسرو دکن میں گزر گیا۔[2]

اُس زمانہ کے یورپین سیاحوں اور لکھنے والوں[3] کی متفقہ خبر اور اطلاع یہی ہے کہ شاہجہاں نے خسرو کو ہلاک کرا دیا تھا۔ موافق و مخالف دونوں طرح کی روایات اور تحریرات پر میں "شاہزادہ خسرو" کے تذکرہ میں ضروری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ یہاں نقل و تکرار کی حاجت نیز گنجایش نہیں پاتا۔ مسٹر بیورج کو اس بارہ میں اختلاف ہے۔ فرماتے ہیں[4] کہ زہر دینے یا گلا گھونٹنے کی کوئی شہادت نہیں پائی جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ راجپوتوں کی تاریخیں صاف لفظوں میں خسرو کے مروا ڈالنے کا الزام خورم پر لگاتی ہیں۔[5]

ہنریچ فان پوسا Heinrich Von Poser جرمن سیاح نے جو اُس وقت ہندوستان میں موجود تھا، لکھا تھا: "لیکن خورم کی اس دہشت ناک برادر کُشی یعنی خسرو کے قتل کو کون پسند کرے گا۔ بے شبہ یہ مشہور مثل ہے کہ جو کوئی حق و صداقت کے مقابلہ میں جبر و جور کرنے

[1] مفتاح التواریخ صفحات ۳۳۵ و ۳۳۶۔ [2] صفحہ ۲۰۴۔ [3] پیٹر وڈیلاویلی پیٹر منڈی۔ ولیم ٹیری۔ پلسارٹ۔ سر رٹ۔ فان پوسا۔ ڈی لٹ۔ [4] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۵۹۹۔ [5] تاریخ جہانگیر از گلیڈون۔ صفحہ ۹۰ (اضافہ پرنسپل ایجرٹن)۔

بہ قسم یاد می فرمایند۔"

مُرتبِ رقعات مولانا نجیب اشرف اس کی تعبیر فرماتے ہیں۔ "آپ مجھے بُرا کیوں کہتے ہیں۔ کیا آپ اپنے بھائیوں خسرو اور پرویز کو بھول گئے۔ باوجودیکہ اُنھوں نے آپ کو کوئی گزند نہیں پہونچایا تھا مگر یاد کیجیے کہ آپ نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" [1]

خافی خاں، نظام الملک خود کو بچاتے ہوئے دوسرے کے حوالے سے لکھتے ہیں [2] "خسرو را کہ ہمراہ شاہزادہ شاہ جہاں دادہ بودند، بقول غیرت خاں مولفِ جہانگیر نامہ مسموم نمودند۔"

منشی الناشی لالہ سجان رائے فرماتے ہیں [3] کہ جلوس کے پندرھویں سال اُسی زندان غا میں خسرو نے ودیعتِ حیات سپرد کی۔ و "درزبانہا اُفتاد کہ بادشاہزادہ شاہ جہاں اورا آنچناں تنگ کرد کہ در زندان فنا گرفتار گشت۔"

تقریباً یہی قول اور یہی الفاظ منشی غلام حسین خاں صاحب سیر المتاخرین کے بھی ہیں۔ [4]

شمس العلماء آزاد دہلوی نے تحریر کیا ہے کہ [5] "۱۰۳۰ھ میں خسرو مر گیا۔ شاہجہاں مہم دکن پر رخصت ہوا تھا۔ وہ اگر باپ سے اس بدنصیب بھائی کی سفارش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اُس سے کہا۔ میں دیکھتا ہوں خسرو ہمیشہ آزردہ اور مکدر رہتا ہے اور کسی طرح اُس کا دل شگفتہ نہیں ہوتا۔ اُسے تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ اور جس طرح مناسب ہو حفاظت میں رکھو۔ وہ دکن میں بھائی کے ساتھ تھا کہ دفعتہً دردِ قولنج اُٹھا اور مر گیا۔ بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں رات کو اچھا بھلا سویا صبح دیکھو تو فرش پر مقتول پڑا ہے۔"

سر ولیم سلی مین کی روایت ہے [6] کہ "شاہزادہ ولیعہد کی ماں کے مار ڈالنے سے نورجہاں کو توقع تھی کہ اس طرح تخت خود بخود اُس کے آوردہ و متوسل [7] (شہریار) کے لئے خالی ہو جائے گا۔ خسرو کو وحشیانہ

---

[1] رقعاتِ عالمگیری، مطبوعہ دار المصنفین، جلد اول، صفحہ ۱۰۳، نمبر ۷۰۔ [2] منتخب اللباب، حصہ اول صفحہ ۲۲۵۔
[3] خلاصۃ التواریخ، صفحہ ۲۲۵ ہو قلمی۔ و صفحہ ۲۲۵ مطبوعہ ۱۳۲۳ھ۔ [4] صفحہ ۲۶۹ جلد اول۔ [5] دربار اکبری، صفحہ ۷۰۰۔ [6] سیاحت و تذکرے (ریمبلس اینڈ ری کلکشنس) جلد اول، صفحہ ۲۰۰۔ [7] داماد بھی تھا، پہلے شوہر سے لڑکی کا شوہر۔

طور پر بصارت سے محروم کرا دینے کے بعد مہربان باپ مہربان ہو گیا۔ اور خسرو کے ساتھ بڑی شفقت و مہر سے پیش آنے لگا تھا۔ لیکن جب خسرو کا بھائی شاہ جہاں جنوبی ہند کی گورنری پر مقرر ہوا تو اس نے اپنے بیچارے نابینا بھائی کی راحت و آسایش کے متعلق اپنی ناخاطر جمعی اور پریشان بالی کا نمایشی اظہار کیا۔ اندیشہ ظاہر کیا کہ دارالسلطنت میں اس کی فراغت و آرام کا اتنا خیال کون رکھے گا۔ اس لئے وہ خسرو کو لے کر اپنے صوبہ دکن چلا گیا اور وہاں اس کو قتل کرا دیا۔ کیونکہ یہی ایک صورت تھی جس میں وہ اپنے لئے یقینی طور پر تاج و تخت کو محفوظ سمجھتا تھا۔"

اس پر ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ اپنے نوٹ نمبر ایک میں صرف اسی قدر اضافہ کرتے ہیں کہ سالِ قتل ۱۰۳۱ھ[1] یعنی ۱۶۲۱-۲۲ تھا۔

مسٹر بین لکھتے ہیں کہ "سنہ ۱۶۲۵[2] (؟) میں ناعاقبت اندیش و بدنصیب خسرو مر گیا اور الہ آباد میں اپنی ماں کے برابر اسی باغ میں جو آج تک اس کے نام سے منسوب ہے، دفن ہوا۔ شاہ جہاں کے ولی عہد سلطنت ہو جانے کا اعلان (اگرچہ) ہو چکا تھا تاہم وہ اپنے سوتیلے بھائی کی موت کے شبہہ سے پاک نہیں رہا۔ البتہ یہ الزام کبھی اس کے خلاف ثابت نہیں ہوا۔ اور خود اس کے طریقِ عمل میں بھی کوئی ایسی بات پائی نہیں جاتی جس سے ایسی ستمگاری کی تہمت کا وہ سزاوار ہو۔"

اس طویل سلسلۂ نقل و حکایت اور روایت و درایت کو ڈاکٹر سٹینلے لین پول Lane-Poole کی اس تحریر پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ کہ "جہانگیر کا دوسرا بیٹا شاہ جہاں، خسرو کو ملکی معاملات میں انتہا درجہ کا پرخطر مقابل شمار کرتا تھا۔ جو بات کہ در اصل واقع ہوئی ہے کبھی بھی منکشف نہ ہو گی۔ البتہ جب شاہزادہ خورم دکن کو فتنہ و فساد کے استیصال کے لئے سنہ ۱۶۲۲ء میں گیا تو اصرار کر کے اپنے بڑے بھائی کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ بدنصیب خسرو وہیں مرا۔ کہا تو جاتا ہے کہ بخار سے۔ مگر مشرق میں بعض اوقات ایسے بخار نہایت ٹھیک وقت پر آ جاتے ہیں۔"[3]

---

[1] سیاحت و تذکرے (ریبلس اینڈری کلکشن)، جلد اول، صفحہ ۳۰۰۔ [2] کین کی مغل امپائر، صفحہ ۱۰۸، نوٹ ۱۱۸ و ۱۰۹۔
[3] قرونِ وسطیٰ کا ہندوستان تحتِ حکومتِ مسلمانان، صفحہ ۳۲۱۔

اس کا باعث خواہ سیاسی ہو یا کچھ اور مصلحتیں رہی ہوں یا شاہجہاں کی ذاتی کاوش و تنگ اندیشی یا میدانِ جنگ اور جدال و قتال کی ہنگامی ضرورتیں لیکن غالباً خطیرہ (کانفیڈنشل) اطلاعات کے پہونچنے اور چند در چند شبہات کے پیدا ہونے پر چند ماہ کے بعد قبر کھولی گئی[1] اور مئی ۱۶۳۲ء میں بادشاہ کے حکم سے [illegible] لاش نکالی اور دار السلطنت آگرہ کو روانہ کی گئی[2] آگرہ میں ۲۰ جون ۱۶۳۲ء کو پہنچی[3] وہاں سے اکبرآباد لائی گئی[4]۔ اور بالآخر خلد آباد کے باغ میں اپنی مادرِ گرامی نژاد کے قریب اُس کے پہلو میں دفن کر دی گئی۔ یہ دولت شاہی کے عروج اور زر پاشیوں کا وقت تھا۔ راستہ[5] میں جنازہ جہاں جہاں سے گزرا اور جن جن مقامات پر اُتارا گیا مختلف قسم کی یادگاریں قائم ہوتی گئیں۔ [illegible] کہیں چھوٹے چھوٹے باغ لگا دیے گئے کہیں کہیں مقبروں کی وضع کی خانقاہیں اور مسافر خانے بنائے گئے

وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جس طرف گزری زمیں پکار اُٹھی قابلِ مزار ہوں میں

ایک یوروپین سیاح فرنچسکا پیلسور صاحب Francisco Pelsart اپنے سفرنامہ ۱۶۲۶ء کے احوال میں لکھتے ہیں[6] کہ ان مقامات پر فقیروں کی ایک کثیر تعداد متصرف و دخیل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ مُرقد، مجاور یا خادم زود اعتقاد عوام الناس کو یقین دلا دیتے ہیں کہ خداوندِ عالم و عالمیان نے عالمِ رویا میں ہم کو ایسا حکم دیا ہے کہ جو لوگ تم سے صلاح و مشورے کے طالب ہوں اُن کو نجات و جنت کی بشارت دیتے رہو۔ اس طریقہ و ریاضت سے ان اشخاص کو کثیر رقمیں اور نقد و جنس خوب وصول ہو جاتا تھا[7]"

میں اس کی لاش امانتاً دفن کر دی گئی تھی۔ پھر چھ سات مہینے بعد اکبرآباد منتقل ہوئی۔ (ڈنکن صاحب کی گائڈ بک صفحہ ۱۲۶۔ اور شیخ معین الدین کی تاریخ تاج، صفحات ۱۰ و ۱۱۔ بادشاہ نامہ عبد الحمید لاہوری، جلد اول، صفحات ۴۰۲ و ۴۰۳ و تاریخ آگرہ از مولوی سعید احمد، ص ۱۳۹ و مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۰۲ خسرو کے ہلاک کرا دینے کے کچھ ہی زمانہ بعد اسی موقع پر بیگم کا ناگہاں مرنا شاہجہاں کا مکافاتِ عمل تھا یا شاید قدرت کا انتقام۔ [2] تاریخ جہانگیر از پروفیسر بینی پرشاد، صفحہ ۳۳۴۔

[3] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۳۴ بحوالہ نکوس یا مجمع وغیرہ۔ [4] ایضاً صفحہ ۳۳۴ بحوالہ [illegible]۔ [5] ایضاً صفحہ ۳۳۵ بحوالہ پیٹر منڈی۔

[6] پیٹر منڈی، جلد دوم، صفحہ ۱۸۱۔ [7] ترجمہ صفحہ ۱۵۔ [8] بادشاہ نامہ (جلد اول صفحات ۴۰۳ و ۴۰۴) سے پایا جاتا ہے کہ ممتاز محل کی نعش جس وقت برہانپور سے چلی تھی آگرہ تک برابر اسی طرح خیرات ہوتی آئی تھی اور فقرا و مساکین کو کثیر مقدار میں نقد و جنس تقسیم و مرحمت ہوتا آیا تھا۔ تاریخ تاج، صفحہ ۱۳

برہان پور والی قبر سے نعش نکالنے کے کچھ شواہد واسناد اور بھی ہیں۔

Nicholas Bangham and نکولا بانگھم اور جسٹی مین آف لے Justiman offley

نے ۹ مئی ۱۶۲۲ء کو برہان پور سے سورت فیکٹری کو رپورٹ کی تھی[۱] کہ سلطان خسرو کو قبر سے نکالا ہے۔

دہلی لے جاتے ہیں۔ بادشاہ کا حکم ایسا ہی آیا ہے۔

قاتل اترے دامن پہ مرے خون کے دھبّے — کچھ اور بھی خنجر سے چھٹنے نہیں لگے ہیں

پروفیسر بینی پرشاد کا خیال ہے اور یقیناً صحیح خیال ہے کہ آگرہ کی بجائے دہلی سہو کتابت یا لغزش قلم سے نکل گیا ہے[۲]۔ پیٹر منڈی صاحب Peter Mundy کا بھی یہی بیان[۳] ہے کہ خسرو کی لاش برہان پور سے آگرہ لائی گئی تھی۔ اس کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ آگرہ کے کارکن رابرٹ ہیوز صاحب Robert Hughes نے اس تاریخ (۹ مئی ۱۶۲۲ء) کو سورت فیکٹری[۴] کو تحریر کیا تھا کہ آج سلطان خسرو کا تابوت برہان پور سے یہاں آیا ہے۔ کل الہ آباد چلا جائے گا۔ وہاں اپنی ماں کے قریب دفن ہوگا[۵]۔ منڈی صاحب بظاہر ایک بیہودہ و لغو سی روایت بھی نقل کرتے ہیں کہ "خسرو فی الواقع آگرہ میں پیوند زمین کر دیا گیا تھا۔ لوگ اس کی حرمت و پرستش ولی و شہید کی طرح کرنے لگے تھے۔ نور محل جو اس سے زندگی بھر نفرت و عناد رکھتی رہی، کیسے ضبط و برداشت کر سکتی تھی کہ مرنے کے بعد خسرو کا یہ ادب و احترام ملحوظ رکھا جائے۔ اس نے بادشاہ سے پھر اس طرح منت و سماجت کی کہ وہاں سے بھی ہٹا کر 'مردہ آباد' یا 'کزر و آباد' Corpoabad یا حقیقۃً الہ آباد اس کو منتقل کر دینا پڑا[۶]"۔

اس قول کی تائید یا تصدیق کسی اور اہل قلم سے نہیں ہوتی۔ یہ تسلیم ہے کہ اس واقعہ سے گیارہ بارہ برس پیشتر نورجہاں (۱۰۱۹ھ مطابق ۱۶۱۱ء میں) شبستان جہانگیری میں داخل ہو چکی تھی اور بادشاہ پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا ابھی یہ واقعات تازہ تھے اور مقبرہ کی تعمیر کو دس برس بھی گزرے ہوں گے کہ پیٹر منڈی صاحب ۱۶۳۲ء میں

---

[۱] ہندوستان کی انگریزی کوٹھیاں، بابت ۱۶۲۲ء - ۱۶۲۳ء، صفحہ ۸۔ [۲] تاریخ جہانگیر، ۳۳۹۔ [۳] سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحہ ۸۔

[۴] انگریزوں کی تجارتی کوٹھی سب سے پہلے ہیں سورت میں ۱۶۱۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے پانچ سات برس بعد آگرہ ۱۶۲۰ء میں۔ سفرنامہ پیٹرو ڈیلا ویلے، صفحہ ۱۸ (نوٹ)۔ [۵] انگریزی فیکٹریاں، بابت ۱۶۲۲ - ۱۶۲۳، صفحہ ۹۔ [۶] جلد دوم، صفحات ۱۰۵، ۱۰۶۔

یہاں (الہ آباد) آئے اور مقبرہ دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ "چوٹی کے قریب لکڑی کا کٹہرہ یا جنگلا لگا ہے۔ اس میں سچے موتیوں کی سیپیوں سے ترصیع (جڑائی) کا کام کیا گیا ہے۔ اس میں مخملی زرکار شامیانہ (کپناپی) سایہ گستر ہے۔ سر پر شاہزادہ کی دستار ہے۔ پہلو میں مصحف (قرآن مجید) رکھا ہے۔ خوش عقیدہ سیاح کا بیان ہے کہ "اسکے قتل کے لئے جس وقت لوگ اسکے سر پر پہنچے ہیں تو خسرو اپنی شریعت کی اسی کتاب کو پڑھ رہا تھا۔"[1]

لیکن آج کیا حالت ہے۔ ڈاکٹر مسیبی پرشاد لکھتے ہیں[2] "کہ دیکھنے والا وہاں پہنچ کر صرف ایک بڑی سی سادہ قبر پاتا ہے۔ آپ بھی جائیں اور درد انگیز و رقت خیز فارسی کتبہ کو پڑھ لیں" یا اتنا انتظار فرمائیں کہ آگے چلکر مقبول بیچد ان کا قلم مساعدت کرے اور انھیں ناچیز صفحات پر مقبرہ کا ایک دھندلا سا خاکہ کھینچ سکے۔

بدنصیب خسرو اور اس کی قبر کا ادنیٰ احترام کرنے والا اب کون ہو سکتا ہے۔ اس کا ماتم کرنے والی اسکے باپ دادا کی سلطنت مدت ہوئی مٹ چکی۔[3] ان کے قصر و ایوان صفحۂ ہستی سے یکقلم معدوم و نابید ہو چکے۔ کچھ پرانی یادگاریں باقی ہیں تو صرف مشائخ و فقرا کی۔ جن کی عظمت و استحکام کو بھی زمانہ کا زبردست ہاتھ رفتہ رفتہ مٹا رہا ہے

اب خاک پہ ہیں کل تخت پہ تھے اک زیست کی حالت وہ بھی تھی
اللہ کی قدرت یہ بھی ہے اللہ کی قدرت وہ بھی تھی

جلد باز انسان کا قلم اس قدر جلد کہاں سے کہاں پہونچا۔ کہنا یہ تھا کہ جہانگیر اور اس کے بیٹے پوتے کا زمانہ جسکو مورخ دولت مغلیہ کے شباب کا وقت بتاتے ہیں دیگر اسلامی مزارات و مقابر کی طرح مقابر خسرو باغ

---

[1] سیاحت نامہ جلد دوم صفحہ ۱۰۱۔ [2] تاریخ جہانگیر صفحہ ۲۲۲۔ [3] ۲۰ شعبان ۱۲۷۳ھ (۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء) کو سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہونا سمجھا جاتا ہے جو دہلی پر برٹش گورنمنٹ کے قبضہ اور بہادر شاہ کی معزولی کی تاریخ ہے۔ مسٹر رچارڈ برن Richard Burn See کے حساب سے ۱۵۲۶ء سے ۱۸۰۳ء تک یعنی ۲۷۷ سال کے قریب بابر کی اولاد ہندوستان میں حکمراں رہی ہے۔ میرے نزدیک شاہزادہ خسرو کے سال انتقال ۱۰۳۱ھ سے صرف ۲۰ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ (۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء) تک شمار کرنا مناسب ہے۔ جس روز محمد شاہ دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ اسکے بعد کے بادشاہ تو محض بے اختیار اور شطرنج کے بادشاہ تھے۔ خود الہ آباد میں شاہ عالم کا قیام دس گیارہ برس رہا ہے۔ مگر وہ حقیقتاً انگریزوں کا وظیفہ خوار اور کرنیل اسمتھ کی قید و بند میں (قلعہ میں) گرفتار تھا۔ شاہ عالم ۱۱۸۵ھ یعنی ۱۷۷۱ء میں الہ آباد سے دہلی روانہ ہوا۔ البتہ خود شاعر اور شعرا اور اہل کمال کا بڑا مربی و قدر شناس تھا۔

کے لیے بھی اچھا گزرا۔ چمن کی گلکاریاں اور پھولوں کی روشیں صدیوں بعد کیا رہ سکتی ہیں۔ ہم بھی تو سمجھتے تھے کہ شاہزادہ ایک خیابانِ دلکش یا ہشتِ برین کے ٹکڑے میں دفن ہے۔ اُس کی یہ آرزو کہ

لطف آتے اسیری میں اے کاش قفس اپنا   پھولوں سے لدا ہوتا پھولوں سے بھرا ہوتا

بعد مرگ پوری ہو گئی ہیں کی حسرت ہے در حسرت۔ اس ازلی حرماں نصیب کی تربت اس سے بھی محروم ہے۔ نہ وہاں پھولوں کی چادر ہے نہ کلیوں کا ہار۔ بے درد سنگدل انسانوں کی مجوزہ ترتیب و تنظیم کے ساتھ دو ہی پتھروں کا ڈھیر ہے اور بس۔

اس دستور کی مذہباً اصلیت و صحت سے بحث نہیں لیکن معمولاً ممتاز مسلمانوں کی قبر پر خواہ وہ امتیاز کسی گروہ و ملت کے پیشوا ہونے کی حیثیت سے حاصل ہو خواہ دنیوی وجاہت و مرتبت سے، دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک روشنی دوسری خوشبو۔ مقبرے کے چبوترہ پر پہونچتے ہی زائر و متزاور کی نظر ایک سفید نویس سیاہ تختہ اور منجملہ اُس کی متعدد ہدایات احترامی و انتظامی مجریہ دستخطی حاکم ضلع کے، پہلے ہی تحریر پر پڑتی ہے جس کے رو سے دیواروں کے طاقوں پر چراغ جلانے کی ممانعت ہے۔ رہی خوشبو۔ اگر کی بتیوں اور عطر و عنبر کے مرکبات کی بحث میں غالباً کوئی مد نہیں۔ پھولوں کا سلسلہ یوں قطع ہو چکا۔

پھول کیسے مرشوں کی قبر پر   خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

کچھ اوپر سو برس ہوئے۔ اس کی گئی گزری حالت میں بشپ ہیبر Bishop Heber الٰہ آباد آئے تھے۔ انہوں نے جور و جفا کے مظلوم و بے زبان فریادی یا بڑی حوصلہ مندی و بلند ہمتی کے شکار خسرو کی قبر کو دیکھا تھا۔ یہ عظیم المرتبت واجب التقدیس سیاح لکھتا ہے[1] کہ سرائے سے ملحق ایک [illegible] باغ ہے۔ جس میں عمدہ قسم کے آموں کے پُرانے درخت ہیں۔ جس میں تین خوبصورت مقبرے ہیں۔ دو تو دو شاہزادوں پر اور ایک ایک شاہزادی پر بنائے گئے ہیں جو شہنشاہی خاندان کے تھے۔ یہ بڑے بڑے بلند چبوتروں پر بنے ہیں۔ ان کے نیچے تہ خانے ہیں۔ بیچ والے میں عمدہ منقش کام کیا ہے۔ قبر پتھر کی تابوت کی طرح ہے۔ اس پر ایک نہایت بلند مدوّر (گول) کمرہ سا بنا ہے۔ اس پر ایک گنبد سایہ کیے ہے۔

---

[1] ہیبر صاحب کا جرنل، جلد اول، صفحہ ۲۴۳۔

جس کے اندر نہایت خوب و عمدہ رنگ آمیزی کی گئی ہے۔ باہر کی طرف اس سے بھی زیادہ خوشنا غاشی ہے۔ یہ سب نہایت پاکیزہ و سنجیدہ اور دل پر اثر ڈالنے والے ہیں۔ پر تکلف ہے مگر گل و گلزار یا زیبائشی و نمایشی نہیں۔ یہ خیال جو عام طور پر انگلستان میں پھیلا ہوا ہے کہ مشرقی تعمیرات وحشیانہ اور بد مذاقی کا نمونہ ہوتی ہیں' ان کو دیکھ کر غلط اور بالکل جھوٹ ثابت ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر بینی پرشاد اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ پورب طرف کو بالکل اس موقع کے قریب جہاں ریلوے کا وارورک کا کارخانہ ہے اور پانی صاف کرنے کے حوض بنے ہیں وہ خاص اور اس باغ کی تمام عمارتوں میں سب سے زیادہ شاندار سلطان خسرو کا مقبرہ ہے[1]

ان عمارات میں سے داہنی طرف کو پہلی بالکل خیز پورب جانب خسرو کی دائی خوابگاہ ہے۔ اور اس سے ہٹ کے اسی قدر کہنا ہے کہ مقبرہ سنگین و مستحکم گنبد دار ہے اس پر نہایت خوب نقش و نگار ہیں۔

قطعۂ تاریخ وفات روضہ کے اندر گنبد کے قریب حاشیہ کے دور میں تحریر ہے۔

آہ۔ افسوس آسماں را سیرت بیداد شد	آرے آرے کار چوں بر ظلم آمد داد شد
زندگی زد خیمہ بیروں از دیار خسرمی	بید چوں بنیاد عالم را خراب آباد شد
اہل دولت باش اندر آگاہ از فلک کا سدت و	ہر کجا زد شعلہ خاکسترش برباد شد
گلبنے ہر جا کہ بینی برگ ریز اندر پے ست	بلبل ایں باغ بودن مصلحت از یاد شد
گلعذارے اطراوت چیست کاخر خار مرگ	از پے چاک قبا صد سوزن فولاد شد
چوں طلب دارم حدیثے را کہ می سوز دبادہ	مشکل است ما جہاں تا ہست ایں معتاد شد
آں گلِ رعنا کہ بود آرائے گلشن صد دریغ	عندلیباں را رنگ و بوئے او دل شاد شد
چاک پیراہن شد از خار تنفادر باغ عمر	بر زمیں گریست ہم از آسماں فریاد شد
شد قبا بر قامتِ مردم قبا در ماتمش	شاہ خسرو را بسوئے خلد چوں ارشاد شد
آں تنِ نازک کہ بر وے بود پیراہن گراں	در تہِ خاک جفا افسوس ستمداد شد

---

[1] تاریخ جہانگیر صفحہ ۲۲۲۔

شد غریقِ رحمتِ حق چوں ولی پاک بود | خاصِ درگاہِ خدا و ہمدم اوتاد شد
سلی از شدسال فوتش "فیض لایق" باز گو | مُعطرِ جنت ز جانِ پاک او آباد شد

کتبہ سلطان سرہندی

مسٹر ایلیٹ وک، مسٹر بیل اور مسٹر ہوریج نے اس قطعہ کو نقل کرکے ہندوستان کی تاریخ پر احسان کیا ہے۔ ورنہ یہ وہ جرم تھا جس کے ارتکاب سے ہمارے فارسی مورخ محترز و گریزاں رہے تھے۔ ممکن تھا کہ خسرو کی ہمدردی و ماتم پر جہانگیر و شاہ جہاں کے عہد میں کچھ دار و گیر ہو جاتی، لیکن ان کے بعد پوچھنے والا کون تھا۔ رہا اورنگ زیب۔ اُس نے تو خود خسرو اور اپنے دوسرے چچا پرویز کی بیگناہی اور اپنے باپ کی چشمِ عنایت کا ذکر ایک رقعہ میں کیا ہے۔[1] مسٹر ہوریج نے اپنے ہم زبان دوستوں کی سہولت اور سمجھنے کے لئے اس قطعہ کا ترجمہ بھی کر دیا، و بعض اشعار و الفاظ پر حاشیہ (حسب ذیل نوٹ) لکھا ہے۔[2]

"۱۔ خرمی کے لفظ سے مسٹر برن خیال کرتے ہیں کہ یہ شاہ جہاں کی طرف اشارہ ہے، جس کا نام خورم تھا۔[3]

۲۔ شاید لفظ خسرو کی تلمیح ہے جس کے معنی آفتاب کے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو Cyrus کہا جاتا ہے۔

۳۔ بیل صاحب بجائے "اہل و اَباش" کے "اہل و اُوباش" لکھتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو معنی ہوں گے "لوگ عام طور پر"۔

۱؎ رقعات عالمگیر، جلد اول، صفحہ ۲۲۲۔ نمبر ۲۰۰۔ مطبوعہ دار المصنفین۔ ۲؎ جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن۔ جولائی ۱۹۰۰ء۔ صفحہ ۵۰۶۔ ۳؎ ان صاحبوں کی ذہانت، بلند نظری و نکتہ سنجی اس سے بھی زیادہ قابل احترام ہے۔ مولوی ذکاء اللہ اپنی تاریخ ہندوستان جلد ہفتم میں سلطان خورم کی ولادت کے سلسلہ میں نقل فرماتے ہیں کہ "وہ صاحب نے اس مادہ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ غالباً اصل میں وہ 'کورم' تھا جس کے معنی کچھوے کے ہیں۔ جو اس کی رجپوتنی ماں کی قوم کا نام تھا۔ یہ قیاس اس سبب سے درست نہیں معلوم ہوتا کہ مسلمانوں میں بیٹے کے نام میں ماں کی قوم کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ باپ دادا کا نام رکھا کرتے ہیں۔"

۴۔ اوتاد "نواّ خیمے کی کھونٹیاں. props

۵۔ "سلمےٰ" محبوب کے لئے ایک عام لفظ ہے اور شاید یہاں انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایسٹ وک صاحب اس کے معنی لیتے ہیں Askst thou ۔ تاریخ فیض لائق سے ۱۰۳۱ھ (۱۶۲۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ مصرع اخیر سے بھی یہی پایا جاتا ہے۔ خسرو ۲۴ امرداد ۹۹۵ یعنی ۴ اگست ۱۵۸۷ کو پیدا ہوا تھا۔ اور آخر جنوری ۱۶۲۲ میں فوت ہوا۔ مرنے کے وقت اس کی عمر ساڑھے چونتیس (۳۴½) سال رہی ہوگی۔ اس کی پیدایش کا تذکرہ اکبرنامہ جلد سوم میں صفحہ ۵۲۳ پر ہے۔"

مسٹر بیوریج کا علم و فضل مسلم ہے۔ میرے دل میں اُن کی بڑی عزت و وقعت ہے۔ مرحوم نے بھی اپنے ترجمۂ مآثر الامرا میں اس ناچیز کو یاد کیا ہے[1]۔ تاہم اظہار حقیقت پر مجبور ہوں کہ اُن کی بعض شرحیں تحقیقِ لفظی، باریک بینی یا نکتہ وری سے زیادہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے تسلیم ہے کہ متعدد مطبوعہ و قلمی، متداول نیز کمیاب تذکروں کی ورق گردانی سے اُس عہد کے کسی شاعر کا نام سلمی نہیں ملتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ عرب و عجم میں یہ کلمہ ہر معشوقہ کے لئے "فرضی ہو یا حقیقی" مستعمل ہوتا ہے۔ لیکن سلمے کی موشگافی کرکے "سل ما" Askst thou "اسئل انت" کہنا کسی ترکیب سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ سل بمعنی اسئل ضرور ہے اور قرآن حمید میں بھی آیا ہے۔ لیکن مے یا ما کے معنی کیا ہوں گے؟ ان کا خیال صحیح ہو یا غلط، مگر ان کی کوشش و تلاش قابلِ تحسین ضرور ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس کتبہ کی آج بھی وہی حالت ہے جو مسٹر بیل نے تقریباً ایک صدی اور مسٹر ڈیو ہرسٹ نے چہارم صدی پیشتر دیکھی تھی۔ ڈیو ہرسٹ صاحب ہمارے صوبہ کے نامور سویلین (اور وظیفہ یاب تقاعد) اور مشرقی زبانوں اور علوم کے فاضل متبحر تھے۔ پچیس چھبیس برس پہلے تعلقات حکومت کے سلسلہ میں الہ آباد وارد تھے تو یہاں کے کتبوں پر بھی توجہ فرمائی تھی۔ لکھتے ہیں کہ "خود خسرو کی قبر پر طویل قطعہ بار دیت

---

[1] جلد اول، صفحہ ۵۰۳، نٹ اوٹ بحوالہ ۱۹۰۸ء روزنامہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۳ء۔

کا ہے اور اچھی حالت میں ہے۔ بالکل صاف ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ البتہ چوتھی بیت کے شروع کے کچھ لفظ یعنی ''گلبنے ہر جا کہ'' بالکل مٹ گئے ہیں۔ اس کے سوا پورا کتابہ ٹھیک اور مکمل ہے۔[1] ممدوح نے وہ کتابت یا ٹائپ کی چند غلطیاں جو ہوریج صاحب کے مطبوعہ قطعہ (مشمولہ آرٹیکل) میں پائی جاتی تھیں، ظاہر کردی تھیں[2]۔ تیسری سطر کے پہلے مصرع کی تصحیح کردی تھی۔ پانچویں میں خار بجائے خاک درست کردیا تھا۔ اتفاق سے ۱۹۰۱ء میں شاعر کا نام "معلی" چھپ گیا تھا اس کو بھی ظاہر فرمادیا تھا۔ تیسر طریق املا یا بعض حروف کو ملا کر لکھنے پر توجہ دلائی تھی جو اُس وقت (عہد شاہی) میں رائج تھا اور اس کتبہ میں نمایاں ہے۔ مثلاً "عندلیبا نرا" بجائے "عندلیباں را" و "دلشاد" بجائے "دل شاد" و "لایق" بجائے "لائق"۔ کتبہ کی عبارت کا بجانب یعنی کعبہ کی طرف سے شروع کیا جانا' یہ بھی آپ ہی کی نظر دقیقہ رس کا ادراک اور نکتہ نواز قلم کا التماس تھا[3]۔

دو کلموں کو ملا کر لکھنے سے نسخ و نستعلیق میں خواہ کتنی ہی دلکشی و نظر فریبی پیدا ہو جاتی ہو، مگر پڑھتے وقت نگاہ کو الجھن ضرور ہوتی ہے۔ یہ آج کی بات نہیں۔ ایک صدی پیشتر مسٹر فرینسس بیلفور F.C. Balfour نے یہی شکایت کی تھی۔ انھوں نے جب ۱۸۳۰ء میں شیخ علی حزیں کے خود نوشت احوال کو مدون و مرتب کر کے لندن میں بڑے اہتمام سے فارسی ٹایپ میں چھپوا لیا تو ایک مستقل مقالہ انگریزی میں "اعلام" .Ad-vertisement کے نام سے لکھا تھا[4]۔ اور معذرت کی تھی کہ دو دو لفظوں کا ایک جا لکھنا (مثلاً آنشہر، یکسال، وغیرہ) فارسی کتابت اور قلمی کتابوں میں ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ جن کا جدا کرنا کسی شخص، خصوصاً اہل مطبع کے لئے دشواری سے خالی نہیں

---

[1] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۰۱ء، صفحہ ۷۳۰۔ [2] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۰۱ء صفحات ۷۲۶، و ۷۳۱۔ [3] جورنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۷۲۸۔

[4] صفحہ ۳۔

(۲)

مقبرۂ شاہزادۂ خسرو

مبدول حمدی
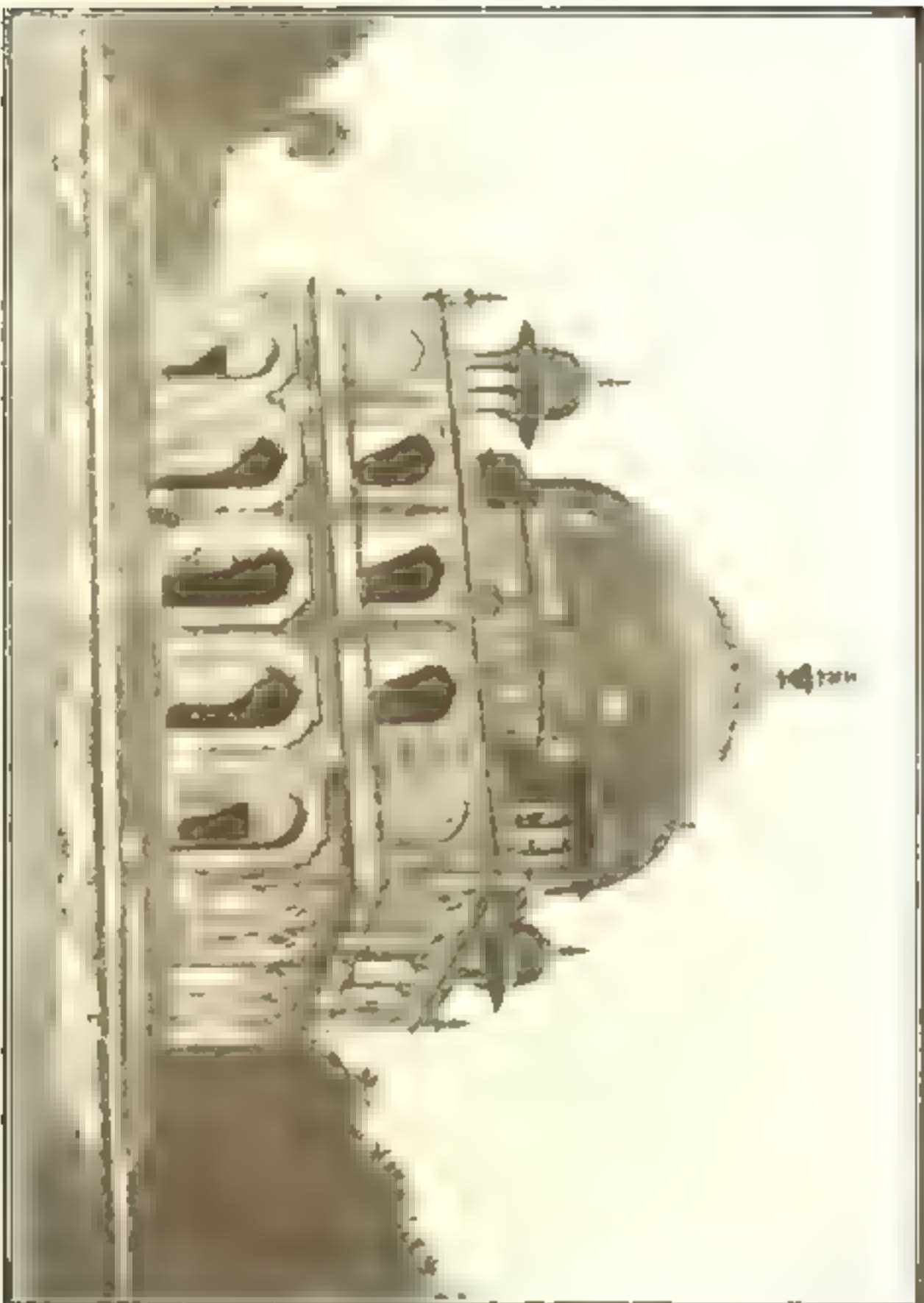
عمارت مقبرۂ خُسرو

سر جُھکا اے زندہ دل سیاحِ تُجّی کر نگاہ ... سامنے ہے بارگاہِ خُسروِ کیواں پناہ

یہ مقبرہ ایک کنارے پر واقع ہے۔ اُس کے بعد کوئی مقبرہ نہیں۔ لہٰذا اور کوئی چیز باغ کے صدر (جنوبی) دروازہ سے وہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی مستقل راستہ بھی نہیں بنایا گیا۔ آپ کیاریوں کے کنارے کنارے یا روشوں پر ہو کر نکل جائیے۔ "رہ راست برو اگرچہ دور است" پر عمل فرماتے ہوں تو پھاٹک سے سیدھے سڑک پر ہو کر شاہ بیگم کے روضے تک ۲۰۰ اقدام تشریف لے جائیں۔ اور وہاں سے مقبروں اور حوضوں کو دیکھتے ہوئے، خسرو کی قبر تک۔ یہ بھی کچھ دُور نہیں۔ مقبروں کے باہم درمیانی فاصلہ شرقاً غرباً تیس تیس قدم ہوگا۔ سیر و تفریح کا شائق، یا آثار قدیمہ کا دلدادہ چار سو قدم آسانی و خوشی سے طے کر لیتا ہے۔

مقبرہ ایک مرتفع پختہ (خشتی) چبوترہ پر بنا ہے جس کی بلندی ڈھائی فٹ (خسرو باغ کے باقی مقبروں سے ایک فٹ زائد) ہے۔ چڑھنے کے لئے پتھر کی تین سیڑھیاں موجود ہیں۔ چبوترہ مربع اور خوب وسیع و فراخ ہے، ہر ضلع اکیاس گز۔ اس چبوترہ پر پھر ایک اور چبوترہ بلند اور سنگین نقشدار (پتھروں کا) واقع ہے۔ یہ بھی چوکور ہے، ہر پہلو چھبیس گز۔ بلندی ایک گز کے قریب۔ مقبرہ کی عالیشان تعمیر اسی پر ہوئی ہے۔ سب ملا کر کرسی کی بلندی پونے دو گز سے بھی زیادہ ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ اصلی لحد حسب دستور عام خام اور سطح زمین پر تہ زمین یا تہ خانہ میں ہے۔ مقبرہ کے فرش بالائی سے نیچے یا اُس کے اندر پہنچنے کے لئے کبھی راستہ رکھا گیا تھا۔ اب مسدود ہے۔ قفسِ زندگی کے ہم جیسے زندانیوں کی رسائی وہاں تک دشوار ہے، اس لئے اُس کی صورت کُتبی یا موجودہ حالت کے بتانے سے معذور و قاصر ہوں۔

عمارت مقبرہ ایک منزل کی ہے۔ مگر دُور سے دو منزلہ معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ دروں اور محرابوں کی قطاریں جیسی اوپر ہیں ویسی ہی نیچے بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اوپر والے در وسعت اور بلندی دونوں میں اتنے اونچے نہیں ہیں، جتنے کہ نیچے والے ہیں۔ مگر دونوں قطاریں ایک ہی بنیاد پر قائم ہیں۔ ہر ضلع یا پہلو میں پانچ پانچ دروازے (ہر سمت) ہیں۔ بلند سادہ وضع کی محرابیں ہیں۔ دروں کی چوڑائی چھ چھ فٹ ہوگی۔ کناروں کے دو دو دروازوں میں زینہ

ہے - دوسرا اور چوتھا صرف کا بند ہے۔ طریق تعمیر اور محرابیں اور نشانات سب کے یکساں ہیں۔ محرابوں کے اندر
دیواروں میں طاق ہیں۔ ان کے پتھروں پر خط نستعلیق میں اُبھرے ہوئے حروف میں اسماء اللہ کندہ ہے۔ اسی طرح
زیر و بالا محرابوں پر مستطیل حاشیوں کے دونوں جانب کلمہ طیبہ خوبصورت دائروں کے اندر کندہ ہے۔ گنبدِ مقبرہ کے چاروں
سمت نیچے والی محرابوں کے اوپر بڑے بڑے طاقچے ہیں۔ ان پر پتھر کی جالیاں اندر کی طرف پیوستہ ہیں۔ آپ
اُن کو ایک قسم کی گیلری تجویز کر سکتے ہیں۔

سامنے کے رُخ دوسرے چبوترہ پر چڑھنے سے داخلے کے دروازہ کے آس پاس آخری کی دونوں محرابوں
میں اوپر جانے کے لیے آمنے سامنے زینے ملیں گے۔ سیڑھیوں کی تعداد اُنیس ہے۔ ایک خوش خیال
مسلمان کا قیاس ہے کہ حروف بسم اللہ کی رعایت سے یہ عدد فرد (۱۹) اختیار کیا گیا ہوگا۔ حفاظت و نگہداشت کے
لیے ان زینوں میں کواڑ لگا دیے گئے ہیں۔ نیچے شروع میں صرف پتھر کی چوکھٹ بازو ہے، اوپر پہنچ کر زینے کے ختم پر
دروازے میں کواڑ ہیں کھولنے پر ایک چھوٹی سی مسطح جگہ اور اُس کے بعد ایک قسم کی تنگ کنگنی (کارنس) ملتی
ہے۔ کسی وقت لوگ باحتیاط کھسک کھسک کر محرابوں میں آجاتے تھے اور محرابوں کے پاس سے جو گھومتا ہوا
زینہ اوپر گیا ہے، اُس پر چڑھ جاتے تھے۔ یہ مرحلہ خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لیے کواڑ اب بند رہتے ہیں۔ اس انسداد
میں ایک مصلحت ظاہری مزار کی حرمت و تعظیم بھی کارفرما ہے۔

چھت کے چاروں کونوں پر نہایت مختصر بلکہ برائے نام منارے ہیں۔ گوشے خالی نہیں چھوڑے۔ لوہے کی
سیخوں پر مختلف چڑھاؤ اُتار کے کلس پہنا کر ایک مخروطی شکل و ہیئت پیدا کر دی گئی ہے۔ اُس سے کچھ ہٹ کر
گنبد کے متصل (دونوں کے وسط میں) ایک ایک گلدستہ بنا ہے۔ اس کو بعض معمار گومٹی اور انگریز انجینیر اوسکا
(Kiosk ترکی میں کوشک) کہتے ہیں۔ یہ چاروں شاہ بانو کے روضے کے گلدستوں سے بڑے ہیں۔
یہ ضرور خوشنما اور شرقی تکلفات تعمیر کے علمبردار و یادگار ہیں۔ ہلکے پھلکے چھوٹے چھوٹے آٹھ آٹھ ستونوں پر چھجے
کے لیے پتھر لگا کر بقدر مناسب باہر نکال کر، اوپر ایک خوبصورت گول قبہ بنا دیا ہے۔ کم و بیش گولائی، اونچائی
اور مختلف وضع کے کلس اس کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ یہ ایک ہوادار خوبصورت نشیمن ہے مگر وہاں تک
پہنچ پانا کچھ لطف اٹھانا دشواری و نزاکت سے خالی نہیں۔

مقبرہ پر ایک بہت بڑا گنبد سایہ افگن ہے اور قبر کے پورے دور پر محیط ہے۔ یہ عظیم الرفعت بُرج سقفِ عمارت کے وسط یا ضخیم دیوار کے اندر والے حصہ پر سے اٹھایا گیا ہے، جس سے نہ صرف عمارت میں حسن پیدا ہو گیا، بلکہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور اس مقبرہ کو خسرو باغ کی تمام تعمیرات سے ممتاز و شاندار بنا رہا ہے جسب معمول اس پر بھاری بھاری اُلٹے پتے بنے ہیں۔ چوٹی پر کلس ہے۔

عمارت تمام و کمال سنگ سُرخ کی ہے۔ اس نے ساتھ سنگ کھٹو یعنی زرد رنگ کے مرمریں پتھروں کا استعمال و اشتمال ایک خاص کیفیت و لطف پیدا کرتا ہے۔ جالیاں سب لال پتھر کی ہیں۔ ان کا قدرتی رنگ چونے کی سفید قلعی سے اب بے رونق و بدزیب ہو گیا ہے۔ اندر چونے اور گچ کی استرکاری ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ایسی سنگ تراشی و نقاشی کے نمونے الہ آباد کی بعض پرانی مساجد اور خانقاہوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی بے نظیر چیز نہیں۔ دیوار کی چوڑائی محسوس ہوتا نہ تھی چودہ فٹ ہوگی۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں، جہانگیر کے مقبرہ واقع شاہدرہ (لاہور) کی دیواروں کا آثار پانچ گز سے کم نہیں پایا جاتا۔ مقبرہ میں داخل ہونے کے لئے ہر طرف صرف ایک ایک دروازہ رہا کا کھلا رکھا گیا ہے، باقی دروازے سنگی خوشنما پھولوں اور خانہ دار جالیوں سے بند ہیں۔ فی الحال صرف دکھن رُخ کا بیچ والا دروازہ قبر تک آنے جانے کے واسطے نامزد ہے۔ باقی سمتوں کے مقفل رہتے ہیں۔ چوکھٹ بازو پتھر کے ہیں، اور کواڑ لکڑی کے ہندوستانی طرز کے مگر معمول سے کسی قدر زیادہ خوش وضع کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔ تقریباً مربع ہیں، بعض حصوں پر کہنگی اور دیرینہ سالی نمودار ہے۔ پچھم والا یقیناً تبدیل کر کے نیا لگایا گیا ہے اس میں بھی اصلی نمونے کی پابندی کی گئی ہے۔ مجموعی حیثیت سے بنا نہیں قرار دے جا سکتے۔ سُرخ اکھی رنگ پھیرا ہے۔

اسی جنوبی (وسطی) دروازے کے اوپر محراب کے اندر دو پریاں بنی ہیں۔ رنگین ہیں۔ بظاہر اُس وقت کا درباری لباس زیب تن ہے۔ ایک کی شبیہ پوری پوری ہے۔ جو اُڑ رہی ہے یا آمادہ پرواز ہے۔ اور کتاب کی سی کوئی چیز ہاتھ میں لئے ہے۔ دوسری کا صرف چہرہ اور پر بنے ہیں۔ یہ تصویریں کسی اور دروازہ پر نہیں ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ جابکدست مصور یا نقاش نے اس وقت کی تصویر کھینچی ہے کہ جس وقت (حسب روایت بیگم سلطان صاحب) ملک الموت نازل ہوا تھا اور شہزادہ قرآن پڑھ رہا تھا۔ فرشتہ کی صورت اہلِ ہنر پریوں سے مشابہ بناتے ہیں۔ ہاتھ کی کتاب سے خدا کی کتاب مراد ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دست کا فرشتہ نذر و نیاز درود و سلام کا پیشکش

ہاتھ میں لے کر ایصالِ ثواب کی اجازت لینے عالمِ بالا کو جا رہا ہے۔ کسی ممتاز مسلمان کی گور پر تصویر کا بنایا جانا ایک نئی اور تعجب خیز بات ہے۔ مگر یہاں تو وہی ع ۔ سرِ مزار مجاور بھی نوحہ گر بھی ہے۔

حجرۂ قبر اندر کی جانب کچھ بلندی تک جہاں محرابیں ختم ہوتی ہیں، چوکور بنا ہے۔ جہاں سے گنبد کا دور دورہ شروع ہوتا ہے، گول ہوتا گیا ہے۔ چھت بھی خوب بلند ہے۔ اس کے نقطۂ علو کے گرد ایک دائرہ اور اُس دائرہ کی ہر طرف ہشت پہل اُبھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے، اور ملاتے ہوئے دائرے، اور پھر دائرہ بناتے ہوئے رنگین پھول ہیں۔ اُنھیں سے متصل اُبھرے ہوئے مثلث اور قوسیں اور پھول بھی بنتے چلے گئے ہیں۔ یہ مثلثوں، قوسوں، اور دائروں کا ''کاتار سلسلہ ایسا ملا جلا چلا آتا ہے، جیسے کوئی پھولوں کا جال در جال اوپر سے نیچے تک بچھا ہو۔ اس جال در جال اور پیچ دار کام کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کام کو اصطلاحِ عمارت میں ''غالب'' کہتے ہیں جو حقیقۃً تمام تکلفات اور صنعتوں پر غالب ہے۔ حسرت ہے اور افسوس کہ ناواقفیتِ فن و عدمِ ذہانت و مہارت کے باعث سے میرا قلم اس چیز کی صحیح صورت کشی سے عاجز ہے، اور اس طلسمِ رنگیں کو محض ایک گورکھ دھندا بنا کر چھوڑنا چاہتا ہے ورنہ اہلِ نظر کا فتویٰ ہے کہ یہ کام اور یہ رنگ آمیزی مغلوں کے عہدِ زریں کی پینٹنگ اور نگار بندی کی بہترین یادگار ہے، اور الٰہ آباد کے لئے مایۂ ناز۔

اس کارنامۂ رنگ و جمال کے نیچے گرد محرابوں کے اوپر چاروں سمت اشعار لکھے ہیں یہی تاریخ کا پورا قطعہ گردے میں سیاہی سے مرقوم ہے۔ مقبرہ کے اندر اُس حصّہ پر جو مربع ہے، طاقوں پر ''اللہ اللہ'' اور محرابوں کے دونوں جانب خوشخط نستعلیق میں کلمۂ طیبہ لکھا ہے (کندہ نہیں ہے)۔ در و دیوار پر چاروں طرف پھول پتے بنے ہیں۔ محرابوں اور طاقوں کے گرد کے بیل بوٹے بالخصوص دلآویز ہیں۔ سرو و شمشاد کے جھاڑ بھی ہیں۔ یہ تمام نقش و نگار پختہ شوخ رنگ، مصالحوں سے بنائے گئے تھے۔ یہاں پچی کاری نہ ہو سکی تھی تو وہ کمی مضبوط رنگ و روغن و چینی گری اور کمالِ فن سے پوری کر دی گئی تھی۔ دست بردِ زمانہ سے اب یہ بھی مٹتے جا رہے ہیں۔ مرمت میں عمارت کے حفظ و بقا کا انتظام کیا جاتا ہے۔ نقوش اور گلکاریوں کے قائم اور برقرار رکھنے کا التزام مد نظر نہیں رہتا۔ اسی طرح طاقوں پر جو کچھ کام تھا یا تکلفات تھے، ان کو صدیوں کے لشندا داور پتاتیں کے اندھیرے نے تقریباً محو و معدوم کر دیا ہے۔

مولوی سعید احمد فرماتے ہیں کہ "جہانگیری دَور کی عمارات کی آرائشوں میں صراحی اور پیالے کا عام طور سے استعمال کیا گیا ہے"۔[1] میں نے ان دونوں کو اس عمارت میں خاص کر تلاش کیا۔ صراحیاں اور گلدان تو بہت سے پائے گئے۔ پیالہ کی صورت یا اُس کے مشابہ کوئی چیز نظر نہیں آئی۔

سلطان خسرو کی قبر عرف عام میں اُس کی بے گناہی اور خونِ ناحق کے سبب سے بادشاہ درویش کہلاتی ہے۔ مسٹر فنچ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں[2] کہ "سلطان بادشاہوں کی قبریں عام طور پر متبرک مانی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا بڑا ادب و احترام کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی نسل کا یہ ایک طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں کو پیوند خاک ہو جانے کے بعد بھی یاد رکھتے اور بڑے خلوص و وفا کے ساتھ اظہار تعظیم و طاعت کرتے ہیں"۔ تربت سوا تین فٹ بلند چبوترہ پر واقع ہے۔ جس کا طول و عرض یکساں ہے، ساڑھے تیرہ تیرہ فٹ۔ تعویذ دو فٹ اونچا ہوگا آٹھ فٹ لمبا چار فٹ چوڑا۔ سب ملا کر قبر کی بلندی سوا پانچ فٹ ہوئی۔ اس تعویذ پر بلند قلمدان بنا ہے۔ جو قبر کے وسط میں ہے۔ سینہ کی جانب مائل نہیں بنایا گیا ہے۔ چبوترہ کی بغلی دیواروں میں تین تین دلہے خوشنما جدولوں سے محصور ہیں۔ قبر پر ایک انچ موٹا مضبوط چونے کا پلاسٹر ہے جس کو اُس وقت کے طریقہ پر پالش کر کے جلا دے دی گئی تھی۔ سنگِ مرمر کے مثل چمکنے لگا۔ مگر مرورِ زمانہ سے اب اس میں وہ آب و تاب باقی نہیں رہی، ماند ہوتی جاتی ہے۔ دھوندلاپن اور خاکستریت چھا گئی ہے۔ ایک دو جگہ مصالحہ بھی اُکھڑ گیا ہے جس سے یہ کیفیت و حقیقت کھل گئی۔ ورنہ اس لطیف و نازک صناعی کی بدولت ہر دیکھنے والا سنگِ مرمر کا دھوکا کھا جاتا ہے۔

تعویذ کے باہر چاروں گوشوں پر چودہ چودہ انگل کے فصل پر چوکور سوراخ ہیں۔ خادم و مجاور کہتے ہیں کہ کچھ زمانہ پہلے یہاں چاندی سونے کے ستون نصب ہوتے تھے، جو زبردستوں کی دراز دستی کے نذر ہو گئے، اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ انھیں نقرئی کھمبوں پر مخمل کے زریں شامیانے کھڑے کئے جاتے تھے۔ پادری منڈے صاحب نے لکڑی کا خطیرہ (کٹہرہ) اور سچی سیپیوں اور موتیوں کی جڑائی یہیں دیکھی تھی۔ آج اُس کا نشان بھی باقی نہیں، نہ کوئی پتہ دینے والا ہے۔ ع۔ حسرت سے دیکھتا ہوں در و بام کی طرف۔ خیال رہے

---

[1] تاریخ آگرہ یعنی مرقع اکبرآباد، صفحہ ۷۔ [2] صفحہ ۷۔

کہ اس قسم کی قیمتی مندوں، نفیس دماریہ دستکاری کی چیزوں اور آبنوس پر لطیف و نازک پچی کاری کے
چپر کھٹوں کا مقابر پر چڑھانا اور لگانا صاحب مقدرت لوگوں میں عام طور پر رائج تھا جس کے قابل دید نمونے
شیخ سلیم چشتی کے روضہ[1] (فتح پور سیکری) اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار[2] (دہلی) پر اب تک موجود اور اپنے اولوالعزم
عقیدتمندوں کی یادگار ہیں۔

خسرو کی قبر کے ادھر ادھر پورب پچھم نسبتاً چھوٹی دو قبریں شہ نشینوں میں ہیں۔ ایک داہنے
پہلو میں ہے دوسری بائیں میں۔ ان پر کوئی کتبہ نہیں جس سے صاحب قبر کا پتہ چل سکے۔ ایک کے پتھر پر صرف
اللہ اللہ کندہ ہے۔ مجاوروں کا بیان ہے کہ پورب والی قبر مرد (لڑکے) کی ہے پچھم والی لڑکی کی۔ ہیئت
کذائی بھی اس قول کی تصدیق کرتی ہے یعنی صرف ایک پر قلمدان موجود ہے۔ کس کا لڑکا تھا اور کون سی
لڑکی؟ یہاں کیسے پہنچے؟ کیا نام تھا؟ تاریخ کی زبان اس بارہ میں خاموش ہے۔ الہ آباد میں مدت تک
شہنشاہ زادے گورنری پر متعین ہوتے رہے تھے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کسی کا جگر گوشہ ہو۔ یا شاہ عالم ثانی
کے قیام الہ آباد کے طویل زمانہ میں کوئی بچہ دفن ہوا ہو۔

قبر کے دکن ایک تنگ کھڑکی ہے جس کے اندر کوئی زمین دوز سا راستہ بتایا جاتا ہے، مگر اس وقت بند
ہے۔ غیر مستند و غیر محقق روایت ہے کہ اکبر کے قلعہ تک جاتا تھا جس کو بعض مصلحتوں سے ایسٹ انڈیا
کمپنی کے ارباب حل و عقد نے مسدود کرا دیا۔ میرے نزدیک سرنگ کا قصہ بداہتہً غلط اور ایک بے بنیاد افسانہ
ہے۔ یہ رستہ نیچے قبر والے تہ خانے یا تہ زمین کسی حد تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہوگا۔ اسی طرح ایسے قابل احترام مقام
یعنی قبر کے قریب کی کھڑکی یقیناً اس مصرف کی نہیں ہو سکتی۔ وہ جائے ادب ہے نہ کہ آمد و رفت عوام کی جگہ۔
یہ بھی مان لیا جائے کہ باغ سے قلعہ تک اندر اندر جانے کے لئے کسی راستہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی تو اس تجویز
و تکمیل کے واسطے شاہ بیگم کے مقبرہ کی تعمیر کا زمانہ مناسب تھا نہ کہ وہ وقت جب بد نصیب و فراموش شدہ خسرو
سپرد خاک کیا جا رہا ہو۔

امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی یہ مختصر تحریر[3] درست ہے کہ مقبرہ

---

[1] [illegible]
[2] [illegible]

یخ کا حصہ نہیں دیا۔ جس سے ان شہزادے کے ناموں اور کارناموں کا علم اور عصر حاضر میں ان کے حالات کی تحقیق و
تصدیق ہو سکے۔ نہیں جانتا کہ زمانہ بجلائے وطن سے لکھنے والے کا مقصود کیا ہے۔ خسرو کی پوری زندگی میں کچھ دن
بھی ایسے نہیں پائے جاتے جن پر اس کی تعریف صادق آسکے۔ بچپن اور کچھ جوانی دادا جان (اکبر) کے دربار و سایہ
شفقت میں امن و عافیت، عیش و فراغت کے ساتھ گزری۔ اس کے بعد باپ کی نظربندی و نگرانی میں رہا۔ بھاگا۔
لڑا، پکڑا گیا۔ اور عمر بھر قید و حبس میں رہا۔ بھائیوں کا بھی خون کرایا[1]۔ خسرو کی تمام کارزار حیات اور کارناموں میں
اس کے رفقا، وہ جان نثاروں کی فردیں جو گرفتار اور بعد ازاں لقمۂ نہنگ اجل ہوتے رہے، کسی "الا باسی" کا
نام نہیں ملتا۔

کہہ چکا ہوں کہ شاہزادہ کی عظمت اور اس کے روضہ کی تربیت عوام میں اب بھی باقی ہے۔ برسات کے
موسم میں یہیں اس کے مزار پر ہر سال میلا لگتا ہے۔ شیرینی چڑھائی جاتی ہے۔ رات کو روشنی ہوتی ہے، گانا بجانا
بھی۔ خسرو باغ کا بڑا پھاٹک جو معینہ قواعد و احکام کے بموجب معمولاً بند کر دیا جاتا ہے، اس شب کو کھلا رہتا ہے۔ سپید
اب اس پھاٹک، اور اس باغ کے نئے تب رات رونق اور چہل پہل کا باعث ہوتی ہے۔ جنت نصیب شاہزادہ
کی بدولت باغ کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ اسی رات میں پھاٹک پر نعل چڑھائے جاتے، کیلوں سے جڑے
جاتے ہیں۔ پہلے سونے چاندی کے بھی ہوتے تھے، جن کی دیکھنے والی آنکھیں اور شہادت دینے والے لوگ
اب تک باقی ہیں۔ لیکن کفایت شعاری کے خیال یا حقیقتاً افلاس کے مارے اب عموماً لوہے کے رہ گئے ہیں۔
اس اجتماع میں حسب معمول ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے یا ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی کم خوش اعتقاد مسلمانوں
کے نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کا سالانہ عرس سمجھا جاتا ہے اور ہندوؤں کے دستور یا رسوم کے اعتبار سے ملک کی
بول چال میں میلا۔ گزیٹیر والوں نے بھی میلوں کی فہرست میں اس کو شامل نہیں کیا ہے۔ بعض اور میلے بھی
جن کی نوعیت بالکل مذہبی رہی ہے نظر انداز کر دئے ہیں[2]۔ بہر صورت حاجت مندان عقیدت کیش خسرو شہید
کے بابرکت مزار سے اب بھی منتیں مانتے، مرادیں مانگتے، اور سب کچھ پاتے ہیں۔ مشعلیں اور روشنی ساتھ لاتے
اور قسم بہ حسب حیثیت نذریں چڑھا جاتے ہیں۔ رات کے آٹھ نو بجے تک ایک اچھا خاصہ صاف ستھرا شہری

---

[1] سوانح عمری اورنگ زیب و مسلمانان ... فرمانروایان ہند، صفحہ ۸۰۔ [2] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، جلد ۲۳، صفحہ ۶۶۔

نیز داتی، بلا مُجسلا، مجمع دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ البتہ یہ مجمع روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ کچھ تو اعتقادات میں فرق آنے کی وجہ سے اور کچھ مخلوق کے اپنے اپنے اشتغالات اور موجودہ اختلافات کے باعث سے۔

حتیٰ کہ اب شہر کے اعالی و ادانی بھی اس سے کم واقف ہیں کہ بھادوں میں جب کہ یہاں سے پچھم جانب کچھ فاصلہ پر سلیم سرائے کے قریب ماموں بھانجے کا میلا جوگیری میں ہندوؤں کا لگتا ہے تو اسی کے ساتھ اسی مہینہ (یعنی اگست) کی پہلی دو جمعراتوں کو یہاں بھی ہوتا ہے۔ مقامی شہرت و اہمیت گھٹ جانے کے سبب سے یا یہ کہ حسب دستور سابق غریب مجاوروں کو کسی قدر اہتمام و اعلان کرنا پڑتا ہے پھاٹک پر نقارہ بجایا جاتا ہے، لوگ آجاتے ہیں، اور شاہزادہ سے عقیدت و محبت رکھنے والے جمع ہو کر اس کی تربت پر دو پھول چڑھا دیتے ہیں۔ آپ جائیں گے اور کتنی ہی مدت گزری ہوگی تو بھی کچھ نہ کچھ باسی ہار اور بکھری ہوئی پژمردہ و افسردہ کلیاں وہاں دیکھیں گے۔

سطوتِ تیموریاں، اے خسروِ عالی وقار — مرجع انس و ملائک آج ہے تیرا مزار
پھول رحمت کے ہوا کرتے ہیں روز و شب نثار — تو ہے زندہ، عظمتِ باقی ہے تیری زندہ دلا

جب ترے روضے کی جانب رُخ کیا کرتے ہیں ہم
اک "سلام عجز" تجھ کو کر لیا کرتے ہیں ہم

پھاٹک پر چڑھائے اور جڑے ہوئے نعل نووارد تماشائی کے لئے سب سے پہلے جاذبِ توجہ ہوتے ہیں۔ یہ مرادیں بر آنے والوں کے حسنِ عقیدت کے نگینے ہیں۔ ان کی تعداد اب بھی کافی ہے۔ ان میں ہر قسم اور ہر نمونے کے موجود ہیں۔ بڑے بھی، چھوٹے بھی۔ گھوڑوں کے بھی بیلوں کے بھی۔ حتیٰ کہ جوتوں کے بھی، ہندوستانی اور انگریزی دونوں وضع کے۔ حال کے لگائے ہوئے نعلوں میں تازگی اور چمک بخوبی نمایاں ہے۔ اس نرالی رسم نذر و نیاز یعنی آہنی نعلوں سے منت پوری کرنے کی کوئی معقول اور جلد باور ہو جانے والی وجہ نہیں بتائی جاتی۔ مختلف روایتیں زبان زد ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور و مقبول قصہ یہ ہے کہ مرزا خسرو کا گھوڑا نہایت عمدہ، اچھی نسل اور شریف ذات کا تھا۔ کسی نازک موقع پر اس نے کود کر جان بچائی اور دادِ رفاقت دی تھی۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ خسرو کے مقبرے کے سامنے یا اُس کے دامن میں، جو ایک مسطح پست سا چبوترہ، کچھ کم ایک بالشت اونچا، چار

گز دو فٹ لمبا، ساڑھے تین گز چوڑا، مع ایک مختصر شان تعویذ کے بنا ہے وہ اسی غازی مرد کی قبر بتائی جاتی ہے۔[1]

میں اس روایت کو دور کرنے اور اس رسم اور اس کی اصلیت کو اس طرح ماننے سے معذور ہوں۔ خادموں کی حاضر جوابی اور فضول گوئیوں کی شکایت ہمیشہ سے چلی آتی ہے، حتیٰ کہ آج سے ایک صدی پیشتر مسٹر فینچ[2] بھی اس کو برداشت نہ کر سکے تھے۔ میں نے تو اس قسم کے نعل اکثر قلعوں، پرانی عمارتوں اور مشہور روضوں پر دیکھے ہیں۔ ان کی نسبت مجھے معلوم ہوا تھا کہ کواڑوں کی استواری و استحکام اور آہن پوش بنانے کے لئے لگائے گئے ہیں۔ ان کی خوش اندامی اور جامع و رنج ہیئت کو ان کی برتری و انتخاب کی سب سے بڑی سند سمجھا جاتا ہے۔ فتحپور سیکری کی درگاہ کے بلند دروازہ[3] (جس کو مسٹر فرینچ سیاح سیع النظر "تمام عالم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جلالت و عظمت والا پھاٹک، اور ایک عجیب و غریب چیز لکھتا ہے[4]) کے سیکڑوں موٹے موٹے اور بھاری بھرکم نعل اسی خیال کے مؤید ہیں۔ یہی صاحب لکھتے ہیں[5] کہ "قلعہ بھرت پور کے مہیب پھاٹکوں پر پیتل کی موٹی موٹی چادریں جڑی ہوئی ہیں۔ ان پر بڑی بڑی کیلیں اور اسی دھات کے لٹو لگے ہیں"۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ دروازہ کی یہ شان اب تک قائم ہے۔ روضۂ ممتاز محل کے عالی شان دروازہ کو ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں سب سے بڑے ہشت دھاتی کواڑ لگے ہیں۔ ان کی بے تعداد پیتل کی کیلیں کیسا لطف دکھاتی ہیں[6]۔ قلعۂ آگرہ کے باہر بیرونی فصیل کے نیچے جنوبی پھاٹک کے پچھم امر سنگھ دروازہ پر اس بہادر راجپوت کے گھوڑے کی مورت بہتوں نے دیکھی ہوگی۔ اس شریف نژاد جانور کے متعلق واقعات اور اس کی جولانیوں کی داستانیں بہت سی زبانوں پر ہیں، کتابوں میں بھی۔ لیکن خسرو کے کسی خاص گھوڑے کا ذکر یا اس کا کوئی کارنامہ صفحاتِ روزگار پر درج نہیں۔

مولوی خدا بخش خان مرحوم کے ذخیرۂ نوادر یعنی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی تصاویر کا ایک نایاب البم محفوظ ہے۔ اس مرقع میں خسرو کی شبیہ بھی ہے۔ وہ جوانی کی عمر اور اپنے زمانے کے چست مردانہ لباس میں اونچی بنا ہوا ایک چاق چوبند گھوڑے پر سوار ہے۔ ہاتھ پر کلائی کے قریب ایک شاہباز[7] متمکن ہے۔ وہ توسنِ راہوار فرضی و خیالی نہ ہو تاہم اس کا وجود اور الٰہ آباد میں آمد تخیلات و

---

[1] سیاحت نامہ بالائی ہند ۱۸۳۳ء، صفحہ ۱۱۰۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۳۰۔ [3] سیاحت نامہ صفحہ ۱۲۱۔ [4] ایضاً، صفحہ ۱۱۰۔ [5] معین الآثار، صفحہ ۲۰۔ [6] کبری مراسم میں دوسرے کو باز کا ہاتھ پر لینا ضروری اور شگون نیک سمجھا جاتا تھا۔ (نقش ہند، حصہ دوم، صفحہ ۹۶)۔

موہومات سے خالی نہیں۔ میں اپنی تحقیق و تفحص کے نتیجہ اور قرائن و قیاسات کو اس قبر یا چبوترہ کے حالات میں درج کروں گا، جس کا ذکر ابھی کیا ہے۔

اس قدیم رسم کے پرستار کچھ ہم ہی نہیں۔ ایشیا کے حدود سے نکل کر یورپ میں بھی اس کو پائیں گے۔ عہد برطانوی کی تاریخِ حکومت ہند میں محمود غزنوی کے مقبرے کے دروازوں[1] کا غزنین سے آنا ایک عظیم معرکہ شمار کیا جاتا ہے۔ لارڈ ایلن برا نے اپنے اعلان میں اس کو بڑی اہمیت[2] دی تھی۔ انگریزوں کی سعیِ تحقیق، کاوش اور دقتِ نظر مسلم ہے۔ مسٹر ڈبلیو سمپسن W. SIMPSON نے دیکھا، شبہ کیا اور قوی وجوہ و دلائل کے ساتھ لندن ڈیلی نیوز کو لکھا کہ یہ پھاٹک تو پٹن سومناتھ والے ہو نہیں سکتے۔ مسٹر فرگوسن نے خوردبین سے جانچ کی۔ تشخیص فرمایا کہ صنوبری دیودار کی لکڑی ہے۔ حالانکہ تمام تاریخوں سے ثابت ہے کہ سومناتھ کے مندر کے کواڑ چوبِ صندل کے تھے۔ جن پر اعلیٰ درجہ کا نفیس کام تھا۔ جس کی بڑی شہرت تھی۔ جن کو محمود اپنی فتحمندی کے اظہار کے لئے گجرات سے کابل لے گیا تھا۔ جو اس کی وفات کے بعد اس کے مقبرہ میں لگا دئے گئے تھے۔ بیشک یہ کواڑ بھی نئے نہیں ہیں۔ کہنگی اور دست بردِ زمانہ کے بہت سے بدیہی آثار ان پر نمودار ہیں۔ دیمک چور چور ہو گئے ہیں۔ بہت سا

---

[1] ان کواڑوں کے متعلق مسٹر ہیل نے بعض باتیں اپنے علم و آگاہی اور بعض منشی موہن لعل کے حوالہ سے لکھی ہیں۔ (مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۰۴)۔ مولوی سعید احمد تحریر فرماتے ہیں کہ انگوری باغ (قلعہ) کے ایک دالان میں محمود غزنوی کے مقبرہ کا صندلی پھاٹک رکھا ہوا ہے، جسے ابتداءً غلطی سے سومناتھ کے مندر کا پھاٹک سمجھا گیا تھا (تاریخ آگرہ، ص ۴۰) ... چنانچہ اس مضمون کا اشتہار انگریزی، اردو اور ہندی میں اس پر چسپاں ہے (صفحہ ۹۹)۔ مسٹر پے دی دیدیا لکھتے ہیں "یہ قصہ کہ محمود سومناتھ کے مندر کے صندل کے پھاٹک غزنین لے گیا تھا، عصر موجودہ کے فضلا اعتبار نہیں کرتے۔ وہ پھاٹک جس کو انگریز ۱۸۴۲ء میں افغانستان فتح کرنے کے بعد لے آئے تھے قلعہ آگرہ میں نذرِ غفلت پڑے ہوئے ہیں۔ (زمانہ وسطیٰ کا ہندوستان، جلد سوم، ص ۹۴)۔ [2] گورنر جنرل لارڈ ایلن برو نے ملکہ کو لکھا تھا کہ "سومناتھ کے مندر کے پھاٹکوں کو میجر جنرل ناٹ NOTT لے آئے ہیں..... لارڈ ایلن برو جہاں پناہ کی اطلاع کے لئے اس اٹڈریس (بیان) کی نقل بھیجتے ہیں، جس کو شائع کرنے کا وہ عزم رکھتے ہیں۔ تاکہ اس بات کا اعلان ہو جائے کہ مندر کے پھاٹک

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

آرائشی کام ضائع ہو چکا ہے۔ بدنما بھدی مرمت لکڑی کی چھڑیوں، ٹکڑوں اور لوہے سے کردی گئی ہے (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مشرق و مغرب کے اتصال کی عجیب و غریب کڑی یہاں بھی جلوہ فرما ہے یعنی ان پھاٹکوں کے واڑوں پر گھوڑوں کے نعل کثیر تعداد میں کیلوں سے جڑے ہیں۔[1]"

یورپ کے ہنرمندوں نے کامل غور و فکر اور تجربہ کے بعد اپنی کثیر الاجتماع محفلوں اور درباروں کے لئے یعنی تھیٹر اور کونسل ہال کے واسطے نعل کی شکل کی عمارتیں پسند و اختیار فرمائی ہیں۔ کیا اس انتخاب و قرارداد میں آپ مقبرۂ خسرو کی نعل والی رسم کی ذرا سی بھی جھلک دیکھتے یا اس سے کچھ دور کا لگاؤ تجویز فرماتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) پھر لگا دئے جائیں گے۔ ان پھاٹکوں کا فیروزپور سے سومناتھ تک لوائے جانا ایک بڑی قومی فتح و ظفر ہوگی۔ اور ان کو ہندوستان واپس لے کرنے سے تمام رعایا میں گورنمنٹ معزز ہو جائے گی۔" اسی وقت ڈیوک آف ولنگٹن DUKE OF WELLINGTON کو لکھا "پھاٹک اس کے ہندو سپرد ہیں۔ اس لئے بری نسبت میں یہ نادانشمندی ہوگی کہ جب ہم کو ایک فتح کی عداوت کا یقین ہے تو باقی ہندو کی پرجوش و سرگرم امداد کیوں نہ حاصل کریں جو وفادار ہیں۔ اپنی کامیابیوں اور مندر کے پھاٹکوں کی بازیافت کو بڑھ سے بڑھ کر دکھاؤں گا اور اس کو بڑی حد پر ایک بڑی قومی تحسندی بتلاؤں گا۔ مگر خوب جانتا ہوں کہ ہندو اس کی بڑی قدر کریں گے اور اس کو خود اپنے اور اپنے مذہب کی حفاظت کا ضامن مسلمانوں کے خلاف سمجھیں گے۔ وہ تمام لوگ جو ہندوستان کو اچھی طرح جانتے ہیں مجھ سے کہتے ہیں کہ فی الحقیقت اس کا بہت بڑا اثر ہوگا اور میں بھی خیال کرتا ہوں کہ ضرور ہوگا۔" (عیسوی دوست کا ہندوستان میں عروج جلد پنجم صفحہ ۹۸۔ فٹ نوٹ)۔ ڈاکٹر ہنٹر بھی اس پھاٹک کو جعلی اور مصنوعی اور جھوٹی شیخی بازی کا آلہ بتاتے ہیں۔ دو کواڑ تھیں جن میں ایک ہی ہے۔ (صفحہ ۹۷، مختصر تاریخ اہل ہند مطبوعہ ۱۸۹۶ء۔ A BRIEF HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE - W.W. HUNTER. 1886.) منشی معین الدین اپنی تاریخ تاج آگرہ میں اس کی تائید کرتے ہیں۔ (صفحہ ۴۷، انگریزی)۔

صفحہ ہذا: [1] فرینچ صاحب کا سفرنامہ صفحہ ۲۹، نوٹ

آگرہ و نواح آگرہ۔

رسمی معذرت و عفو خواہی کی ضرورت نہیں۔ بعض شرق نواز شعرا کی خفیف سی غلط رائی و غلط
آرائی سے اختلافات و گریز پر بر خود غلط "مقبول" مجبور تھے۔ ورنہ ان فرزانگانِ فرنگ کی تحقیق پسندی اور
علم دوستی کا کون نا احسان شناس قائل نہ ہوگا، جو غیر ملک، غیر قوم، غیر زبان کی ایسی گراں ارز خدمت
فرما رہے ہیں۔ اپنے اوقاتِ عزیز کی ساعاتِ فرصت میں جتنا غور کرتے ہیں، ان کی کرامتِ نفس، کمالِ
علمیت و عزت میرے دل میں بڑھتی جاتی ہے۔

خسرو کا تذکرہ نویس حال خسرو کے اولین تاریخ نگار یا اس کو حیاتِ جاوید بخشنے والے شاعر کا بھی
شکر گزار و منت پذیر ہے۔

ہائے شوقِ جستجو کو کیا کروں　　　لب پہ بے قصد اس کا نام آ ہی گیا

یہ تسلیم ہے کہ سَلمی کا نام شعرا کے زمرہ میں پایا نہیں جاتا۔ میں نے خود بہت سے مطبوعہ و مخطوطہ
تذکروں میں تلاش کیا۔ ناکام رہا۔ چند وسیع النظر اہم فرماؤں اور اساطینِ علم و فضل کو بھی زحمت و تکلیف
دی۔ کوشش و کاوش فرمائی۔ سعی ناسشکور ثابت ہوئی۔ نواب والا جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن
خاں صاحب شروانی، صدر یار جنگ بہادر اپنے والا نامہ عالی میں ارقام فرماتے ہیں۔

"میں اول مرتبہ الہ آباد اس وقت حاضر ہوا تھا جب کہ مسلم بورڈنگ کا سنگِ بنیاد مولوی سمیع اللہ
خانِ مرحوم کے زیر اہتمام رکھا گیا تھا۔ اُس موقع پر پہلی دفعہ خسرو باغ دیکھا۔ تاریخ پڑھی۔ نقل کی۔ اب تک
محفوظ ہے۔ کبھی کبھی نظر بھی پڑ جاتی ہے۔ جب سے اب تک سلمی ارشد والا مصرع کھٹکتا ہی رہا۔ گرامی نامہ
کو پڑھ کر مزید کاوش کی۔ بے ڈھنگا ہی ہے۔ ایک شہزادے کی تاریخ فوت "فیض لائق" "واقعہ زمست سے
کیا مناسبت رکھتی ہے۔ میرا قاصر ذہن اس کے فہم سے عاجز ہے۔ پھر ارشد، باز گولی کھیت۔ بھرتی ہی
بھرتی ہے۔ اب "لفظ" "سلمی" سامنے آتا ہے۔ بفتح سین بکسر میم تخلص ہے، تو یہ نسبت کس طرح ہے۔
کوئی مناسب معنی سَلِم کے نظر سے نہیں گزرے۔ بکسر سین و ضم ہے، تو البتہ سِلْم بمعنی صلح یا اسلام کی طرف
نسبت ہو سکتی ہے۔ بہر حال پیشِ نظر تذکرے اس تخلص سے خالی ہیں۔ ریاض الشعرا، داغستانی، مخزن الغرائب
تذکرہ حسینی، دوست سنبھلی، مراۃ الخیال، صبح گلشن دیکھے گئے۔ کسی میں یہ تخلص نہ پایا۔ اگر سلمی سے تو

کسی بی بی کا تخلص ہو سکتا ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ جس کی تاریخ ایک معتوب شاہزادے کے مقبرہ پر کندہ ہو جائے وہ با نام و نشان شاعر بھی ہو قابلِ تذکرہ۔ بایں ہمہ میانِ سخن، وہ مجموعہ خرافات ہے، سوائے تخلص کے کوئی اور لفظ یہاں آ ہی نہیں سکتا!"

میں ان جامع تذکروں کی فہرست میں شیخ محمد افضل سرخوش دہلوی کی مبسوط و مشہور تالیف "کلمات الشعرا" کو بھی داخل کرنا چاہتا ہوں، جو ۱۰۹۳ھ میں شروع ہو کر، ایک قرن مستند کی مسلسل محنت و ورق ریزی سے، بارھویں صدی کے عشرۂ دوم میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد کے تمام مستند شعرا کے حالات مندرج ہیں۔ سرخوش کا دعویٰ ہے[1]

داخلِ اہلِ سخن نیست بہ پیشِ دانا   آنکہ نامش نہ بود در کلمات الشعرا

وہ بھی سبھی کو اہلِ سخن کی صف میں جگہ نہیں دیتے، نہ نام لیتے ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے نقوشِ اولین یدِ بیضا اور سروِ آزاد میں، جو فی الجملہ جامع اور ہر صنف سخن کے شعرا کے احوال پر حاوی ہیں، سبھی کا ذکر نہیں کیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تاریخ گو کی حیثیت سے ان کا پایہ اس وقت (۱۰۳۱ھ = ۱۶۲۲ء)[2] میں، یا اس کے بعد بھی چنداں بلند نہ رہا ہو۔ شاید یہ بھی اعترافِ حقیقت ہو کہ ایک بادشاہزادہ کی موت کی تاریخ "سفر ابد" کسی طرح قابلِ رد نہیں ہو سکتی لیکن ہمارے نزدیک دوسرا مصرع (تاریخ) بلکہ پورا قطعہ، زبان کی لوچ، خیال کی برجستگی، بیان کے زور، حسرت اور درد کا نقشہ سنانے، دل کی چوٹ دکھانے کے اعتبار سے کس سے کم ہے جس نے ان کے عنفوانِ شباب میں باوجود خوشنویسی کی مہارت ایک مہتمم بالشان بادشاہی عمارت، ایک عالی مرتبت سلطان کے مرقد پر جگہ پائی۔ واقعہ یہ ہے کہ سبھی نے ایک دوسری حیثیت سے شہرت و نمود حاصل کی تھی۔ صاحب

---

[1] خزانۂ عامرہ، صفحہ ۲۶۳، نولکشوری۔

[2] تاریخ جہانگیر از گلیڈون، صفحہ ۱۹۰۔

"مجمع الواصلین"، "سید محمد فاضل"[1] ان بزرگ کا پورا نام و نژاد "ملا سلمی ہندی سرست خاں" اور سال وفات ۹۱-۱۱۰۱ بتاتے ہیں[2]۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔ ظاہر ہے کہ خسرو کے مرنے کے وقت سلمی محض نوخیز یا جوان رہے ہوں گے۔ ساتھ ہی "دلخستہ و جگر ریش" زمانہ کی سردی و گرمی سے کم آشنا "تلخی ناچشیدہ" دنیا سے دل ہٹائے گوشہ گزیں بسر کرتے ہوں گے، زہد و ریاضت میں مشغول۔ اپنے قصیدہ میں وہ درد بھری باتیں کہہ گئے ہیں جو سن رسیدہ باکمالوں کو بھی نہیں سوجھتیں۔ وہ خدمت بجا لائے ہیں جس کی انجام دہی کی جرأت کسی جاہ طلب اہل قلم کو نہیں ہو سکتی تھی۔ سید فاضل کے ایسے مرتبہ شناس نے جب دنیا بھر کے مشائخ اور اہل اللہ کو یاد کیا اور ہر ایک کی وفات کی تاریخیں نکالیں تو اس شہرت و نمود سے گریزاں و نفور انسان کے متعلق تین قطعے لکھے۔ سب کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، یہ شعر کافی ہیں۔

(۱) سلمی ہندی کہ سخن سنج بود — رفت ز دنیا بہ رباط بہشت

(۲) ستائے صلاح سلمی بودست — تاریخ وصال او ازیں نیز بداں

(۳) چہ در دنیا و عقبیٰ جز خدا و مصطفیٰ ہرگز — ندارد التجا و تکیہ بر کس سلمی ہندی

(۴) بماہ صوم تاریخ وصال آں سخن آرا — بگفتا ہاتفم "بودہ خدا رس سلمی ہندی"

پہلے اور چوتھے شعر کے پہلے مصرعوں کو میں نے کئی بار پڑھا۔ "سخن سنج" و "سخن آرا" سلمی کی شاعری کا درجہ مجھے نہایت ممتاز و رفیع نظر آتا ہے۔ ان کے صلاح و تقویٰ، بزرگی و مشیخت کے ساتھ ان کا کمال و کلام بھی مسلم ہے۔ "ملا" کا لقب اس دور میں اکابر علما و فضلا کے لئے مخصوص تھا۔ کون تھے؟ کہاں کے تھے؟ یہ مراحل ہنوز جلباب خفا میں ہیں۔ قرینہ مقتضی ہے کہ بلاد دکن کو ان کے توطن اور بود و باش کا شرف حاصل رہا ہوگا۔ اگر اطراف الہ آباد کے ہوتے تو ان کی شہرت و بلند نامی کا کچھ نہ کچھ

---

[1] ابو عبداللہ محمد فاضل بن سید احمد بن سید حسن، مظہر الحق ترمذی، اکبرآباد کے باشندے تھے۔ ۱۱۰۶ھ (۱۶۹۴ء) میں وفات پائی۔ اپنی کتاب میں ۱۱۰۱ھ تک کے مادہائے تاریخ وفات لکھے ہیں۔ (قاموس المشاہیر، ص ۵۰)۔

[2] صفحہ ۱۱۹، مطبوعہ ۱۲۶۰ھ مصطفائی۔ و صفحات ۱۵۱ و ۱۵۲ مطبوعہ کلکتہ ۱۲۳۹ھ۔ نیز گلستان مسرت، صفحہ ۲۹۸، مطبوعہ ۱۲۶۴ھ۔

نشان اب تک ضرور باقی رہتا۔[1]

---

[1] حقیر ہیچمداں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ خانِ سرمست کا یہ تخلص یا لقب نسبی امتیاز سے وابستہ تھا یا انتسابی سے۔ نسب کا علو و تعلق فریدوں کے پسرِ بزرگ سَلَم تک پہنچتا ہے اور انتساب کی برتری و اعزاز صوفیۂ صافیہ کے ایک مشہور اور پرانے خانوادے "سُلَمی" "سُلَمی" جس کو ماننا صحابی جلیل حضرت سلمان فارسی سے شرفِ اختصاص حاصل ہے۔ اس سلسلہ کے چند برگزیدہ شیوخ کے نام مولانا فریدالدین عطار کی لاجواب کتاب' اور درویش صفت، صوفی مشرب، پروفیسر نکلسن کے مایہ ناز کارنامے "تذکرۃ الاولیا" (مطبوعہ لائیڈن، ہولانڈ، ۱۹۰۵ء سیلادی) میں جا بجا ملتے ہیں (۱) عطار سلمی' ان میں متقدم الایام پائے جاتے ہیں، جنھوں نے بعض بعض باتیں عبداللہ مبارک کے حوالے سے اور بعض خود ابراہیم ادہم سے نقل کی ہیں، (صفحہ ۹۶)۔ (۲) احمد سُلَمی ذوالنون کے معاصر و معتقد تھے (صفحہ ۱۲۱)۔ (۳) عبداللہ سُلَمی نے وصیت کی تھی کہ میں جب مروں تو ابوحفص حداد کے پاؤں پر میرا سر رکھ دیا جائے جن کا حضرت جنید بھی ادب کرتے تھے (صفحہ ۳۳۱)۔

ان صورتوں اور اعرابوں کے علاوہ جو نواب محتشم نے تحریر فرمائے ہیں' اس لفظ کی ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ "سُلَّمی" ابو عبدالرحمٰن السُّلَّمی۔ (ت ۴۱۲ھ و تمہید انگریزی ا۔۱۰) جس کی زندہ جاوداں مثال موجود ہے۔ مگر وزنِ شعر اس کو قبول نہیں کرتا انھیں بزرگ ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین السلمی النساپوری کا ملّا عبدالرحمٰن جامی نے نفحات الانس کے' طبقات الصوفیہ میں بڑے احترام و ادب سے ذکر فرمایا ہے۔

متصوفین کے سوا عرب کے شاعروں میں بھی یہ نام و لقب اور اس لفظ (سُلَم) کے بعض مشتقات و معروفات و منسوبات بہت محبوب و رائج تھے۔ نامور کاتب عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ کی' طبقات الشعرا' (مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۲ء) میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں جیسے عُقبہ بن سَلَم (صفحہ ۴۷۷) و سعید بن سَلَم (صفحہ ۵۳۱) وغیرہ۔ اشجع السُّلمی (۵۶۴) کے حالات سے واضح ہے کہ سلمیوں کا خاندان برامکہ عجم کا قرابت دار تھا۔

صحابہ پاک میں بھی حضرت عمرو عتبہ سلمی اور عتبہ بن عبد السلمی کے نام ملتے ہیں (سیرۃ النبی صلعم جلد سوم صفحات ۲۸۳ و ۳۳۵)۔ نیز حجاج بن علاط السلمی (المستطرف' جزو دوم صفحہ ۲۳۲)۔ اور طلحہ بن معاویۃ السلمی کا (اصابہ۔ جلد ۲، جزو ۹، صفحہ ۲۰۹)۔

خسرو کی رفیقۂ زندگی

مباد اگر ان اوراق کا کوئی بے حس و بے درد پڑھنے والا اس کے ذکر پر چونک پڑے اور لکھنے والے پر بیراہ روی و فضول نگاری کا الزام لگا دے۔

مقامی راوی اور موروثی خادم اسی بیگم کی نسبت کہتے اور یورپ کے بعض اہلِ قلم گمان کرتے ہیں کہ خسرو باغ میں دفن ہے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اپنے مشاہدہ یا کسی قرینہ یا سند و حوالہ سے اس مجسمۂ شرافت و عفت خاتون کے ساتھ خسرو باغ کا انتساب ثابت پانے سے معذور ہوں۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام کیا تھا؟ کہاں پیوند خاک ہوئی؟۔ اس قدر جانتا ہوں

جس پہ اب تک ناز کرتی ہیں خواتینِ وطن ایک ایسی ہی امانت خاک کی خلوت میں ہے

اُس نے اپنے مظلوم شوہر کا ساتھ تو عمر بھر دیا! لیکن نورجہاں اور جہانگیر یا ممتاز محل اور شاہ جہاں کی طرح بظاہر بعد مرگ یکجائی اور خاوند کے برابر جگہ پانے سے محروم رہی۔

تاہم خسرو کی ذات کے ساتھ اس ملائک سرشت عورت کی وابستگی و وفاشعاری کا ذکر نہ کرنا میرے نزدیک معصیت کوشی اور انصاف کا خون کرنا ہے۔ خسرو باغ کے متعلق یہ اوراق لکھتے وقت عالم تخیل و تحقیق میں میں نے مصائب و مصاعب کے بہت سے کوہ و وادی طے کئے اور دوسروں کی زندگی کے دردناک سوانح اخذ و نقل کرنے سے پہلے اپنے اوپر بھی ویسے ہی روحانی رنج و اندوہ انگیز کئے ہیں۔ اپنے دل اور دل کے جذبات کو بارہا مجروح کرنا پڑا ہے۔

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے اور میری زندگانی کا وہی ساماں بھی ہے

وہ مورخ جنھوں نے خسرو کا ذکر خلاف مصلحت و مآل اندیشی نہیں سمجھا ہے "اس نیک اور خیر مجسم عورت کی شوہر پرستی، وفاداری و غمگساری کے مداح و رطب اللسان ہیں۔ اس کی حق گزاری و فرض شناسی کی داستانیں سنانے کا یہاں موقع نہیں۔ "تذکرۂ خسرو" کا بے پایاں میدان سامنے ہے، وہ اس کے بیان

وتفصیل کے لیے کفایت کرے گا۔ پھر بھی وہ قلم راقم خسرو باغ کا، جس نے خسرو اور اُس کے اَلَم وغم اور مصائب وشدائد کا کم وبیش ذکر کیا ہے، یہاں بھی اُس کی عفّت مآب شریکِ حیات اور اُس کی رفاقت وجاں نثاری کے اظہار سے کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نازپروردہ امیرزادی نے اپنے ناشاد و نامراد شوہر کی جس قدر خدمت کی، کنیزانہ محنت وغمخواری فرمائی اور اُس کے لیے مصیبتیں اُٹھائی تھیں، اُس کی نظیر کم ملتی ہے۔ مقابلہ کی بات نہیں، نہ کسی پہلو سے پورا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک کی مایۂ نازش، وفاکوش ووفاکیش خاتون، سیتاجی کی مصیبت جھیلنے کا زمانہ تو سیتن اور پورے چودہ سال تھا لیکن خانِ اعظم کی بیٹی اپنے جہیز میں انبوہ انبوہ رنج واندوہ لائی تھی، جس نے مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑا، جس کی بدولت یا یوں کہیں کہ جس کے جبلّی تعلق، پدری محبت اور فطری خیراندیشی و نیک سگالی کی وجہ سے باپ، بیٹی اور داماد، تینوں ہمیشہ موردِ عتاب و مبتلائے آفات رہے ہیں۔

یہ بیگم خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی دختر تھی[1]

اس کی شرحِ زندگی ہے جنّتِ اہلِ نظر   وہ بھی اک عنوانِ تاریخِ نسائیت میں ہے

اس بیگم سے خسرو کے بچوں کا ذکر جہانگیر نے کئی جگہ محبت کے ساتھ کیا ہے[2]۔

خانِ موصوف کثیر الاولاد تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے اور اتنی ہی بیٹیاں[3]۔ لڑکیوں کے نام کسی مورخ نے تحریر نہیں فرمائے۔

سنہ [illegible] (۱۶۱۲ء) میں جب کہ خسرو باغ نصب ہو چکا تھا، آقا رضا اُس کا پھاٹک بنا رہا اور اپنے دلی نسبت آقا اور اپنے نام کا پتھر لگا رہا تھا، شہنشاہ اکبر نے مرزا عزیز کو ہفت ہزاری ذات وشش ہزار سوار کا منصب عطا فرمایا جو اس وقت بادشاہ زادوں کے سوا کسی کو نہیں ملتا تھا۔ مگر اُس کی سپہ سالاری و دلیرت

---

[1] ترجمہ ماثر الامرا صفحات ۳۲۷، ۳۲۰، ۳۲۵۔ [2] منتخب اللباب، حصہ اول صفحہ ۲۳۳۔ دربار اکبری صفحہ ۱۵۵۔ و۔ ترجمہ تزک جلد اول صفحہ ۲۵۸۔ نوٹ۔ و صفحہ ۲۲۰۔ [3] تزک صفحہ ۱۰۷۔ و۔ ترجمہ تزک صفحہ ۱۲۹۔ دوسرے موقع پر صفحہ ۲۲۰ و ترجمہ ۱۵۳۔ نیز ماثر الامرا جلد اول صفحہ ۶۸۹۔ و۔ دربار اکبری صفحہ ۲۷۷۔ [4] ماثر الامرا جلد دوم صفحہ ۱۹۳۔ و۔ ترجمہ انگریزی صفحہ ۳۲۶۔

سے زیادہ اُس کے دل و دماغ کی خوبیوں اور ذاتی قابلیت کی قدر اور اُس کے دودھ شریک بھائی ہونے کا لحاظ و احترام کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ عزت بخشی کہ اُس کی بیٹی کی نسبت شاہزادہ خسرو سے کر دی۔[1]

شایانِ شان تیاریاں ہوئیں۔ آرائش و اہتمام شاہانہ تھا۔ ساچق کا سامان گراں بار و گراں قدر بھیجا گیا۔ ایک لاکھ روپیہ نقد تھا۔ دربار کے بڑے بڑے اُمرا اور حاشیہ بوسانِ بساطِ دولت یہ تحائف و ہدایا لے کر مرزا کے گھر گئے۔[2] بیگم کی آمد اور تزک و احتشام کی تفصیل سے "سرو باغ" کے صفحات کو دامنِ گلچیں بنانا نہیں چاہتا۔ چھوڑتا ہوں۔

پرتگیزی سیاح اور اہلِ قلم پیٹرو ڈیلا ویلے ۱۶۲۳ء[3] میں اس ملک میں وارد ہوا تھا۔ کچھ دن قیام بھی کیا تھا۔ اُس نے اپنے وطن اور وطن کے اربابِ حل و عقد کو متعدد خطوط، وقتاً فوقتاً یہاں کے حالات میں لکھے تھے۔ شہنشاہِ جہانگیر کے فرزندوں کے نام بھی ضروری حالات و تفصیلات کے ساتھ گنائے ہیں۔ لکھا ہے کہ "سب سے بڑا سلطان خسرو، بڑی اُمیدوں والا شاہزادہ، رعایا میں نہایت محبوب تھا۔"[4] سیاح موصوف اور اُن کے رقعات کے پہلے محشی مسٹر جی ہیورز G. HAVERS نے خسرو کی دردبھری داستان اور قید میں جان دینے کا واقعہ اضافہ فرمایا ہے۔[5] پیٹرو صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ "میں یہ واقعات گجرات میں بیٹھے ہوئے قلمبند کر رہا ہوں۔"[6]

ورودِ ہندوستان اور یہاں کے حالات جاننے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

"نورمحل کو یہ خیال گزر رہا تھا کہ سلطان خسرو باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے گا۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا پایہ بھی مضبوط رہے اور زور اُسی طرح قائم ہو جائے۔ اُس نے سنہ ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۱ء) میں شہریار[7] سے شادی کرنے کے قبل بارہا اپنی بیٹی مہرالنسا[8] سلطان خسرو کو دینا چاہی۔ مگر وہ کبھی رضامند نہ ہوا۔ اس کی وجہ خواہ یہ رہی ہو کہ خسرو کی ایک بی بی موجود تھی جس سے وہ خوب محبت کرتا تھا اور جس سے بے وفائی و بے مہری پر وہ کسی طرح

۱؎ دربارِ اکبری، صفحہ ۲۷۲۔ ۲؎ دربارِ اکبری، صفحہ ۲۷۳۔ ۳؎ سیاحت نامہ، جلد اول، صفحہ ۵۵۔ ۴؎ ایضاً، صفحہ ۲۲، نوٹ ۶۔ ۵؎ صفحہ ۵۹، نوٹ ۲۔ نیز صفحات ۵۶ تا ۵۹۔ ۶؎ ایضاً، صفحہ ۵۱۔ ۷؎ عین الاثر، صفحہ ۳۱۔ ۸؎ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۵۳۔ ۹؎ رسالہ مخزن لاہور، صفحہ ۴۴، نمبر ۲، جلد ۱۴، بابتہ ماہ نومبر ۱۹۰۷ء۔

تیار نہ تھا! خود اس سبب سے کہ وہ نور محل کی بیٹی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہے کہ خسرو جب زندان خانہ بلا میں تھا تو اُس کے پاس متواتر و متوالی پیغام پہنچے تھے کہ نور محل کی لڑکی سے شادی کروگے تو فوراً رہائی پا جاؤ گے مگر بایں ہمہ وہ کسی طرح اس فرمائش کی بجا آوری کے لئے راضی و آمادہ نہیں ہوا۔[1]"

"برخلاف اس کے اس کی بی بی نے، جو ایک دوسرے کو بے حد محبت و پیار کرتے تھے، خسرو کے پاس خدمت گزاری کے لئے قید خانہ میں رہنے کی رخصت و اجازت حاصل کر لی! اور شوہر کے پاس وہاں چلی گئی۔ وہ جب تک وہاں رہا یہ بھی اس کے ساتھ بسر رہی۔ یہ بیگم اُس کو ہمیشہ ترغیب دیتی رہی کہ نور محل کی دختر سے شادی کرو تاکہ تم کو ان صعوبات و مصائب سے نجات تو حاصل ہو جائے۔ خود جہاں تک کہ میری ذات کا تعلق ہے، میں تسلیم و رضا و صبر و شکر کے ساتھ فیصلہ التقدیر پر قناعت کروں گی اور بونڈی بن کر آپ کی خدمت بجا لاتی رہوں گی۔ آپ کو آزاد پانا اور اچھی حالت میں دیکھنا میری آرزوئے حیات ہے۔ لیکن شاہزادہ پر اس کی عاجزی و التجا کا کبھی کچھ اثر نہیں ہوا لہٰذا اُس نے کسی طرح منظور کیا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا

اسیری زیر پرواز گلزار بہتر　　بکنجِ قفس بال و پر می فروشم

اس طرح وہ قید خانہ میں اپنی وفا گستر و محبوب زوجہ کے ساتھ بنا رہا یہاں تک کہ ستمگاروں کی کینہ وری اور اُس کے باپ کا غیظ و غضب بھی عاجز آ گیا.....[2]"

اسی عہد کا مشہور وسیع الاطلاع جہاز راں و سیاح ولیم فنچ WILLIAM FINCH اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "اس جلیل القدر گھرانے کے لوگوں کی عجیب کیفیت تھی۔ ان کا مذہب مختلف ہو! مدارج و مراتب مختلف ہوں، مگر عقل انسانی اور قوتِ حاسہ سب کی یکساں تھی۔ ظاہری اختلافات خواہ کیسے ہی ہوں، اعمال پر اُن کا اثر نہیں پڑتا تھا! قادر روح و دل نمایاں تھا۔ نتیجہ ایک ہی رہتا تھا۔ بدنصیب و ناشاد خسرو کی بی بی کا عمر بھر اصرار رہا کہ زندان خانہ میں شوہر کی رفیق اور مصائب و آلام میں شریک و غمگسار ہو کر رہوں۔ یہ قید خانہ کیا تھا؟ ایک تاریک برج جہاں قیدیوں میں سے اگر کوئی مر جاتا اور بادشاہ سلامت کہیں باہر ہوتے تو اُن کی واپسی تک لاش بے گور و کفن رہتی۔ دروازہ

---

[1] سیاحت نامہ، صفحہ ۵۶۔ [2] ایضاً، صفحہ ۵۷۔

ہر وقت بند رکھا جاتا تھا۔[1]"

حسنِ انجام ظاہر ہے۔ بقول ایک امریکن مصنف مسٹر بے آرڈ ٹیلر BAYARD TAYLOR کے "مشیت الٰہی نے عشق و محبت کو وہ شے مرحمت کر دی جس کے عطا کرنے سے کبھی انکار فرمایا تھا" یا جیسا کہ منشی معین الدین رقم پرداز ہیں "تقدیر نے محبت کا ارمان پورا کر دیا۔"

کہا جاتا ہے کہ اسی بیگم سے خسرو کی اولاد بھی زیادہ تھی۔ لیکن تاریخ کی زبان اس کی تفصیل یا ناموں کے بتانے سے قاصر اگر کم سے کم خاموش پائی جاتی ہے۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے خسرو کی اولاد میں صرف دو کو کچھ عمر یا شہرت نصیب ہوئی تھی۔ (۱) سلطان داور بخش عرف مرزا بلاقی[2]۔ (۲) ہوشمند بیگم[3]

اس وفا شعار مہرپرور عفیفہ کے سوا تاریخ کے صفحات پر، خسرو کے تعلق سے تین بیگموں کا نام اور آتا ہے۔

(۱) مقیم خاں ولد مہتر فاضل، رکاب دار (سولی) کی بیٹی۔ اس سے ایک لڑکا بھی تھا۔ جس کی پیدائش کا ذکر جہانگیر نے تزک میں کیا ہے[4]۔

(۲) دختر مرزا مظفر حسین صفوی۔ شاہزادہ خسرو کے ساتھ اس کی شادی رچائے جانے کی تفصیل

---

[1] کین کی مغل ایمپائر، صفحہ ۱۱۰۔ [2] جہانگیر کی وفات ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (بحساب قدیم ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء) کو ہوئی۔ آصف خاں وزیر نے بہ مصلحت وقت پہلی سے داور بخش کو قید و بند سے نکالا اور لاہور میں تخت پر بٹھا دیا۔ تین ماہ بعد جب شاہجہاں کی سریر آرائی و فرماں روائی کا اعلان کیا تو داور بخش کو مع اُس کے دونوں چچا زاد بھائیوں (ایک بہنوئی) کے جمادی الثانی سال مذکور میں قتل کرا دیا۔ الفنسٹن صاحب کی یہ روایت کہ داور بخش موقع پا کر بھاگ نکلا اور ایران پہنچ گیا تھا جہاں سفیران ہولسٹین HOLSTEIN نے اُس کو دیکھا تھا، چنداں مستند نہیں بتائی جاتی۔ [3] اس شاہزادی کی شادی مرزا ہوشنگ پسر مرزا دانیال سے ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں ہوئی تھی۔ اس کے دو سال بعد شاہجہاں کے حکم سے ہوشنگ کو مع اور بھائیوں کے جام شہادت پلا دیا گیا تھا۔ (بیلس ڈکشنری، صفحات ۸۰، ۱۰۸، ۱۲۸ و ۲۴۸)۔ [4] صفحہ ۱۵۷۔ و۔ ترجمہ تزک، صفحہ ۳۲۱۔

پٹنہ[1] کے مشرقی کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ قرابت اکبر کی تجویز تھی۔ اور اُسی کے سامنے عمل میں آئی۔

(۳) والی ٹھٹھ کی ہمشیر۔ غالباً مرزا غازی ترخان[2] کی بہن تھی، مرزا جانی بیگ[3] کی بیٹی۔ یہ نسبت بھی اکبر نے ٹھہرائی تھی۔ معلوم نہیں کہ تقریب کی نوبت پہنچی تھی یا نہیں۔ سعید خاں کی عرضداشت کے جواب میں جہانگیر نے اس سگائی کا ذکر کیا ہے۔ شادی کے لئے اصرار پایا جاتا ہے[4]۔

اے نیک دل پڑھنے والے! اس کریم النفس شریف الفضائل عورت "اس ہمہ تن شوق ایثار، سراپا الفت و وفا خاتون کی یاد میں چار آنسو بہالے۔ اور رحمت و سلام کے پھول نثار کر۔ اور سُن۔

اے دل میں درد رکھنے والے انسان! سُن!!

چار دن کی سیر ہے دُنیا کے بہاں کے لئے ۔۔۔ ہے قبائے زندگی چاکِ گریباں کے لئے
چاہئے کچھ نورِ عبرت چشمِ انساں کے لئے ۔۔۔ ورنہ چشم و گوش تو یکساں ہیں حیواں کے لئے

گاہ گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

---

[1] رسالہ ادبی دنیا لاہور اپریل ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۲۲ - بحوالہ بادشاہ نامہ۔ [2] ترخان ایک پرانا ترکی اعزازی لقب ہے۔ اس خطاب کے لوگ ادائے ٹیکس سے معاف تھے۔ پروفیسر آرمی نیس وام بے ری A.VAMBERY نے اپنی تاریخِ بخارا (مطبوعہ لندن) میں اس کے منگولین مشتقات اور وسعتِ حقوق و استحقاق اور حدود و اختیارات کے متعلق پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ [3] طبقاتِ اکبری، از نظام الدین ہروی، صفحہ ۲۳۸۔ و منتخباتِ ابوالفضلِ علامی، مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۹ء، صفحہ ۴۴۔ و رشحات الغنون، قلمی، ورق ۲۰۰، از سید امین الدین خان ہروی۔ و سیر المتاخرین، صفحہ ۷۲۔ و مسلمان تاجدارانِ ہند، جلد اول، صفحہ ۸۰۔ [4] تزک، صفحہ ۹، سال اول۔ و ترجمہ، صفحہ ۲۰۔

(۷) (۸)

دو بے قبر کے مقبرے خسرو باغ میں

مقبول صمدنی

دو بے قبر کے مقبرے

مقبرۂ شاہ بیگم اور مقبرۂ خسرو کا ذکر تو ہو چکا۔ اب خسرو باغ کی دو عمارتیں رہ جاتی ہیں، جن میں قبر تو نہیں مگر مقبرے کہلاتی ہیں۔ ایک تو شروع ہی سے آباد نہیں ہوئی نہ کسی کے جسدِ خاکی نے اُس میں ٹھکانا پایا تھا۔ دوسری آباد ہو کر ویران ہو گئی۔ مدفن تھی۔ مسکن بنی۔ یہاں ان کی تعمیری خوبیوں یا خامیوں اور کوتاہیوں سے بحث کرنا مقصود نہیں، بلکہ ان کی صورت و کیفیت دیکھ کر اُسی پہلو پر نگاہ ڈالنا مدِ نظر ہے، جو علمی و ادبی یا کسی نہ کسی معنی میں تاریخی سمجھا جاتا ہے۔ خدا کرے کوئی باکمال صاحبِ قلم اس طرف توجہ فرمائے اور صفحاتِ کاغذ پر باقی رہ جانے کے لئے باقی اشعار کو بھی تحقیق کر کے پورا کر دے۔

سلطان نثار بیگم کا گنبد

ہر سمت اور ہر حساب سے یہ دوسرا مقبرہ ہوتا ہے، اور اُن دونوں مقبروں کے درمیان واقع ہے۔ یعنی اس کے یک جانب خسرو کا مقبرہ ہے اور دوسری طرف شاہ بیگم کا۔ اس کا فصل ہر ایک سے بقدر تیس (۳۰) قدم کے ہوگا۔ گلبندانِ زیب و زینت کے زر پاش و فیض بخش ہاتھوں کی بدولت یہ فصل (رقبہ و زمین) بھی خالی اور بیکار نہیں چھوٹنے پایا، بلکہ اس میں دونوں طرف دو خوشنما سنگین حوض، ہشت پہل بنادئے گئے ہیں۔ کبھی صاف شفاف پانی سے لبریز رہتے تھے۔ پاس کے کنوئیں آب رسانی کرتے تھے۔ فوارے چلتے تھے۔ آبشار اور نالیوں کا ظاہری سلسلہ و انتظام تو اب تک وہی باقی ہے، مگر بے سود و بے مصرف۔ اپنی حالت اور کس مپرسی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ حوض خشک پڑے ہیں، فوارے بند۔ البتہ ان میں کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے تو گلکار و منقوش رُخام کی جگہ سادہ پتھر لگتا ہے یا صرف چونا۔ پیوند بدنما ہوتے ہیں اور نازیب۔

یہ مقبرہ وسطِ باغ میں بڑے دروازے کے مقابل ہے۔ یہی کرنیل نیویل کے حساب سے دوسرا ہوتا ہے[۱]۔ اور مسٹر بیل کی تحریر سے تیسرا[۲]۔ اوروں کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹا ہے۔ یہ جسمانی کمی ایک معنوی حیثیت یعنی اس کے بلند و سبق آموز اشعار و قطعات کی افراط و کثرت سے پوری کردی گئی تھی۔ زمانہ کے جفاکار ہاتھ نے ان کو بھی برقرار و قائم نہ رہنے دیا۔

بریگ ہینڈ بک میں لکھا ہے کہ پورب والا مقبرہ خسرو کا ہے اور تیسرا اس خاندان کے اور بچوں کا[۳]۔ مولفِ کتاب کی مُراد کس تیسرے (مقبرے) سے ہے؟ وہ بچے کون تھے؟ اور کس کس کے؟ ان کی قبریں کہاں تھیں؟ کیا ہوئیں؟ ان کا نہ لکھنا، لکھنے والے کی عدمِ واقفیت اور کوتاہیِ تحقیق کو عائم آشکار کرتا ہے۔

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید، صوبہ ۷۰۔ [۲] مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۲۵۔ [۳] صفحہ ۵۳۔

یہاں کے بعض خادمانِ باخدمت و بامخدوم اس کو خسرو کی بیوی کا مقبرہ بتلاتے ہیں، اُس کا نام
لیلیٰ بیگم دختر شاہنواز خاں۔ تاریخ کی زبان اس بارے میں قطعاً خاموش اور اس کی تصدیق سے عاجز ہے
انگریز مورخوں اور اُن کے خوشہ چیں، ہمارے اہلِ وطن کی روایت یہ ہے کہ یہ مقبرہ خسرو کی
ایک بہن نے ۱۰۳۴ھ (۱۶۲۵ء) میں اپنے لئے تعمیر کرایا تھا، مگر اتفاق سے بیگم نے کسی اور جگہ
انتقال کیا، اور وہیں دفن ہوئی، اس لئے یہاں اُس کی جگہ خالی رہی۔ بہت سے اشعار گنبد کے اندر
اور باہر لکھے تھے جو گردشِ روزگار سے مٹ گئے ہیں[1]

ڈسٹرکٹ گزیٹر والے بھی اس کی تائید یا اسی کو نقل کرتے ہیں۔[2] مسٹر اسٹیل اس کو جہانگیر کی
راجپوت ملکہ کی بیٹی کی قبر بتاتے ہیں[3] کرنل نیول فرماتے ہیں کہ اس میں بہت سے کتابے لگے
ہیں لیکن اکثر اب شکستہ حالت میں ہیں[4]

اگر یہ قول اور ان بزرگانِ فرنگ کا قیاس صحیح ہے تو یہ شاہزادی شاہ بیگم کی بیٹی تھی[5] اور
خسرو کی ہمشیر۔[6] شاید انھیں تعلقاتِ قلبی کے داعیے اور محبت و خون کے جذبے سے اُس نے
الہ آباد میں پیوندِ خاک ہونے کی آرزو کی ہوگی۔ یا خاکِ پاکِ پراگ کی کشش رہی ہو۔ شریف الملک
معتمد خان محمد ہادی تزک کے دیباچے میں[7] اس کا نام سلطان نثار بیگم لکھتے اور خافی خان محمد ہاشم
منتخب اللباب میں صرف سلطان بیگم تحریر کرتے ہیں[8] تزکِ جہانگیری اور تذکرۂ خسرو (مولفۂ راقم) سے
پایا جاتا ہے کہ وہ جہانگیر کی پہلی بیوی سے تھی اور اُن کی اولاد میں سب سے بڑی یعنی پلوٹھی۔[9] مسٹر پرایس
Price تاریخ جہانگیر میں ناقل ہیں کہ سلطان نثار بیگم خسرو سے سال بھر بڑی تھی۔ ایک سال پیشتر فوت
ہوئی۔ اُس نے خسرو باغ الہ آباد میں اپنے لئے مقبرہ بنوایا تھا، مگر وہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔ اس لئے

---

[1] مفتاح التواریخ، مولفہ مسٹر بیل، صفحہ ۲۳۵۔ ڈاکٹر فوہرر، صفحہ ۱۲۸۔ قاموس المشاہیر، صفحہ ۲۹۷۔ [2] گزیٹیر سابق ضلع الہ آباد، ۱۸۸۴ء، صفحات ۱۴۸ و ۱۴۹ [3] گزیٹیر جدید، صفحہ ۲۰۳۔ [4] اوراق مغل، صفحہ ۳۰۳۔ [5] جہانگیر نامہ خواجہ ابوالحسن معتمد خان بخشی، صفحہ ۷۷۔ [6] قاموس المشاہیر، صفحہ ۱۳۵۔ [7] تزک جہانگیری، صفحہ ۷۔ دیباچہ تزک، صفحہ ۲۔ دیباچہ تزک انگریزی، صفحہ ۱۹۔ [8] جلد اول، صفحہ ۲۴۵۔ [9] ترجمہ از مسٹر بیوریج، صفحہ ۱۵۔

۲۴ شعبان ۱۰۵۶ھ مطابق ۵ ستمبر ۱۶۴۶ء کو وفات پائی اور اپنی خواہش و وصیت کے مطابق اپنے دادا کے مقبرے واقع سکندرہ میں سپردِ خاک کی گئی[1]۔ قاموس المشاہیر[2] میں بھی یہی حال اور نام سلطان النساء تحریر ہے[3]۔ بادشاہ نامہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[4]۔ مسٹر بیل نے اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری[5] میں مرزا امینا (مرزا امین) نے اپنے بادشاہ نامہ[6] میں اور مسٹر بیورج نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے[7] میں اس کے حالات بقدرِ ضرورت درج کئے ہیں۔ بیورج صاحب اپنے نوٹ میں اضافہ فرماتے ہیں کہ اس کا اصلی نام سلطان النساء تھا۔ اکبر نامہ[8] میں اس کی ولادت کا ذکر ہے۔ ۲۶ اردی بہشت ۹۹۴ھ مطابق ۲۶ اپریل ۱۵۸۶ء کی شام کو پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی ماں راجہ بھگوانداس کی بیٹی اور راجہ مان سنگھ کی بہن مانی بائی سمجھی جاتی تھی۔ سلطان نثار باپ سے پہلے مری تھی۔ باپ ۱۰۳۷ھ[9] یعنی ۱۶۲۷ء میں فوت ہوا ہے۔ تاریخِ جہانگیر میں مسٹر گلیڈون GLADWIN اس کا نام سلطان النساء اور سالِ پیدائش ۱۵۸۹ء لکھتے ہیں[10]۔

شاہزادی کی تاریخِ وفات کے بارہ میں جو اختلاف ہے اُس کو رفع کرنے یا صحت و تحقیق کا یہاں موقع نہیں نہ ضرورت ہے۔ البتہ بہشت آباد (سکندرہ) میں اُس کے دفن ہونے کی روایت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے۔ مولوی سعید احمد تاریخ آگرہ میں فرماتے ہیں "اس کمرے (مرقد اکبر) کے برابر والے دوسرے کمرے میں جو خوشنما جالیوں اور فرش اور تعویذ سے مزین ہے ایک قبر ہے...... اس میں جہانگیر بادشاہ کی بڑی لڑکی سلطان النساء بیگم دفن ہیں، جو شاہزادہ خسرو کی بہن تھیں۔ ان کا انتقال ۲۴ شعبان ۱۰۵۶ھ کو بعہد شاہ جہاں بادشاہ ہوا تھا۔"[11] یہ تاریخ ۵ ستمبر ۱۶۴۶ء کے مطابق ہوتی ہے۔

---

[1] صفحہ ۲ [2] صفحہ ۲۹۰۔ [3] یہی نہیں سلیمان شکوہ پسر شاہ عالم بھی یہاں ۱۲۵۳ھ میں دفن ہوئے تھے۔ اُن کی دو بیگمیں بھی یہاں راحت گزیں ہیں۔ (ذکر فوہرر صفحہ ۷) [4] صفحہ ۹۴۳۔ [5] جلد دوم صفحات ۳۰۲ و ۳۰۳۔ [6] بادشاہ نامہ خود شاہجہاں نے نام رکھا تھا۔ مرزا صاحب درباری مورخ اور شاہجہاں کے منشی تھے۔ [7] بابت ماہ جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۷۔ [8] جلد سوم صفحہ ۴۹۳۔ [9] شاید کتابت یا طباعت کی غلطی ہے۔ جہانگیر کی وفات کی تاریخ ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ روز یکشنبہ ہے۔ (از جہانگیر نامہ صفحہ ۳۹۵)۔ اور یہی ۱۶۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے [10] صفحہ ۱۲۰۔ [11] مرقع اکبر آباد صفحہ ۱۰۵۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اس کو ۱۶۲۳ء میں دیکھا اور نامکمل پایا تھا۔ لکھتے ہیں کہ مقبرہ بنایا جانا شروع ہوا ہے[1] پروفیسر بینی پرشاد فرماتے ہیں "مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ مادۂ تاریخ جو روضہ پاک سے جو مقبرہ پر تحریر ہے سال ہجری ۱۰۳۴ نکلتا ہے، جو ۱۶۲۵ء کے مطابق ہے[2]" میرے خیال میں کسی توضیح کی ضرورت نہیں۔ ۱۰۳۴ سال بنا یعنی عمارت کی بنیاد پڑنے یا شروع ہونے کا ہے، ختم تعمیر کا نہیں۔

مفتاح التواریخ میں مرقوم ہے کہ گنبد کے اندر بہت سے اشعار خوشخط نستعلیق میں لکھے ہیں۔ لیکن بعض کہن سالی و گردش روزگار سے مٹ گئے ہیں[3] سو برس گزرے مسٹر ٹیبل کو اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ بھی بعض کو پڑھنے اور پڑھوانے سے قاصر رہے تھے۔ اس لئے اسی قدر لکھ دینے پر اکتفا کیا تھا، جہاں تک پڑھا جاتا ہے پہلا مصرع یہ معلوم ہوتا ہے۔ خرم آں روز کہ ما رخت ازیں خانہ بریم۔ اس گنبد کی تعمیر کا قطعۂ تاریخ تین شعروں کا تھا جو دروازے کی پیشانی پر کندہ تھا، مگر پہلا شعر یا مطلع بالکل پڑھا نہیں جاتا۔ باقی دو شعر یہ ہیں" جو ابھرے ہوئے حروف میں لکھے ہیں۔ ان کے گرد موقع موقع سے سبز رنگ کی گلکاری ہے۔

بروملائک رحمت ہمیشہ نور نثار — زہے نمونۂ خلد بریں بمرکز خاک

خرد ز سال بنایش بصفحۂ فکرت — نوشت باقلم اختراع روضۂ پاک

۱۰۳۴ [= ۱۶۲۵ء]

کتبہ فقیر سلطان سرہندی

پورے وثوق کے ساتھ تو شاید وہ خود بھی نہیں کہہ سکے کہ یہ مقبرہ کس کا ہے اور کس ضرورت سے تعمیر ہوا تھا لیکن مسٹر ہوڈریج کا خیال یہ ہے کہ اس قطعہ میں لفظ 'نثار' سے سلطان نثار بیگم کے نام کی طرف اشارہ ہے[4] اس کی ماں راجہ بھگوان داس کی بیٹی تھی، مان سنگھ کی

---

[1] سیاحت نامہ، جلد سوم، صفحہ ۱۰۰۔ [2] تاریخ جہانگیر، صفحہ ۳۲۹ نوٹ۔ [3] صفحہ ۲۲۴۔ [4] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۴، نوٹ نمبر ۱۔

بھی مانی اور سمجھی جاتی تھی۔ مسٹر ڈیوہرسٹ فرماتے ہیں کہ اس کی بحر معمولی وزن کی محتاج نہ تھی[1]۔ یہ ادراک تو چنداں بڑی بات نہیں۔ لیکن ایک یوروپین ملکی عہدہ دار کی فنِ عروض پر ایسی گہری نظر اور اطلاع ضرور حیرت انگیز ہے۔ میرے ہم وطن فارسی اردو کے ممتاز سخنوران شاعرانہ نزاکتوں اور فن کی باریکیوں سے آگاہ ہیں۔ مرحوم نے تیسرے یعنی پہلے شعر کی نسبت کچھ تحریر نہیں کیا۔ منصبی خدمات کے سلسلہ میں وہ کچھ دن الہ آباد میں قیام فرما رہے تھے۔ یہاں کی عمارات و مقابر اور ان کے کتبوں کے متعلق سعی و تلاش کی تھی۔ افسوس ہے کہ باقی ماندہ اور بگڑے ہوئے شعروں کو وہ بھی دریافت نہ کر سکے۔

مسٹر بیورج نے اپنے قابلِ قدر مقالے میں لکھا ہے کہ خسرو کی ہمشیر سلطان النسا کی قبر پر یہ تفصیل ذیل کتبے ہیں۔

شمال کی طرف اوپر۔

زد قطع تعلق بکن امروز کہ فردا	آسودہ ز اغلال تا ببین ز سلاسل
از خود گزرا ے یار و ببین کہ کسے نیست	غیر از تو میان تو و مقصود تو حائل

دکھن دروازہ پر۔

گر ہمہ ملکات و مال جہاں جمع کنیم	ما بجز بیچ ہیچ زد نیا نہ بریم
بادشاہا تو کریمی و رحیمی و غفور	دست ما گیر کہ درماندہ و بے بال و پریم
در شارع دیں کوہ صفت سنگی و کاہل	[دوسرا مصرع غائب ہے]
تن دہ برضا کانچہ قضا بر تو نوشت است	از تو نشود دفع بہ تعویذ و حمائل
حق راستناس از نظر چشم و دل و گوش	کایں ہا ہمہ بر قدرت حق اند دلائل

مسٹر ڈیوہرسٹ کا ارشاد ہے کہ پہلی بیت میں جو مصرع "در شارع دیں" والا بیورج صاحب نے نقل کیا ہے وہ دراصل مصرع دوم ہے یعنی شعر کا نصف اخیر۔ اس لئے کہ اس میں قافیہ اور حرف روی موجود ہے۔ اسی طرح شعر کا پہلا مصرع بھی غلط تحریر ہو گیا ہے۔

---

[1] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی سنہ ۱۹۰۵ء، صفحہ ۴۴۰۔

مسٹر ڈوبر سٹ نے ان کتبوں اور اشعار پر کامل غور و مطالعہ کے بعد رائے زنی فرمائی ہے[1]۔ اس لیے پوری تفصیل کے ساتھ اُس کو درج کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"تیسری عمارت کے کتبے بدنصیبی سے نہایت نامکمل اور بڑی ناقص حالت میں ہیں۔ عملی طور پر یہاں چار کتبے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو چھوٹا سا جنوبی دروازہ پر جس سے ۱۲۳۳ء تاریخ نکلتی ہے [بر وملائک رحمت۔ تا روضہ پاک] عمارت کے مربع کے اندر دو لائنیں کتبوں کی ہیں جو گرداگرد یعنی چاروں طرف دوڑتی چلی گئی ہیں۔ اوپر والی قطار تقریباً بیس فٹ اور نیچے والی قریب نوفٹ کے فرشِ عمارت سے بلندی پر ہوں۔ اوپر والی رَو میں ایک ہی نظم بحرِ ہزج CATALECTIC میں تھی۔ جس میں زحافات بھی تھے جو خرب، و کف کہلاتے ہیں۔ اُن کا حرف رَوی 'ل' تھا ابتداً اس میں سولہ بیتیں تھیں۔ ان میں سے اس وقت کلاً یا جزاً صرف دس محفوظ ہیں۔ نیچے والی قطار میں دو جدا جدا نظمیں تھیں۔ پہلی بحرِ رمل میں، جس کا حرف رَوی 'میم' تھا دوسری CATALECTIC والی ہزج میں اور اُس کا حرفِ روی 'الف' تھا۔ پہلی نظم میں ابتداً آٹھ شعر تھے ان میں سے دو اس وقت پورے پورے موجود ہیں۔ باقی دونوں میں سے پہلا آدھا اور ایک جزو نصف دوم بالکل غائب ہو چکا۔ دوسری نظم اس سے بھی زیادہ مٹ چکی ہے۔ یعنی ابتداً دس شعر تھے ان میں سے صرف ایک ثابت و برقرار رہ گیا ہے۔ تین شعر اور تھے جن کا تقریباً نصف نصف موجود ہے۔ ان دونوں میں سے پہلی نظم کی ساڑھے چھ بیتوں کو 'غت ربود' (غلط ملط) کر دیا ہے اور ایک دوسرے کے مختلف اجزا ادھر ادھر لگا دیے ہیں۔

دوسری نظم فارسی کے مشہور شاعر خاقانی کی غزل ہے جو اُس کی کلیات مطبوعہ لکھنؤ کے صفحہ ۱۲۹ میں موجود ہے۔

پوری غزل یہ ہے۔

وقت آنست کزیں دارِ فنا در گذریم — کارواں رفتہ و ما بر سرِ رہِ مسفریم

---

[1] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۸۔

۲ زادِرہ ہیچ نداریم چہ تدبیر کنیم — سفر دور و درازست و سے بے خبریم
۳ پدر و مادر و فرزند و عزیزاں رفتند — وہ چہ ما غافل و مستیم چہ کوتہ نظریم
۴ دم بدم می گزرند از نظرِ ما یاراں — ایں قدر دیدہ نداریم کہ بر خود نگریم
۵ خانہ و خانقہ و منزلِ ما زیر زمیں — ما بہ تدبیر سرا ساختن و بام و دریم
۶ خانۂ اصلی ما گوشۂ خوابستان است — خرم آں روز کہ ایں رخت بداں خانہ بریم
۷ گرہمہ مملکت و مالِ جہاں جمع کنیم — لیک جز پیرہنِ گور ز دنیا نہ بریم
۸ بادشاہا تو کریمی و رحیمی و غفور — دستِ ما گیر کہ درماندہ و بے بال و پریم
۹ یارب از لطف و کرم عاقبتِ خاقانی — خیر گرداں تو کہ ما در طلبِ خواب و خوریم

اس کا چھٹا اور ساتواں شعر اب تک موجود ہے۔ البتہ چھٹے کا نصف دوم "ما بجز پیرہنے ہیچ ز دنیا نہ بریم" پڑھا جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں "بر خود نگریم" آخر سے غائب ہے۔ کلیات کا پانچواں شعر غالباً کتبے میں شروع ہی سے نہیں لکھا گیا تھا۔ چھٹے شعر کا نصفِ دوم جس کو غلطی سے بیل صاحب نے ان نظموں کا پہلا شعر سمجھا ہے، اب بالکل نظر نہیں آتا۔ یہ امر قابلِ تحریر ہے کہ یہ نظم اور دوسری اور جو اس کے اوپر ہے، اور خسرو کی قبر کا کتبہ، سب کے سب عمارت کی پچھم سمت کے وسط سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی کعبہ (مکہ) کا رُخ ملحوظ رکھا گیا ہے۔

تیسری نظم سے صرف ایک شعر پورا باقی رہ گیا ہے۔
بگفتی حالِ شاں بودی زبانِ سوسن ار گویا — چہ می دانند کسے حالِ گل اندا ماں بزیرِ گل
تلاش کی جائے تو کسی نہ کسی مشہور شاعر کے دیوان میں اس عمارت کی باقی ماندہ دونوں نظموں کا بھی پتہ چل جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کلام یا اس طرح کا معمولی شعر اکا نہیں ہو سکتا جو محض تاریخیں نکالنے اور موزوں کرنے میں مشتاق ہوتے ہیں[۱]۔"

ان تینوں فاضل مستشرقین کی سعی و التفات قابلِ تشکر و امتنان ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پوری

---

[۱] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۹ء، صفحہ ۷۴۴۔

کوشش کرنے سے اب بھی بعض مزید اشعار کا پتہ چل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کاتب وغیرہ کا نام بھی ملتا ہے۔ بہت سے شعر اور مصرعے بالکل محو و محو ہو رہے ہیں۔ بعض کے مصرعے اور الفاظ اُدھ کٹے ہیں۔ نگاہ پہ زور دینے اور فہم کی مدد سے ان بے نظم و ترتیب شعروں یا لفظوں کو جیسا کچھ میں پڑھ سکا ہوں ذیل میں نقل کرتا ہوں۔ شاید کوئی ذی علم بزرگ توجہ فرما کر بقیہ اشعار و مصرعوں کو بھی پورا کر دے۔

قدم نہ بر سر ہستی کہ ہست مایۂ ادنا ....

. . . . ہستی را و ترکِ خود فروشی کن ... کہ در بازار دیں خواہند ....

براق مکر ریک شب معراج حقیقت دل ... بگوش سرِ جاں بشنو ....

در خوردن و خفتن چہ شوی ہمسر انعام ... می کن سعئے تا نشوی کم ز عوامل ۰۰۰

.... ماں فسر د گر خود ... زآہن بود ت عرق وز بولاد سنا صل

.... در شارع دیں کوہ صفت سنگی و کاہل

ایں طول امل چیست ندانی کہ زمانہ ... شد عمر ترا تا بقید .... معطل

از نیست بہ ہستی و ہستی برہ نیست ... تا شہر وجود است ....

عمارت اور اُس کی خصوصیات

یہ مقبرہ (بلا قبر) اور مقبروں سے کئی باتوں میں، ساخت و خوش نمائی، پتھر کی مضبوطی و دیرپائی
کے لحاظ سے ممتاز ہے۔ اس کا شلجم (شلغم) نما گنبد، بلند نوک دار محرابیں، خوبصورت نقش و نگار
مخصوص وضع و قطع کے نیم دائرہ ستون سب کے سب ایک حیثیت منفرد و جدا رکھتے ہیں۔ اور جو مغلیہ
طرزِ تعمیر کے اچھے علم بردار کہے جا سکتے ہیں۔ ستر ادیہ کر اس کے ابقا و درست حالی میں قدرتِ مطلقہ
نے بھی اپنے دستِ کرم اور فیاضیوں سے زیادہ حصہ دیا اور یہ کامیاب ہے۔ صدیاں گزر چکیں، آب
و ہوائیں بدلتی رہیں۔ سخت سے سخت موسم آئے اور چلے گئے۔ لیکن اس کے خارجی تکلفات، نقاشی
گلکاریوں اور پتھروں کی اصلی رنگت پر بہت کم اثر ڈال سکے۔ آس پاس کے مقبروں کے پتھروں پر
سیاہی دوڑ آئی۔ کائی نے بھی جا بجا گھر لیا۔ لیکن اس عمارت کے نیچے والے حصہ کو چھوڑ کر جہاں کہیں
کہیں کائی اب اپنا قدم جمانے لگی ہے باقی پتھروں کی سُرخی و سفیدی بدستور باقی ہے۔ بالائی رد کار
کے پتھروں کی کھلتی ہوئی زردی، سنگ کسوٹی کی مرمریت صاف نمودار ہے۔ اور خوب رونق دکھا رہی ہے۔
پتھر اپنے تمام احسن منقوشات و مکتوبات و محکوکات کے ساتھ بالکل سالم اور محفوظ ہیں۔

اب یہاں سے بے لطف و بے کیف تفصیلات و تشریحات شروع ہوتی ہیں۔ اندیشہ ہے کہ
نظر بچا کر پڑھنے والوں کو ان کے سمجھنے میں اُلجھن، تو سلسلہ بیان کو ذہن نشین رکھنے میں زحمت و
کلفت ہوگی۔ مگر کم نصیب لکھنے والے کو اپنے فرض کی انجام دہی سے چارہ نہیں۔

حافظ گر زمین زندیدی بیکران آب و گل   آمدے در سینۂ داغم ازیں دنیا کا ابن تیما

روضہ کی عمارت چار فٹ ایک انچ بلند چبوترہ پر اُٹھائی گئی ہے۔ مربع ہے۔ جس کا مربع
بتیس (۳۲) گز ہوگا۔ باہر والے مقبروں کی طرح یہ بھی دکن رویہ بنی ہے۔ چاروں طرف نو نو گز کا سنگین
فرش ہے۔ اصل عمارت یعنی پہلی منزل کی دیوار بیس بیس گز ہر طرف سے ہے۔ ساڑھے تین فٹ
موٹی۔ دوسری دیوار اس سے آٹھ فٹ کے فصل پر اندر کی جانب ہے۔ اسی دیوار پر پوری عمارت کا
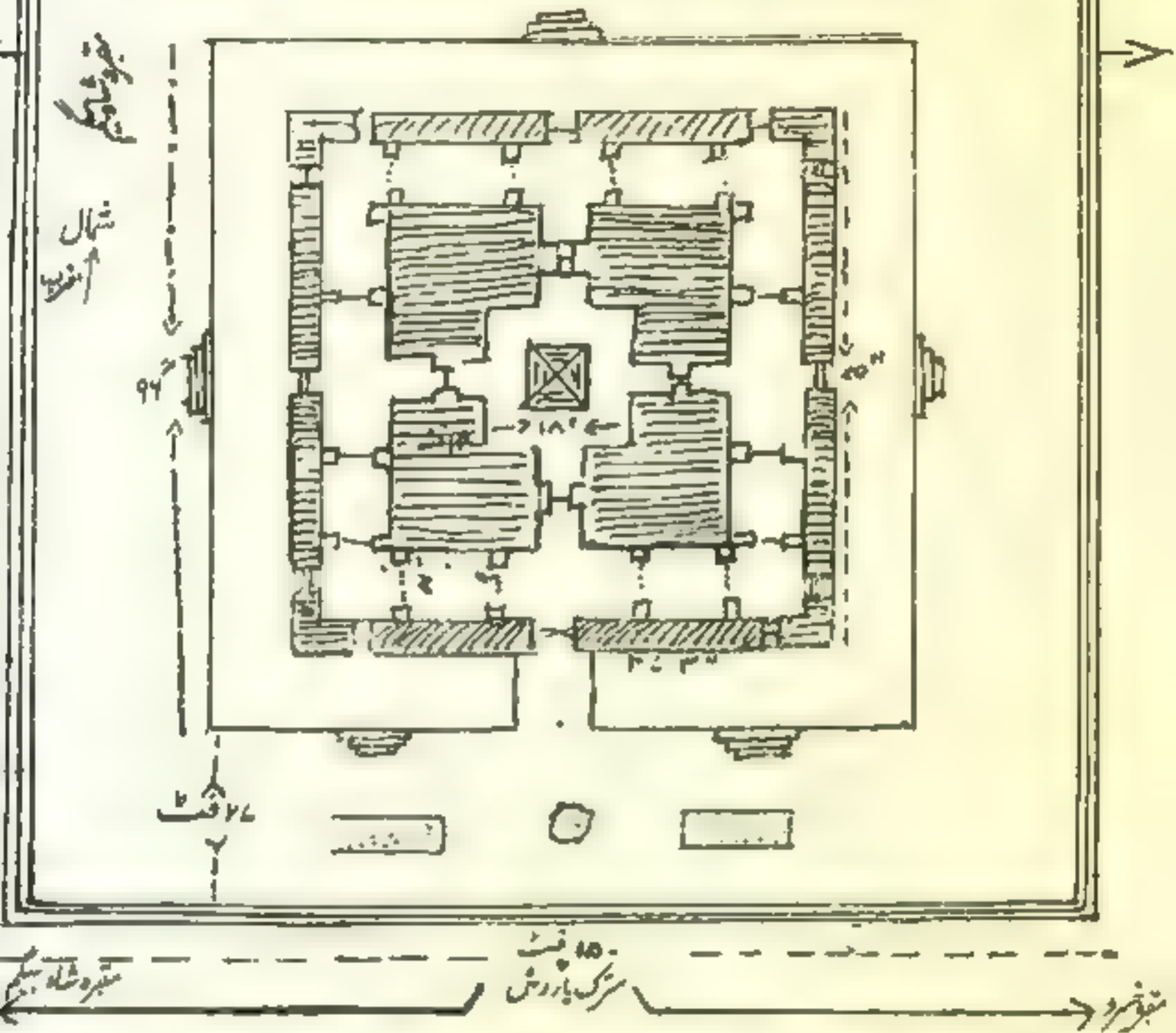
بوجھ پڑتا تھا اس لئے اس کی چوڑائی چار گز (بارہ فٹ) رکھی گئی۔ حجرہ برائے قبر "اندر اندر" طول و عرض میں مساوی یعنی چھ گز ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عمارت کے داخلی حصہ میں عمارت کی بنیادی زمین سے زیادہ رقبہ لے لیا ہے۔ کھلے ہوئے حصہ نے کم پایا۔ اس تجویز تقسیم کی اچھائی برائی کا فیصلہ تو اہل فن اور ارباب کمال ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ آشکارا ہے اور مسلّم کہ غلام گردش اور حجرہ کو چھوڑ کر بہت سی جگہ چونے اور پتھر کے تصرف میں آ گئی ہے۔

صدر دروازہ چبوترہ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ ہمسایہ مقبروں کے مقابلہ میں یہ دروازہ، اس کے اوپر والی محراب اور پیش طاق سب فراخ تر و کشادہ ہیں۔ محراب دس فٹ اونچی، چھ فٹ چار انچ چوڑی ہے۔ پیش طاق نقوش و گلکاری سے آراستہ و خوبصورت ہے۔ پھاٹک پر محراب کے دونوں جانب پتھروں پر ایک ایک دائرہ اُبھرا ہوا تراشا گیا ہے۔ جس میں کلمۂ طیبہ مرقوم ہے۔ دکن رخ سنگی فرش پر سبزۂ و گل کے تر و تازہ خیابان ہیں۔ ٹھیک پھاٹک کے سامنے ایک ہشت گوشہ حلقہ میں مختصری کیاری ہے۔ گز بھر قطر۔ اسی کے برابر ادھر اُدھر دو کیاریاں اور ہیں۔ فرحت بخش و نشاط افزا۔ امیر مرحوم نے کیا اچھی تشبیہ اسی سے پائی ہے۔

عارض تر اے گلبدن اک اس طرف اک اُس طرف　　　گویا کھلے ہیں دو چمن اک اِس طرف اک اُس طرف

یاد ہوگا کہ چبوترہ کی بلندی یعنی عمارت کی کرسی چار فٹ ایک انچ ہے۔ اس چبوترہ کے تین جانب، ہر جانب کے وسط میں، تین تین سیڑھیوں کا ایک ایک زینہ اوپر چڑھنے کے لئے بنا ہے۔ دکن کو دروازہ کے دونوں طرف سیڑھیاں ہیں۔ ۷ × ۵ فٹ زمین گھیری ہے۔ یہ سیڑھیاں ایک فٹ چار انچ چوڑی ہیں۔ ان سیڑھیوں اور چبوترہ کی دیواروں پر نقاشی تو نہیں، لیکن سنگ تراشی اچھی خاصی کی گئی ہے۔ پتھر گڑھ کر لگائے اور اُن کے کنارے صفائی سے کاٹ کر خوب ملائے ہیں۔ پتھر کی چھ چھ کوٹھیاں شامیانہ نصب کرنے کے واسطے چبوترہ کی دیواروں میں مضبوطی کے ساتھ لگی ہیں۔

چبوترہ کے بعد ہی عمارت کی پہلی دیوار بارہ فٹ بلند ہے۔ عمارت کی پہلی منزل اس پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس دیوار کے ہر پہلو میں منقش ستون اور طاقوں اور محرابوں کے کچھ پست اور کچھ اُبھرے ہوئے نشانات جلوہ ریز ہیں۔ یہ ہی آدھے کھمبے ہر طرف کی دیوار کو پانچ حصوں یا ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک حصہ میں تین تین طاق دو مختلف وضع و طرز کے بنے ہیں۔ ان کے نیچے ڈھائی ڈھائی انچ پتھر اور گُھدے ہوئے ہیں۔ اس طرح پر ہر جانب چھ چھ ستون ہیں۔ چار چار تو درمیان میں بعین و مساوی فاصلہ پر ہیں اور دو دو دیواروں کے دونوں کناروں پر۔ لیکن دکن طرف پھاٹک واقع ہوا ہے اور اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں، اس لئے اُدھر صرف چار کھمبے ہیں۔ ستون اور طاقوں

کی صورت نقشہ سے واضح ہوگی۔

یہ ستون دیوار میں نیم پیوست ہیں۔ ان کی گولائی (رشاتی) نصف سے کم باہر نکلی ہوئی ہے جیسا کہ کہہ چکا ہوں یہ کھبے اور طاق اور ان کی پیشانیاں نقشین اور نہایت خوشنما بنی ہیں۔ شامیانہ و سایبان لگانے کے لئے ستونوں پر بھی توڑے نصب ہیں طاقوں کی پیشانی بھی منقش ہے۔ محرابوں کے پہلوؤں پر "اللہ اللہ" لکھا ہے، مگر دیواروں کے درمیانی یعنی بیچ والے طاق پر پورا کلمۂ طیبہ۔ چبوترہ سے طاقوں کی بلندی پانچ فٹ دس انچ ہے

دیواروں میں تینوں جانب تین تین، روشندان یا پتھر کی جالیاں ہیں۔ [سطحی خاکہ ملاحظہ ہو] ان میں سے ایک تو وسط میں ہے، اور ایک ایک دونوں کناروں پر۔ ان کا ارتفاع ڈھائی ڈھائی فٹ ہے۔ دو فٹ دو انچ چوڑائی۔ ان سے حجرہ (برائے قبر) میں کافی روشنی پہنچتی ہے۔

رُوکار میں سنگِ سرخ استعمال کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں سفیدی بھی جھلکتی ہے۔ اونچی اونچی دیواروں کے اوپر والے حصہ میں سنگ کھٹو یا مرمرِ زرد[1] نے غالب حصہ پایا ہے۔ یہ موسمی اثروں اور سیاہی سے اب تک بچا ہوا ہے۔

پہلا دروازہ پانچ فٹ گیارہ انچ اونچا، تین فٹ آٹھ انچ چوڑا ہے۔ چوکھٹ بازو پتھر کے، کواڑ یا پٹ لکڑی کے ہیں۔ ہر پلہ خوشنما کام کے ساتھ چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس عمارت کے سب دروازے یکساں وضع و ساخت کے ہیں۔ ان کو پانی اور دھوپ سے بچانے اور رنگنے کے لئے سرخ لاکھی یا گیوا رنگ شاید ایک مدت دراز سے انتخاب و استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ صدر دروازہ سے گزر کر گیارہ فٹ کے بعد ایک دوسرا دروازہ ملتا ہے۔ پرانے نمونہ پر نئی لکڑی کا تیار ہوا ہے۔ دروازہ اور پھاٹک کے درمیانی حصہ میں دونوں گوشوں میں "استحفاظِ آثارِ قدیمہ" کے متعلق سرکاری اعلان آویزاں ہیں۔ یہ نیلی خام آہنی تختیوں پر سفید روشنائی
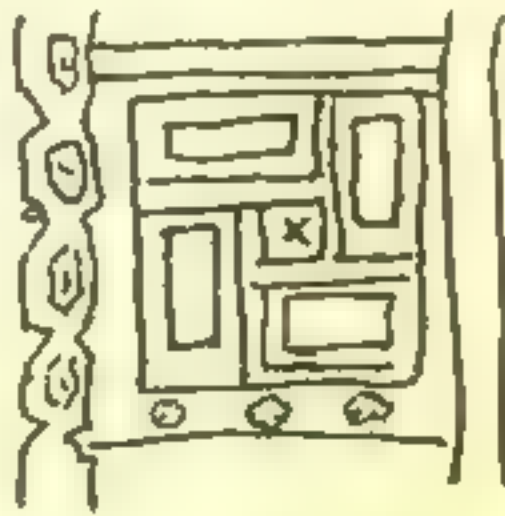
---

[1] اس زرد پتھر (کھٹو) کی نسبت میری اطلاع یہ ہے کہ اب ان اطراف میں دستیاب نہیں ہوتا۔ استعمال بھی کم ہے۔
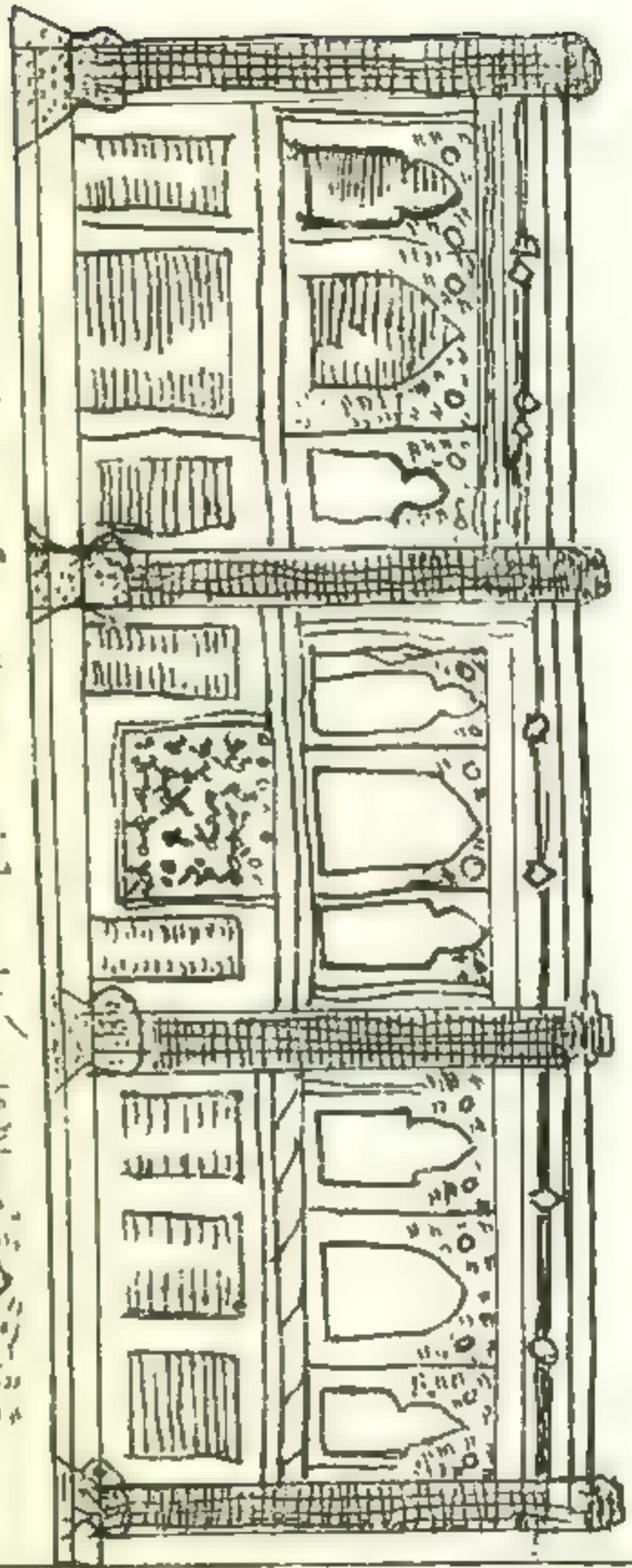
اس کی کان دو جگہ تھی، ایک سندھ میں بھکر، سکھر، ٹھٹھہ وغیرہ کے نواح میں کوہ مکلی کی قبروں میں لگایا گیا، دسویں صدی ہجری

سے خوشخط نستعلیق میں تحریر ہیں۔ پہلا نوٹس، حسبِ معمول زیرِ قانونِ تحفظ و احترامِ مساجد کہن ہے۔
عمارت کو ضرر پہنچانے والے کو جرمانہ کی وعید (دھمکی) ۔ دوسرا حاکم ضلع کی طرف سے، ذیل کی چھ
دفعات و مقاصد پر مشتمل ہے۔ (۱) دیواروں کو چراغ سے سیاہ کرنے کی ممانعت۔ (۲) اُن پر لکیریں
کھینچنے کی ممانعت۔ (۳) مقبرہ کے فرش پر کھیل کود اور دعوتوں کی ممانعت۔ (۴) کتّوں کو اندر لے جانے
کی ممانعت۔ (۵) ہر اُس بات کی ممانعت جس سے مقبرہ کی حرمت میں خلل پڑے۔ خلاف ورزی
کرنے والا نکال دیا جائے گا۔ مقدمہ بھی قائم ہوگا۔

خواندہ، شائستہ و مہذب تماشائی ان ہدایات کا استقبال و احترام تعمیل سے نہیں بلکہ موقع
پا کر تمسخر و انحراف سے فرماتے ہیں۔ روز روز کی بات ہے کہ بہت سے نام اور دستخط برابر لکھے جاتے
اور مٹائے جاتے ہیں۔

دروازہ سے داخل ہو جانے پر پہلے غلام گردش ملتی ہے، اُس کے بعد حجرۂ قبر کا دروازہ۔ یہ پرانا یا
اصلی معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا دروازہ اگر کھلا ہو اور کوئی شخص پہلے دروازہ سے کھڑا ہو کر دیکھے تو اُس کی
نگاہ دوسری سمت، حجرہ کے سامنے والی بڑی جھنجری سے گزر کر دیوار کی باہر والی جالی سے باہر نکل
جائے گی۔ اسی طرح چاروں طرف سے ہلکی ہلکی روشنی آتی اور حجرہ کو منور رکھتی ہے۔ سطحی خاکہ میں اس
کے مناسب مخارج و مداخل دکھائے گئے ہیں۔

غلام گردش، ۳ فٹ چوڑی ہے۔ جس کو محرابوں سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (تقریبے
ظاہر ہوگا) اس کی چھت بہت نیچی ہے۔ چھ فٹ بلندی تک دیوار کو پہنچا کر چھت کی گولائی شروع،
اور نیم دائرہ سے بھی کم رہ جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ مجموعی ارتفاع گیارہ فٹ ہوگا۔ باہر اور اندر کی بلندی کا
حساب لگانے سے پانچ فٹ کا تفاوت ہوتا ہے۔ اس سے پہلی منزل کی چھت (اپنے منتہائے گولائی
پر) پانچ فٹ موٹی ہے۔ چھت کی گولائی میں پست و بلند، مثلث نما قاشیں تراشی اور جالی دار جال
بنائی بھی گئی ہیں۔ ان میں ابتداءً یا کسی زمانہ بعید میں سرخ، زرد اور نیلے رنگوں سے نظر فریبی پیدا
کی گئی تھی۔ اب ان پر سفیدی کی تہیں یا تین موٹے موٹے پرت پڑے ہوئے ہیں۔ مرمت و قلعی میں

میں باکثر استعمال ہوا اور دیکھا گیا ہے۔ دوسری پرگنہ ناگور میں۔ ایک پہاڑ یک شہر، دو موٹے اسی ایک نام کے ہیں۔ ریل سٹیشن

استیاطانہ ہونے سے بعض بعض جگہ ان پرتوں کے اکھڑ جانے سے یہ جال اور چھت کے کٹے ہوئے پھول اور زنجیرے
نمودار ہو گئے ہیں۔ یہ خرابی جنوب و مشرق کے گوشوں میں خاص طور پر بہت کشادہ نما ہے۔ سپاٹ چھت
نکلتی آتی ہے۔ پچھم والے ٹکڑے میں بیچ کی محراب کے پھول بھی مائل زوال ہو رہے ہیں۔ موسمی ہواؤں اور
رطوبت و نمی نے چھت کے بعض پتھروں کی بیرونی سطح کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ یہ مثلث
نقوش اور پھول بھی رخصت ہو جائیں گے۔ گوشوں اور بیچ میں جو کچھ باقی ہیں اب بھی اچھے اور اچھے
کٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

غلام گردش کے گوشوں کی جالیوں پر محکمہ تنظیم عمارت نے تار کی جالیاں بھی لگا دی ہیں۔ اس
سے باہر کی کوئی چیز اندر ڈالنا یا پہنچانا اور کنار خزاں زدہ خشک پتیاں بھی وہاں نہیں جا سکتیں۔ غلام گردش
کی محرابوں کے درمیان دیواروں کے دونوں جانب طاق بنے ہیں۔ دو فٹ اونچے ایک فٹ سات انچ
چوڑے ہیں۔

حجرۂ قبر میں داخل ہونے کے لئے دروازہ کے بعد بارہ فٹ کی دیوار طے کرنا ہوتی ہے۔ اس کا رقبہ
چھ گز یا اٹھارہ فٹ مربع ہے۔ دیوار حجرہ ساڑھے چار فٹ بلند ہے۔ اس کے بعد چھت کی گولائی شروع
ہو جاتی ہے اور محرابوں کے نشانات چھت کی گولائی کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک اوپر اوپر بلند ہوتے چلے
جاتے ہیں۔ ان محرابوں کا شمار آٹھ تک پہنچتا ہے۔ محرابوں کے گرداگرد وہی مثلث و مدور پھولوں کے پیچ
در پیچ سلسلے بننے لگتے ہیں۔ جو چھت کی منتہائے بلندی پر پہنچ کر ختم ہوتے ہیں۔ چھت مدور و محدب ہے۔
اس پر بھی مثلث نما پھول بنے ہیں اور ان کی آرائش و پیرایش مختلف شوخ رنگوں سے کی گئی ہے۔ چھت
میں جھاڑ فانوس لٹکانے کے لئے کڑا لگا ہے۔ دیوار میں دونوں جانب طاق اور دو دو دیواروں کے اتصال
پر گوشوں میں ڈھکے ہوئے چراغدان ہیں۔

اس کمرہ میں ایک مسطح و ہموار چبوترہ ہے۔ سوا نو فٹ مربع۔ دو فٹ بلند۔ بعض اس کو قبر مانتے ہیں۔

بھی ہے اب کھاٹو بھی کہلاتا ہے۔ یہ زیارت ناگور اہم مقام ہے بعض تعمیرات بر سلطان التمش (متوفی ۶۳۳ھ = ۱۲۳۵ء) کے

مگر صاحب قبر کا نام یا نشان نہیں جانتے۔ قبر ہونے کی معمولی علامتیں بھی اس میں پائی نہیں جاتیں۔ یوں، پھول سب چڑھاتے ہیں آ کر مزار پر۔ تھوڑی سی دماغی وذہنی کاوش اور چشم وانگشت کی غمازانہ ورقیبانہ سازش وکاوش سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چبوترہ کو محدود ومرتب کرکے اندر سے کھوکھلا (خالی) چھوڑ دیا ہے۔ انتظار ہوگا کہ کسی انسان کا جسد خاکی اس کا دعویدار اور اس کی مستقل آبادانی وتصرف کے واسطے تیار ہو۔ فاک بر سر، اس وقت تک کے لئے اس کو خشک مٹی سے بھروادیا تھا جو بہ وقت بہ آسانی نکالی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی بیرونی سطح نہ ٹھوس ہے نہ محکم واستوار۔ قلعی اور سفیدی کی مرہون تہوں نے محض ہنگامی ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ اس چبوترہ پر کسی قسم کے نقش ونگار بھی نہیں ہیں۔ فرش دیواروں میں گڑے ہوئے پتھر لگے ہیں جو ہر رخ کو تین تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اس کمرہ کی دیواروں میں جالیاں غلام گردش کی جانب لگی ہیں۔ پتھر کی ہیں، پر دہ زائد ہوئی۔ ضخ بڑے بڑے اب مقبرہ کا بالائی حصہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے۔ اسی (دکن) طرف پھاٹک سے دونوں جانب زینوں کا دوہرا سلسلہ اوپر کو چلا گیا ہے۔ ہر ایک میں تیرہ تیرہ سیڑھیاں ہیں۔ ہر سیڑھی ایک فٹ چوڑی اور ایک فٹ سے بھی کم اونچی۔ اوپر کی چاروں سیڑھیاں اور سیڑھیوں سے بھی نیچی ہیں۔ ان کا میدان یا زیادہ کی صرف پانچ انچ ہوگا۔ دروازہ کی محراب زینوں اور سیڑھیوں کی شکل یہ ہے۔
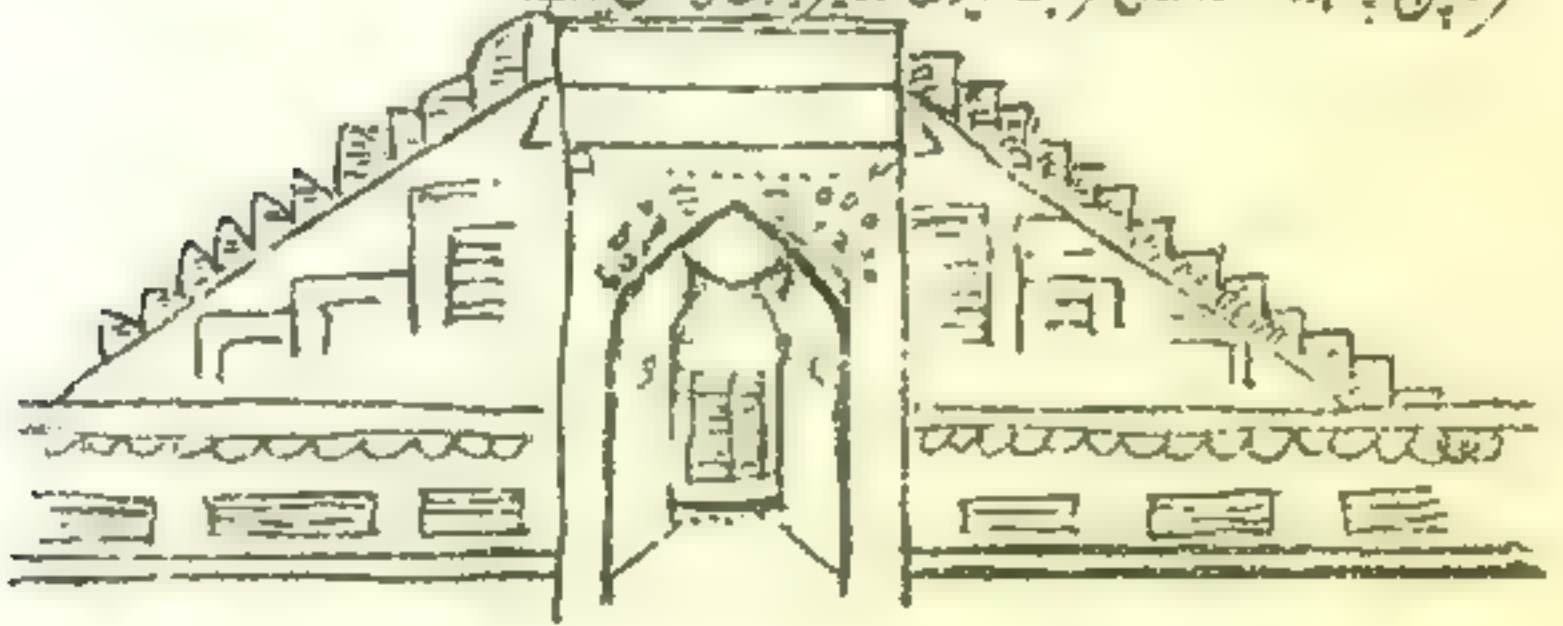
پہلی منزل یا غلام گردش کی چھت ساڑھے گیارہ فٹ ہے۔ اس کے بعد ہی تیسری منزل کی دیوار شروع ہوجاتی ہے۔ اس کے دروازہ میں داخل ہونے کے لئے چار قدموں کی سیڑھی ہے۔ دیواریں بلند

* حدود ہیں۔ مگر شہرت اس کی زیادہ تر اسی مقبرہ سے ہوئی۔ اس کی بدولت ہوئی محمد شاہی عہد سے یہ علاقہ راجپوتوں کی جاگیر رہا جو دیور کی ریاست میں ہے۔

ہیں۔ پھاٹک بلند ہے۔ پھاٹک کے بائیں جانب یعنی پچھم زینہ چلا گیا ہے۔ پھاٹک کے بعد نہایت
شاندار کھلا ہوا (ہال) کمرہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے اندر نیچے سے لے کر اوپر (زیرِ گنبد) تک تمام
منقش ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ، اس کے مثلث نما پھول قریب قریب ویسے ہی ہیں، جیسے کہ
نیچے کی عمارت میں دیکھے گئے تھے۔ یہ بالائی کمرہ تیئیس (۲۳) فٹ مربع ہے۔ اس میں پتھر با قاعدہ
تراشوں اور شکنجوں سے جڑے گئے ہیں۔ شکل یہ ہے۔

پتھر کے اس فرش کو دھونے اور صاف رکھنے
کے لئے نالی بنی ہے۔ دروازہ کی سنگی چوکھٹ کے نیچے
ہو کر پانی بہ آسانی کھلی چھت پر چلا جاتا ہے۔ اس کمرہ میں
چار دروازے ہیں۔ چوکھٹ بازو پتھر کی۔ اس وقت
خالی کھڑی ہے۔ کبھی اس پر جالی لگی ہوئی تھی۔
حسبِ معمول بغلوں میں کواڑوں کی جگہ چھٹی ہوئی ہے۔ پاٹاؤ میں چولوں کے لئے سوراخ ہیں۔
نیچے گردہ کے لئے گول جگہ۔ خود یہ بازو بھی خالی نظر نہیں آتے ان میں بھی جا بجا سوراخ ہیں۔
اس تعمیرِ بالائی کی دیوار نو فٹ سات انچ موٹی ہے۔ چاروں دروازوں کی محرابیں چودہ چودہ فٹ
بلند ہیں۔ ان کے قریب ہی سے اوپر کو بلند محرابوں کا دوسرا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی آٹھ
ہیں ادھر کی چاروں بیچ والی محرابوں میں گلدستہ نما جالی ہے۔

بانیانِ عمارت کا ارادہ و مقصد جو کچھ رہا ہو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کو آراستہ و پیراستہ
رکھنے کے لئے خاص انتظام و اہتمام مد نظر رکھا گیا تھا۔ اس وسیع کمرہ کے لئے ہر قسم کا ساز و سامان،
شایانِ شان بہیا و فراہم کیا ہوگا۔ ادھر ادھر اوپر نیچے، محرابوں میں اور فرش پر گڑوں اور چھلّوں کی
ریل پیل، آرائش و ادوات روشنی کی افراط، شاہانہ ٹھاٹھ اور سجاوٹ کا پتہ دیتی ہیں۔
کمرہ کے باہر کی جانب نقشی محرابوں میں اوپر کی طرف پانچ پانچ کڑے۔ مجموعی ہیئت
یہ ہوتی ہے۔

ےہ اندر کی طرف محراب اور اُن کے
کناروں پر بھی چھوٹے چھلے لگے ہیں۔
جس میں زنتار ڈوریاں کلابتوں و ریشم کی باندھی
جاتی تھیں۔

ےہ کمرہ کی دیواروں کے جوڑوں پر بالکل
کونے میں' اوپر کو چاروں طرف دو دو سوراخ
کرتے۔ چھت کی بلندی پر بھی ایک مضبوط
موٹا سا کڑا ابتایا جاتا ہے کہ یہاں مخمل و کمخواب
کے زر اندوز زرکار شامیانے اور شادروان مناسب
چڑھاؤ اُتار کے ساتھ لگائے جاتے تھے۔
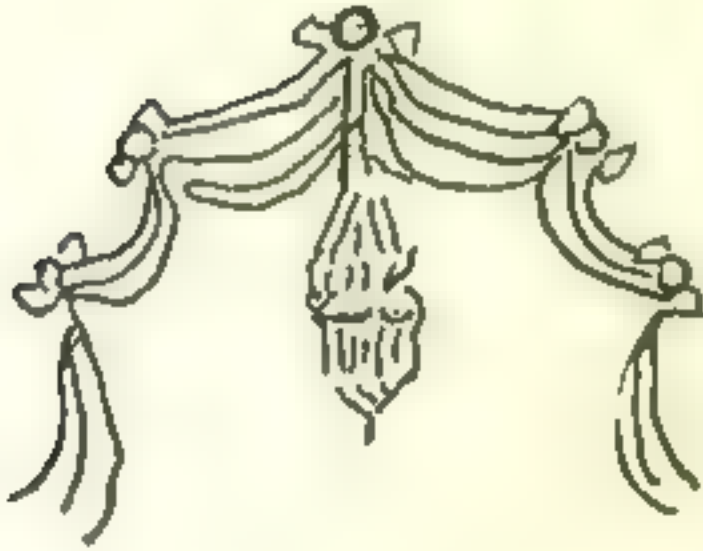
ےہ سنگی فرش کے چاروں
گوشوں میں چھلے۔ غالیچوں اور فرش
فروش کے بچھانے اور باندھنے کے
کام آتے ہوں گے۔

اب نہ عمارت ہی اپنی اصلی
حالت و شان پر نظر آتی ہے نہ انکی
آرائشوں اور تکلفات کا کوئی نشان
باقی ہے۔ یہاں دیکھنے والا گردن جھکائے گا تو جہانگیر و شاہجہاں کے عہد کی سطوت و شوکت' زیبائش
و تمکنت' محفلوں کی لطافت و نفاست اور سلیقۂ انجمن آرائی کی ایک جھلک دیکھ لینے سے محروم نہ رہے گا۔

شب گزشتہ کے ساز و ساماں کہاں ہیں شمع باقی ... زبانِ شمعِ سحر پہ حسرت کی رہ گئی داستان باقی

شکر ہے کہ سلطان نثار بانو کے مقبرہ کی ناگوار و تصدیع افزا مراحت و بیان فنی اصطلاحات اور

تعمیری تفصیلات کا طول طویل جنجال ختم پر آیا۔ پھر بھی اس سے زیادہ نہ خود سمجھ سکا نہ دوسروں کو سمجھا سکا کہ بلند چبوترے بالائے چبوترہ بنائے ہیں یا ایک پہاڑی پر دوسرا پہاڑ رکھ دیا ہے۔ اب صرف اسی قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس عمارت کے (بھی) چاروں گوشوں پر کوشک یا گلدستے بنے ہیں۔ خوش نما ہیں اور دلکش۔ آٹھ آٹھ نازک و سبک کھمبوں پر قائم ہیں۔ اپنے پاس والے مقبرہ یعنی خوابگاہ خسرو سے کسی قدر چھوٹے ہیں۔

اس عمارت کی ابتدائی تخیل و تشکیل، اس کا جامع و مکمل نقشہ، اس کی مجموعی خوبیاں اور شان، مضبوط استرکاری، بلیغ رنگ آمیزی، شاداب و نفیس مینا کاری، چمک، جلا، اور آب و تاب، حیرت میں ڈالنے والی جال دار اور پیچ دار تحریروں کا کام، ان اطراف بلکہ اقصائے ہند شرقی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر کوئی نظیر تلاش کرتا ہے تو آگرہ و لاہور کے اکبری و جہانگیری ویرانوں اور عبرت آفریں کھنڈروں پر نظر ڈالے۔

خسرو باغ کا تماشا گر بے شعور مقبول عذر خواہ ہے کہ اس ارم اساس تعمیر کی تعبیر کبھی کبھی لفظ "مقبرہ" سے کرنے پر مجبور ہوا ہے۔ پڑھے لکھوں نے اس کے معنی "گور مردہ" کے سُنے تھے اور جہاں تک تحقیقا ثابت ہوا ہے یہاں کوئی انسان دفن نہیں۔ مگر لکھنے والا کیا کرے کہ اس کی شہرت اسی نام سے ہے۔

برعکس نہند نام زنگی کافور

مقبرۂ تمبولن بیگم

باغ کے بیچ[1] وسط میں مغرب جانب ایک چوتھا مقبرہ، دروازۂ کلاں کے مقابل، یا سڑک کے دوسری طرف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بھی خسرو کی کسی بہن کا ہے۔ اور عرف عام میں 'تمبولن' یا 'بی بی تمبولن' کا مقبرہ کہلاتا ہے۔ یورپین مورخین میں سے 'اسٹیل'، 'فشر'، 'ہیویٹ' اور 'کین' صاحبان کے نزدیک غالب قرینہ یہ ہے کہ یہ وہی شاہزادی ہے جو فتحپور سیکری میں استانبولی بیگم کے نام سے شہرت رکھتی ہے۔ اس کے اندر نہ قبر کا نشان ہے نہ اس پر کوئی کتبہ۔

کرنیل ہوول اس کے متعلق دو باتیں لکھتے ہیں۔ (۱) روایتاً ایسا مشہور ہے کہ تمبولن کا مقبرہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہی فتحپور سیکری والی استانبولی بیگم ہو۔ (۲) دوسرا زبان زد قصہ یہ ہے کہ یہ مقبرہ خسرو کی ایک بہن نے اپنے لیے بنوایا تھا۔ مگر اتفاق وقت سے وہ کہیں اور مری اور وہیں دفن ہوئی[2]۔

ڈاکٹر فوہرر مقبرہ نہیں، بلکہ تمبولی بیگم کے مکان کے نام سے یاد فرماتے ہیں اور خسرو باغ کے خاص حصوں میں اس کو شمار کرتے ہیں[3]۔

ڈاکٹر بینی پرشاد اپنی تاریخ جہانگیر میں رقمطراز ہیں کہ ان تین روضوں کے علاوہ جن کا ذکر کیا گیا، اس باغ میں ایک چوتھی عمارت بھی ہے جو تمبولن کی قبر کہلاتی ہے۔ یہ انیسویں صدی میں مدت تک مسکن کا کام دیتی رہی۔ پھر لارڈ کرزن کے حکم سے اصلی صورت میں منتقل کر دی گئی[4]۔

سو برس پہلے بھی مسٹر نیل کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ یہ کس کا مدفن ہے۔ مشہور تھا کہ بی بی تمبولن کا روضہ ہے۔ بعض بودہ بائی کا بتاتے تھے[5]۔

خادموں کی روایت یہ ہے کہ تمبولی بیگم ایک ایرانی عورت تھی۔ اس کو جہانگیر ایران سے لے آیا تھا،

---

۱ گزیٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۴۵۔ گزیٹیر جدید مطبوعہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۳۔ ۲ گزیٹیر جدید مطبوعہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۳۔

۳ عمارات مغربی و شمالی اودھ کے منارے قدیمہ اور اُن کے کتبے، صفحہ ۱۳۔ ۴ صفحہ ۳۴۲۔ ۵ مفتاح التواریخ صفحہ ۳۳۵۔

اور اُسی کے ہاتھ کے پان کھاتا تھا۔ عہدِ جہانگیری کا مورخ اس کے ملنے میں تامل کرے گا اور اس کے جزدوکل کو بداہتہً لغو بتائے گا۔

اس بارے میں کہ آیا اکبر کے حریمِ عشرت میں کوئی سلطانہ استامبولی بیگم تھی بھی یا نہیں، شروع سے اختلاف اور گفتگو چلی آتی ہے۔ اہلِ فرنگ کی ایک جماعت اپنی دلبستگی اور جدت طرازی کے لیے ہمیشہ مُصر اور مدعی رہتی ہے، اور ہر محل پر استامبولی ملکہ اور اُس کے محل کا ذکر چھیڑ دیتی ہے۔ لفٹنٹ کرنیل ایچ اے نیول "آگرہ میں تین دن" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "ٹرکش سلطانہ" کا مکان نہایت مختصر مگر فتحپور بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔[1] مسٹر ہیول[2] نے بھی "آگرہ اور تاج کی ہینڈبک" میں "ٹرکش سلطانہ" کے مکان کا احوال سپردِ قلم فرمایا ہے۔[3] "قرونِ وسطیٰ کی تاریخ" میں مسٹر سی۔ ڈبلیو اسمتھ نے مغلیہ عہد کی تعمیرات کے ذیل میں "ٹرکش سلطانہ" کے گھر کا نام لیا ہے۔[4]

مسٹر کین "آگرہ کی ہینڈبک" میں فرماتے ہیں کہ فتحپور سیکری کے محلات میں عمارت کا ایک حصہ استامبولی بیگم یعنی اکبر کی ترکن بیوی کے نام سے منسوب و مشہور ہے۔[5] پھر ایک صفحہ آگے چل کر ایک نوٹ میں رقم پرداز ہیں کہ الٰہ آباد کے خسرو باغ میں جو مقبرہ ہے، اور تمبولی بیگم کا کہلاتا ہے، ممکن ہے کہ یہی بگاڑ کر استامبولی کر دیا گیا ہو۔[6]

---

[1] صفحات ۱۰۶ و ۱۰۵۔ [2] مسٹر ہیول EARNEST B. HAVELL ہندوستان کے صنعتی تعلیم سے وابستہ ہو کر یہاں آئے تھے۔ پہلے مدراس کے مدرسۂ صنعت میں مامور ہوئے۔ پھر کلکتہ بھیج دیے گئے۔ دس سال آرٹس اسکول کے پرنسپل اور گورنمنٹ آرٹ گیلری کے محافظ رہے۔ اسی زمانہ میں یونیورسٹی نے اپنا فیلو (رفیق) بنا لیا۔ ہندوستان کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد سفارت خانۂ برطانیہ سے تعلق و توسل ہو گیا تھا اس طرح کوپن ہیگن میں سات سال گزارے۔ سالِ ولادت ۱۸۶۱ تھا۔ ان کی زندگی کا آخری دن ۱۹۳۴ کا آخری دن تھا۔ اس لیے تاریخِ وفات بعض ۳۱ دسمبر سنہ ۳۴ء لکھتے ہیں اور بعض یکم جنوری سنہ ۱۹۳۵ء۔ اس ملک کی دستکاری اور صنعتوں کے بڑے قدرداں و مداح تھے۔ ان کی کتابیں اور تصنیفات بڑی عزت و استناد کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور نہایت تحقیق سے لکھی گئی ہیں۔ [3] صفحہ ۱۱۱۔
[4] صفحہ ۲۷۲۔ [5] صفحہ ۷۶۔ [6] صفحہ ۷۶۔

ڈاکٹر فوہرر فتحپور سیکری کے محلات و تعمیرات کے سلسلہ میں کچھ زیادہ روشنی ڈالتے اور تحریر فرماتے ہیں[1] کہ "خاص محل کے مغربی زاویئے پر ایک عمارت ہے جو جہانگیر کا مدرسہ کہلاتی ہے۔ جہاں سے ایک منقش پردہ دار دیوار کے باقیات و آثار شروع ہو جاتے ہیں، جو ٹھیک پورب کو زاویۂ مخالف کی سمت جاتے ہیں۔ یہاں پر اکبر کی ترکن بیوی کے کمرے تھے۔ جو رومی بیگم کا محل مشہور ہے۔ واضح رہے کہ زبانی روایات کو چھوڑ کر کوئی سند اس بات کی نہیں ملتی ہے کہ اکبر کی کوئی عورت ترکن بھی تھی یا یہ کہ کوئی عیسائیہ رہی ہو۔ الٰہ آباد کے خسرو باغ میں ایک مقبرہ ہے جو تمبولن بیگم کا کہلاتا ہے، اور بنا بگاڑ کر 'استامبولی' کر لیا گیا ہے۔ اور اس طرح اس راز کا پتہ یہاں سے چل جاتا ہے۔"[2]

مسٹر فرنیو Furneaux ان سب سے بڑھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "یہاں (الٰہ آباد میں) قلعہ سے باہر ہر چیز جدید ہے بجز خسرو باغ کے، جہاں اکبر کی یوروپین بی بی جو استامبول سے آئی تھی رہتی تھی اور جہاں خسرو دفن ہوا تھا"[3]۔ چلتی پھرتی چھاؤں یا اڑتے پھرنے والے انسان کی معلومات اور رسائی ذہن و قیاس اسی قدر ہو سکتی ہے۔

انجام سے بے پروا، آغاز سے بیگانہ | پروانے کی دنیا ہے بیتابیٔ پروانہ

مسٹر کین اور ڈاکٹر فوہرر نے استامبولی کو غلط اور تمبولی (بیگم) کو صحیح سمجھا اور مانا تھا۔ مگر حادثہ شہر الٰہ آباد کے ایک ہمہ داں بزرگ نے اسی کو صحیح قرار دیا اور تائید کی ہے اور اپنے ایک آرٹیکل[4] کے ساتھ کسی عشوہ باز، فتنہ گر، عربدہ جو، عصمت باختہ، حسن فروش تمبولن کی تصویر بھی دے دی ہے جس کو لکھنؤ کے عجائب خانہ میں میں نے بھی دیکھا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ممدوح نے صاف طور پر اس کو فتحپور سیکری کی محل والی یا اپنے یہاں (الٰہ آباد) کی مقبرہ والی نہیں لکھا مگر ایسے موقع پر اس لکھنؤ کی تمبولن کا ذکر اور تصویر کیا کچھ اور معنی رکھتی ہے؟

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جہانگیر بھی آخر بشر ہی تھا، معصوم نہ تھا۔ آسمانی فرشتہ نہ تھا۔

۱؎ صفحہ ۲۰۰۔ ۲؎ صفحہ ۲۰۰۔ کتاب مذکور۔ ۳؎ "ہندوستان کی جھلکیں" GLIMPSES OF INDIA مطبوعہ فلیڈلفیا ۱۸۹۵ء، صفحہ ۲۲۴۔ ۴؎ مندرجہ لیڈر، یکشنبہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء۔

جس سے اس قسم کے افعال و حرکات کا سرزد ہونا محال عقلی ہو۔ یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ بعض
ایسے افراد یا جماعتیں شیوہ دلبری و دلربائی، دلکشی و رعنائی میں اس وقت بھی ایسی ہی طاق و مشّاق
ہوتی تھیں، جیسی آج کل ہوتی ہیں۔ ان کی شوخی و طراری، لگاوٹ اور عیاری دیکھ کر فارسی کا باختہ دل
شاعر چلا اُٹھا تھا۔

نتادند در کفر صبر و شکیب — حذر از کمر ہائے زنار زیب
رہِ مایہ دارانِ ایمان زنند — بجز وار نقدِ دل و جاں زنند

ہمارے فاضل دوست کا نظریہ یا حُسنِ ظن قابل التفات ہی لیکن اس سے موافقت
کرنا استعجاب تاریخی تحقیقوں کو نظر انداز کر دینا ہے۔ اکبر نے خود اپنے پیش نظر، ذمہ دار عاقل، دماغ
عمائد و امراء کے زیر نگرانی، تجربہ کار ماہر فن اتالیقوں سے، اپنے شاہزادوں کو تربیت و تعلیم، بازاروں
میں نہیں، قلعوں اور محلات میں دلائی تھی۔ وہاں لونڈی باندیاں اور کنیزیں کیا کم تھیں، جو پیشہ ور
عورتوں کی رسائی و گنجائش ہوتی۔ اخلاقی معیار بھی دونوں کا ایک یا مساوی نہ تھا، نہ ہو سکتا تھا۔
اُس وقت کی سوسائٹی بھی دونوں میں فرق کرتی تھی، ایک نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔

کون بتا سکتا ہے کہ یہ عمارت کیسی واقعی بازگی ہوئی تھی اور کسی انسان کے جسم
بے جان نے اس میں راحت پائی تھی یا نہیں۔ یہ تو مسلّم ہے کہ ہماری سرزمین پر مغرب (یورپ)
والے بھی مردوں اور مرے ہوؤں کی ہڈیوں کا آج کل ویسا ہی ادب و احترام فرماتے ہیں، جیسا
مشرق (ایشیا) کے لوگ کرتے ہیں۔ مگر شاید ایک صدی پیشتر حالت اور تھی۔ اُس وقت کے
فرنگ تو اہل ہند زندہ دلوں کو ہندوستان کے ہر گوشہ یا ہر فرد و خاندان سے تمام ملک کو [illegible]۔

خود انتقام [illegible] سے رہا ہو یا محض جذبِ نفرت [illegible] جیسی بھی کوٹھیوں اور فردوس نما
منظوا [illegible] کا باعث رہی ہو [illegible] قبروں کی [illegible] تمام معمور عمارتیں)
ان کی ایک داستان ہوں۔ یا انہیں کے دلوں اور آنکھوں میں کوئی کشش خود بخود پیدا ہوتی ہو۔
بہر صورت [illegible] تاریخ اس کے گواہ ہیں کہ آج کل ویسٹ انڈیا کمپنی کے بعض ملکی اور فوجی عہدہ دار

بادشاہی وقت کے مقبروں کا بیکار پڑا رہنا دیکھ نہ سکتے تھے۔ بعض کو اپنے رہنے کے لئے انتخاب فرمالیا تھا۔ یاد ہوگا کہ مسٹر ولیم سلی مین اپنی خوش ذوق و خوش فکر رفیقۂ حیات کو ساتھ لے کر ممتاز محل (تاج) کے روضہ کی سیر کو گئے تھے۔ اپنے "سیاحت نامہ و تذکرہ" میں لکھتے ہیں کہ "میم صاحبہ جب خوب گھوم پھر کر سب کچھ دیکھ چکیں، تو میں نے پوچھا "کہو اس عمارت کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟" بولیں "کیا بتاؤں کیا خیال ہے۔ میں تو یہ جانتی ہی نہیں کہ ایسی عمارت پر نکتہ چینی کیسے ہو سکتی ہے۔ البتہ آپ کو یہ بتا سکتی ہوں کہ میرا احساس کیا ہے۔ ایسی عمارت میرے لئے بنے تو کل ہی مرجانے کے لئے تیار ہوں[1]"

دیکھ کر سیر اس کی دنیا سے گزرنا سہل ہے مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

لیکن یہ محض ایک آرزو تھی۔ ایک نیک دل، نیک سیرت خاتون کا ارمان۔ دانشمندانِ فرنگ نقد کو نسیہ پر کیوں اٹھا رکھتے۔ جہاں جگہ پائی۔ گنجائش دیکھی پڑ رہے۔ دخیل و قابض ہو گئے۔

سر ولیم سلی مین دہلی و آگرہ کی متعدد عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں، جو گذشتہ دور حکومت یا کمپنی کی معمولی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کی نذر ہوئی تھیں۔ وہ اس قسم کی دراز دستیوں اور نیم وحشی حرکتوں کی دو فاحش مثالیں تو تنہا دہلی کی بتاتے ہیں۔ ایک۔ امام شہدی کی نہایت خوبصورت سنگ مرمر کی قبر یادگار۔ یہ بزرگ اکبر بادشاہ کے پیر و مرشد تھے۔ دوسری اکبر کے چاروں برادرانِ رضاعی کا رفیع الشان و سنگین مقبرہ۔ فرماتے ہیں کہ "اس پر مدت تک مسٹر بلیک، متعلقہ بنگال سول سروس، MR. BLAKE B.C.S. متصرف و قابض رہے۔ یہی صاحب حال میں وحشیانہ طور پر جے پور میں مار ڈالے گئے ہیں[2]۔ اپنے کھانے کی میزوں کے لئے جگہ اس طرح بنائی یا نکالی تھی کہ سنگ مرمر کا وہ تختہ دور کر دیا تھا جو مرنے والے ادہم خاں[3] کی لاش و استخواں کو چھپائے تھا

---

[1] ریمبلس اینڈ ری کلکشنس آف این انڈین آفیشل۔ از میجر جنرل سر ڈبلیو ایچ سلی مین کے۔ سی۔ بی۔ صفحات ۱۴۲، ۳۲۴ و ۳۲۷۔ جلد اول۔ و سیر پرنس آف ویلس، مرتبہ ولیم ہاورڈ رسل، صفحہ ۴۴۳، باب ۱۱ مطبوعہ ۱۸۷۷ء۔
H.R.H. ALBERT EDWARD, PRINCE OF WALES' TOUR – by William Howard Russel, Pages 442-443 – 1877.

[2] ۱۸۳۳ء کا واقعہ ہے۔

[3] ادہم خاں "اکبر کا دودھ شریک بھائی، بڑا بہادر، نامور جنرل اور مقرب امیر تھا۔ سٹیفن نے دہلی ہینڈبک کے چھٹے ایڈیشن میں "ادہم کے مقبرے" کے زیر عنوان اس کا پورا حال لکھا ہے۔ نیز مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں، صفحہ ۲۵۱۔

اور عمارت کے وسط میں تھا۔ باشندگانِ شہر نے ہر چند فریاد و واویلا کی، سماعت نہ ہوئی۔ طرفہ یہ کہ تختہ کو اکھاڑ لینے کے بعد دیوار کے مقابل ایک سرف کو بے احتیاطی سے ڈال دیا تھا۔ جہاں اب تک پڑا ہوا ہے۔ رعایا نے مسٹر فریزر سے[1] جو گورنر جنرل کے قائم مقام تھے، عرض معروض کیا۔ عبث تھا۔ رؤسا نے بھی سمجھایا۔

ہے ڈر کی بات آگ سے کھیلا نہ کیجئے　　تو دل کا داغ دے اُٹھے ایسا نہ کیجئے

بیکار ثابت ہوا (اور جو ہونے والا تھا، ہو کر رہا)۔ کچھ دن بعد یہ صاحب خود بھی قتل کر ڈالے گئے۔"[2]

مرزا غالب نے اپنے سرپرست و مربی کا بڑا دردانگیز مرثیہ اپنے مخصوص انداز میں زورِ قلم کے ساتھ لکھا ہے۔ سر ولیم فرماتے ہیں "عام لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کی موت اُسی بے ادبی و گستاخی کی بدولت ہوئی جو انھوں نے اکبر کے کوکلتاش کے ساتھ کی تھی۔"[3]

لارڈ کلینڈ گورنر جنرل کے مصاحبِ خاص اور رفیقِ سفر مسٹر فرینچ لکھتے ہیں کہ ان کو جب ۱۸۳۸ء و ۳۹ء میں دہلی جانے کا موقع ملا تو وہ اور ایک اور زیرک و ہنرمند ذی مرتبت انگریز جو دنیا بھر کی سیاحت کر چکا یا کر رہا تھا، دہلی میں یکجا ہوئے اور دونوں نے تین دن قطب مینار میں گزارے۔ کسی عمارت کی ایک پرانی خلوت گاہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ صبح و شام باہر نکل جاتے اور قرب و جوار میں جو آثار و باقیات تھے، دن بھر جھیلتے اور لطف اندوز ہوتے۔ تغلق آباد میں بھی قیام کی یہی صورت رہی۔[4]

---

[1] مسٹر فرینچ کے سیاحت نامہ (صفحہ ۱۰) سے واضح ہے کہ فریزر صاحب قسمت دہلی کے کمشنر اور گورنر جنرل ہندستان کے ایجنٹ تھے۔ باشندگانِ شہر سے بہایت بے تکلف اور بڑے ملنسار اور خلیق انسان تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل ہوئے۔ کریم خاں سپاہی قاتل اور نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروزپور کو ان کے قتل کی پاداش میں پھانسی دی گئی۔ مقدمہ کی سماعت و فیصلہ کے لئے اِسی ارآباد سے مسٹر کالون صدر عدالت عالیہ کورٹ کے جج خاص طور پر دہلی بھیجے گئے تھے۔ (صفحہ ۱۱) لیکن 'ادبی دنیا' کے رسالہ نمبر ۲ جلد ۱۰ ماہ جولائی ۱۹۳۳ء میں فریزر صاحب کی بدمزاجی، ناہنجاری اور بدکرداری سے خوب پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ان کے قتل ہونے اور شمس الدین خاں سے ان کی اور کارکنان کمپنی کی کاوش اور بدلہ لینے کے وجوہ اور پھانسی دینے کے حالات و واقعات مندرج ہیں۔ آثار الصنادید سے پایا جاتا ہے کہ مسٹر ولیم فریزر کرنل جیمس اسکنر کے تعمیر کردہ گرجا کی جانب غرب دفن ہیں (صفحہ ۲۰)۔ [2] مجلس پشندی کلکشنس، حصہ دوم، صفحہ ۱۴۰۔ [3] ایضاً۔

[4] سیاحت نامہ، صفحہ ۹۴۔

ڈنکن صاحب کو تسلیم ہے کہ لارڈ ہیسٹنگز اور لارڈ بینٹنک نے آگرہ کی بعض عمارتوں کے ساتھ بیدردی

اور وحشیانہ پن کا برتاؤ کیا تھا۔[1] سلی مَین صاحب نے اس کا رونا خوب رویا ہے۔

دہلی کے آثار الصنادید میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

(۱) "مسجد سرہندی" لاہوری دروازہ کے باہر بیگم کی بنوائی نہایت مُرتفع سنگ سُرخ کی تھی۔ ایک طرف سَرا بیر دو اکرام کی تھی جو بحکم سرکار کمپنی بہادر منہدم کردی گئی اور مسجد کی دیوار بھی منہدم کردی گئی۔ سَرا نہایت آباد و با رونق و آرام دہ تھی۔[2] ع

جو فنا کا نقش بن کر دیدۂ عبرت میں ہے

(۲) "بھول بُھلیاں یعنی مقبرۂ ادہم خاں، جو اکبر بادشاہ کا کوکہ تھا، جس نے شمس محمد خاں غزنوی اکبر کے اتگہ کو مار ڈالا تھا اور اس کے قصاص میں اکبر نے ادہم کو قلعہ پر سے گرا کر مروا ڈالا تھا۔ یہ واقعہ ۱۲ رمضان ۹۶۹ہجری کا ہے۔ یہ گنبد بھی اس زمانے کے بعد بنا ہے۔ گنبد چونہ اور پتھر سے بنا ہوا ہے اور اُس کی دیوار میں اوپر جانے کا رستہ ہے۔ دیوار دیوار گرد پھر سکتے ہیں اور اس میں...

...... بھول بُھلیاں .... قطب صاحب کی عمارتوں میں یہ نامی عمارت ہے۔ اکثر صاحبان عالیشان اس میں آن کر اترتے ہیں اور اسی سبب سے اس کی قبر کا تعویذ برابر کردیا گیا ہے۔ باوجودیکہ مقبرہ اکبر کے وقت میں بنا ہے مگر قطع اس کی پٹھانی عمارت سے ملتی ہے۔[3]"

(۳) قطب صاحب کی لاٹ کے قریب محمد قلی خاں کا مقبرہ تھا جو اکبر بادشاہ کا کوکہ تھا اور یہ عمارت بھی یا تو عہد اکبر شاہ کی رہی ہوگی، ورنہ جہانگیر کی۔ لیکن جب اس کے نصیب کُھلے اور اس عمارت کے دن اچھے گئے، اسے صاحب والامناقب عالی مناصب نے جن کے عدل و انصاف کے آگے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتا ہے اور ظلم و ستم دنیا سے نیست و نابود ہو گیا ہے آوازہ بلند ہمتی اور والا فطرتی کا، آویزۂ گوش فلک ہے اور غلغلہ اُن کی شوکت و حشمت کا زمین سے آسمان تک پہنچا ہے یعنی دریا نوال فدایگان ابر کف، حاتم دوراں فرزند ارجمند بجاں پیوند سلطانی معظم الدولہ

---

[1] آگرہ ہینڈ بک، صفحہ ۱۵۵۔ [2] آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۴۷ء صفحہ ۹۰۔ [3] یہ کاشر بیری لفظ ہے۔ [4] آثار الصنادید مطبوعہ ۱۸۴۷ء صفحہ ۸۰۔

امین الملک، اختصاص یار خاں سر طامس تیاافلس مٹکف صاحب بارونٹ بہادر فیروز جنگ صاحب کلاں بہادر دار الخلافہ شاہجہان آباد دام اقبالہ نے کوٹھی تیار کرائی۔"[1]

یہ ارشادات اُنیسویں صدی کے سب سے بڑے رفارمر اور مصلح مسلمان سر سید احمد خاں بہادر کے ہیں۔ جن کی جرأتِ اخلاقی اور آزادروی ایک بڑی حد تک مسلّم ہے۔ مٹکاف صاحب کی بلند آہنگی کے ساتھ دادِ تحسین اس صلے میں دی جاتی ہے کہ انھوں نے محمد قلی کے مقبرے کو کھدوا کر اس جگہ اور اُس کے سامان سے ایسی شاندار کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۴۶ء تک یا آج سے اسّی نوے برس پہلے ان باتوں کے حاکم و محکوم دونوں خوگر ہو رہے تھے اور اس کو ظلم نہیں سمجھتے تھے یا اگر بُرا سمجھتے ہوں تو زبان پر لانے کی کس کو ہمت ہوتی تھی۔

(۲) سید صاحب یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ "مقبرۂ خانخاناں کا تمام سنگِ مرمر، اور پتھر کی نفیس جالیاں اور گلکاری کی چیزیں اوکھاڑ کر آصف الدولہ کے وقت میں لکھنؤ بھیج اور بیچ دیا گیا۔ حتیٰ کہ مقبرہ کا تعویذ بھی اُکھاڑ لیا۔"[2]

یہ وہی لکھ لُٹ آصف الدولہ ہے جس کی سیرچشمی عالی حوصلگی، داد و دہش اور فیاضیوں کی داستانوں کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا، اور حاتم طائی کے سوا کہیں اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ رحمت بود ایں کفن کشوش بر۔[3]

۱۸۵۷ء کے محشر زا آشوب اور سرکار برطانیہ کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد بھی، شروع شروع میں، کچھ ایسی دست درازیاں ہوتی رہی ہیں۔ مسٹر فرینچ نے کبھی کسی اور وقت، پیشتر، دہلی میں سفید سنگِ مرمر کا ایک بڑا وسیع طویل و عریض حمام دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں کہ جب بادشاہ قید کر لیا گیا، بغاوت میں شرکت ثابت ہوئی، تو یہ حمام اُس کی محل سرا سے نکال کر ملکہ باغ میں رکھ دیا گیا۔ مقصود محض نمائش و آرائش تھی۔ عوام کے کام یا مصرف میں نہیں آتا تھا، یعنی فرشِ زمین پر ایک عجیب

---

[1] آثار الصنادید، صفحہ ۷۵۔ [2] آثار الصنادید، صفحہ ۴۰۔ [3] آصف الدولہ کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی۔ وہ لکھنؤ میں بیٹھا اپنی ماں (بہو بیگم، زوجہ شجاع الدولہ) کو ستایا کرتا تھا۔ اُن سے بار بار روپیہ وصول کرتا تھا...... اُس کی نالائقیوں کا کچھ ذکر مولوی عبد الحلیم شرر نے "گزشتہ لکھنؤ" میں کیا ہے۔ (صفحات ۱۱ و ۱۲)۔ نیز ملاحظہ ہو۔ سر جارج کاکس کی تاریخ حکومت انگریزی، صفحہ ۱۲۹۔ و۔ تاریخ اودھ، جلد اول، صفحہ ۔۔

چیز کے طور پر ڈال دیا گیا تھا [۱]

گارساں دی تاسی صاحب GARCIN DE TASY کی تحریر [۱۰ دسمبر ۱۸۵۷ء] سے پایا جاتا ہے کہ بغاوت فرو ہونے پر جس وقت دہلی میں "بشپ کا عہدہ" قائم کرنے کا سوال زیر غور تھا، اُس وقت یہ تجویز بھی درپیش تھی کہ شاہجہانی جامع مسجد [۲] کو گرجا میں تبدیل کر دیا جائے [۳]

فتح گڑھ (مضافات فرخ آباد) میں وہ مربع احاطہ موجود ہے، جس کے گوشوں پر کنگرے بنے ہیں۔ اور اندر، ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہ عمارت اودھ کے جلاوطن شدہ وزیر نواب حکیم مہدی علی خاں نے ۱۲۴۳ھ میں مسافروں کے قیام اور وارد و صادر کی راحت و آرام کے واسطے بنوائی تھی۔ جب سر کالن کیمبل اور اُن کے لشکر نے بعد بغاوت اس مقام کو پھر لے لیا تو یہ سرا میس MESS کے طور پر عہدہ داران فوج کے استعمال میں رہی۔ سر ولیم رسل اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں کہ ۲۶ اپریل ۱۸۵۸ء کو اُنھوں نے مسجد کے پاس وسط میں حاضری کھائی تھی۔ بھٹیارے یعنی سرا کے محافظ بعد کو بے دخل کر دیے گئے اور گورنمنٹ نے اس عمارت کو ذخیرہ خانہ بنا لیا۔ اب سرا اور مسجد اپنے اصلی مصرف میں نہیں بلکہ ملٹری ورکس کے انجینیر کے تصرف میں ہیں [۴]

ملتان کو لیجیے جو ہندوستان میں دورِ اسلامی کا سب سے پرانا مقبوضہ اور آباد کردہ تھا اور اب صوبۂ پنجاب کا ایک مشہور و اہم تاریخی شہر ہے۔ نواب عبدالصمد خاں (سیف الدولہ دلیر جنگ) صوبہ دار نے یہاں شاندار جامع مسجد (عیدگاہ) تعمیر کرائی تھی۔ جو ۱۷۳۵ء (۱۱۴۸ھ) میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ ۱۸۱۸ء (۱۲۳۱ھ) میں سکھوں نے ملتان پر فتح پائی تو اس کو اصطبل بنایا، مسٹر ایگ نیو

---

[۱] حالات سفر مسٹر جی بی فریزر مطبوعہ ۱۸۲۰ء صفحہ ۹۶۔ [۲] ہیملٹن صاحب اپنے گزیٹیر میں لکھتے ہیں کہ یہ مسجد چھ سال میں بنی تھی۔ دس لاکھ خرچ ہوا تھا۔ مسٹر فریزر فرماتے ہیں کہ عمارت کی عظمت اور شان و استحکام کو دیکھ کر یہ تخمینہ بہت کم معلوم ہوتا ہے۔ (سیاحت نامۂ بالائی ہند مطبوعہ ۱۸۲۰ء صفحہ ۹۰ نوٹ)۔ [۳] رسالہ اردو جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۹۰ جلد ۱۱ حصہ ۴۱۔ [۴] فتح گڑھ کیمپ از مسٹر سی ایل ہوویس باب چہارم صفحہ ۱۰۱ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۳ء۔

مسٹر ایگنیو اور لفٹنٹ اینڈرسن MR. AGNEW AND LT. ANDERSON جو سرکارِ انگریزی کی طرف سے خدمات خاص پر ملتان آئے تھے اسی میں فروکش ہوئے تھے اور اسی جگہ سکھ صوبہ دار کے حکم سے ۲۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر دئے گئے۔ پھر جب انگریزوں نے قبضہ کیا تو یہ عمارت ڈپٹی کمشنر کی کچہری قرار دی گئی۔ مسلمانوں کی استدعا و کوشش پر سنہ ۱۸۶۳ء میں واپس ملی۔ مگر نہایت خستہ حال ہو گئی تھی۔[۱]

اسی طرح نواب علی محمد خاں درّانی والیِ ملتان کی مسجد (تعمیر ۱۱۷۱ھ بمطابق ۱۷۵۷ء) بھی سکھوں کے زمانے میں ناظمِ ملتان کی کچہری رہی تھی۔ ان کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب بھی اس میں رکھی گئی تھی۔ انگریزوں کی بدولت مسلمانوں کو واپس ملی۔[۲]

دور کیوں جائیے اسی شہر الہ آباد میں شاہجہاں کے نامور گورنر نواب شایستہ خاں کی بنوائی ہوئی وسیع و رفیع مسجد قلعے کے پاس تھی۔ ۱۰۵۶ھ [۱۶۴۶ء] میں اس کی تعمیر ختم ہوئی تھی۔ جب تک مسلمانوں کا اوج و عروج رہا۔ مسجد، مسجد رہی۔ عبادت کے کام آتی تھی۔ مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں لکھا ہے کہ "الہ آباد میں کمپنی انگریز کی عملداری کے اوائل یعنی ۱۸۰۰ء میں کرنیل کیٹ صاحب نے اس کو تغیر و تبدیل کر کے اپنی بود و باش کا مکان بنایا تھا۔ دس سال بعد یعنی ۱۸۱۱ء میں کمپنی کے حکم سے [واگزار] ہو کر پھر اسی صورت میں تبدیل کر دی گئی۔ آج (۱۹۳۳ء) تک موجود ہے اور مسلمان جمع ہو کر دونوں عیدوں کی نماز یہیں پڑھتے ہیں"[۳] عرصہ ہوا کہ یہ مسجد بھی گردشِ روزگار کے نذر ہو چکی۔ بشپ ہیبر صاحب نے بھی دیکھا تھا وہ اس کی بڑی تعریف کرتے اور اس کی خوبی موقع، بلندی، حسنِ مناظر، قربِ دریا کی تحسین فرماتے ہیں۔ مدت تک جمعہ و عیدین کی نماز و جماعت یہاں ہوتی رہی۔ آخر یہ حالت بھی انقلاباتِ حکومت و مصالحِ فوجی اور قربِ قلعہ سے قائم نہ رہی۔ موٹی موٹی دیواروں کے نشان اور کچھ آثار باقی ہیں، جن کا کچھ حصہ خشکی میں ہے اور کچھ دریا کے اندر تک چلا گیا ہے۔

۱؎ سفرنامۂ مولانا سید سلیمان ندوی، رسالہ معارف جلد ۳۳، صفحہ ۲۲۵۔ ۲؎ سفرنامۂ مذکور، رسالہ معارف جلد ۳۳، صفحہ ۲۲۶۔ ۳؎ صفحہ ۲۴۹، مطبوعہ ۱۹۳۹ء۔

بس یہ کہئے کہ فوجی میدان میں اینٹ پتھر اور چونے کا ایک برائے نام ڈھیر باقی رہ گیا ہے۔[1] پھر بھی

نظر کے ساتھ سر جھکتا ہے ہر ہر گام پر میرا ۔۔۔ مرے سجدوں کے قابل یہ زمیں معلوم ہوتی ہے

ان تغیرات کا ذکر کرنے سے کسی خاص جماعت، گروہ یا ذات پر الزام دینا یا اُن کے طریقِ عمل پر داغ لگانا مقصود نہیں۔ بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ زمانہ کی گردش اور حکومتوں کے ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانۂ اقتدار و سطوت میں جو کچھ کیا یا ہندوؤں میں سے جاٹوں[2] اور سکھوں[3] نے قدرت و قوت پا کر جو کچھ عمل فرمایا وہ تو پرانی باتیں اور بھولی بسری داستانیں ہو گئی ہیں۔ اگر آپ گزشتہ صدی کے نصف آخر کے واقعات یاد کریں گے جو روشنی و تمدن اور علم و تہذیب کا دور گزرا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ جب بھی کم و بیش وہی ہوتا رہا ہے جس کو آج ہم قابلِ نفرت بتاتے ہیں۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ۔۔۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

اس گنبد کا مدت سے خالی ہونا خواہ اتفاقات زمانہ سے ہو یا کسی ضرورت مند زبردست کی دستبرد سے۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ اس باغ کے یوروپین منتظم افسر کی بود و باش مدت سے چلی آتی تھی۔[4] بیسویں صدی کے شروع ہونے پر یعنی ہمارے وقت میں انقلاب و اصلاح کی ہوا چلی۔ زمانہ نے گردش کھائی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن (آنجہانی) الٰہ آباد تشریف لائے۔ حسبِ معمول آثارِ قدیمہ کو، قلعہ کو، خسرو باغ کو ملاحظہ فرمایا۔ محتشم الیہ کو یہ انداز پسند نہ آیا کہ مُردوں کی جگہ زندے متصرف ہوں۔ فرمانِ قضا جریان نے چوبیس گھنٹہ کے اندر یہ عمارت سوپرنٹنڈنٹ صاحب سے خالی کرا دی۔ یہاں اسی قدر نہیں ہوا بلکہ اتنے ہی وقت کے اندر سوپرنٹنڈنٹ صاحب کا آرامگاہ اپنی اصلی حالت میں منتقل کر دیا گیا اور پھر تمبولن کا مکان بن گیا۔ صاحب اور ان کے دفتر کے لئے بعد کو ایک قصرِ نفیس (کوٹھی) کمپنی باغ (الفریڈ پارک) میں تعمیر کرا دیا گیا۔

---

[1] حیاتِ جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۲۰۴، نوٹ نمبر ۱۰۲۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۴۱۰ (آگرہ کے قلعہ پر سورج مل جاٹ کا قبضہ)۔
[3] حیاتِ زیب النساء، از منشی محمد دین فوق، صفحات ۲۳ تا ۲۴۔ [4] تاریخ جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرشاد، صفحہ ۴۴۰، نیز گزیٹیر سابق، صفحہ ۲۶۵۔

مسٹر ایچ جے ڈیوس H.J.DAVIS آخری سپرنٹنڈنٹ تھے جو اس عمارت میں مقیم و فروکش رہے۔ انھوں نے اور ان کے پیش روؤں نے اس ہر طرف سے کھلی ہوئی عمارت میں خوبصورت چوکھٹیں اور کواڑ لگائے تھے۔ ایک حصہ جو پہلے ہی سے گول بنا تھا، گول کمرہ بنا۔ اسی کے ایک پہلو یعنی سامنے کے برآمدے میں صاحب کا 'باباغ کا سرکاری' دفتر قرار پایا۔

زیادہ دن کی بات نہیں ہے۔ اُس وقت کے دیکھنے والے اور ملازمانِ خدمت موجود ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک نیک دل شریف النفس انگریز جو سنی سنائی روایات پر عامل اور قدیم معتقدات کا معترف و قائل تھا، اس کا بھی احترام و اکرام کرتا تھا۔ اُس کی طرف سے ہر جمعرات کو لوبان سلگایا جاتا تھا۔ ایک نشان (بظاہر قبر کا) ایک گول مرمت شدہ پیوند کی طرح گرد و پیش کے فرش سے اب بھی نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔ حسنِ سلیقہ اور بزم آرائی کی بدولت اس پر میز بھی گول بچھائی گئی تھی۔ قالینوں کا فرش تھا۔ بایں ہم اس حصہ پر چلنے اور پامال کرنے سے احتیاط و احتراز کیا جاتا تھا۔

یہ اطلاع کہ اس کو حتی الامکان اصلی صورت میں تبدیل کر دیا ہے غالباً صحیح ہوگی بحالتِ موجودہ قبر کی دونوں منزلیں یا دونوں طبقے (بالائی و زیریں) خوب صاف اور کھلے ہوئے ہیں۔ کواڑ اور کھڑکیاں سب دور کر دی گئی ہیں۔ نہ کسی اور قسم کا کوئی کا سامان چھوڑا ہے۔ دونوں حصوں پر سفیدی سے یکساں قلعی کر دی گئی ہے۔ داغ دھبے یا در سیاقی تصرفات کی یاد دلانے والے نشانات سب چھیل دئے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ زندوں کے تسلط سے پہلے اس پر کچھ نقش و نگار یا گلکاری و رنگ آمیزی تھی یا نہیں۔ بہر صورت

از یک حدیثِ لطف کہ آں ہم دروغ بود　　　　اب شبہ دفترِ گلہ صد باب شستہ ایم

اب صرف ایک بات کہنا باقی ہے۔ مسٹر بیل کی اس تحریر کے سلسلہ میں کہ ایک چھوٹی قبر اودروں کے پچھم جانب ہے مسیو بیچ صاحب مسٹر ایسٹ وِک کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ خسرو باغ میں نورجہاں کا ایک بے نوشاف CENOTAPH تھا[1]۔ بے نوشاف جرمن زبان میں بے قبر کے مقبرے کو کہتے ہیں یعنی کوئی گنبد جو کسی ایسے کی یادگار کے لئے تعمیر ہوا ہو جو کسی اور جگہ دفن ہوا ہو۔ اس کا بہتر فیصلہ قاریانِ کرام کر سکتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کون سا گنبد نورجہاں کا ہو سکتا ہے؟

---

[1] جورنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جولائی ۱۹۰۷ء، صفحہ ۶۰۰، نوٹ نمبر ۲۔

مرزا جہانگیر کا مدفن

یہ چبوترہ عوام الناس میں "خسرو کے گھوڑے کی قبر" کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ اس شہرت و نام کے بارہ میں کوئی تحریری سند نہیں ملتی۔

یہ تسلیم ہے کہ کسی زمانہ میں مانوس و محبوب جانوروں کی یادگاریں بنا دینا ایشیا کے اہلِ دولت و مقدرت کا شیوہ تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی متعدد مثالیں پیشِ نظر ہیں۔ چند پر قناعت کروں گا۔

اودے پور میواڑ کے رانا پرتاپ[1] کا نام کس نے نہ سنا ہوگا جس نے اکبر کے دَل بادل لشکر کا مقابلہ بڑی شجاعت و دلاوری سے کیا تھا۔ "چیتک" نام گھوڑا اس کے زیرِ ران تھا۔ شکست کھائی تو اسی پر بھاگا۔ مغلوں نے پیچھا کیا۔ چیتک گھایل تھا اور ایک ندی حائل۔ پھر بھی چوکڑی بھر کر ہرن کی طرح چاروں پتلیاں جھاڑ کر پانی پر سے اڑ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے نعل پتھروں پر پڑتے، ٹکراتے اور چنگاریاں اڑاتے چلے جاتے تھے۔ ایک موقع پر پہونچ کر چیتک بے دم ہو کر ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔ وہاں اس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی گئی۔ اودے پور کی آبادی میں آدھے گھر ایسے ہوں گے جن کی دیواروں پر اس کی تصویریں کھنچی ہیں[2]۔

مولوی سعید احمد مارہروی تاریخ آگرہ[3] میں لکھتے ہیں "مغلوں اور اُن کے امرا کو مقابر کی تعمیر کا شوق اس درجہ تھا کہ انسان تو انسان گھوڑوں، کتوں اور ہرنوں وغیرہ حیوانات کی یادگار میں بڑی بڑی عمارات یا مورتیں اس ملک میں تعمیر کی گئیں چنانچہ آگرہ میں اکبر بادشاہ کے ایک وفادار کتے کا عالیشان مقبرہ باہتمام دربار خاں تعمیر کیا گیا تھا۔ دربار خان بھی اپنی وصیت کے بموجب اسی مقبرہ میں دفن ہوا[4]"

---

[1] بل صاحب کی ڈکشنری صفحات ۲۱۵ و ۳۲۲۔ [2] دیباچہ ٹاگری صفحہ ۱۰۰۔ [3] صفحہ ۱۸۔ [4] نیز ترجمہ مآثر الامرا از بیورج، صفحہ ۴۵۳۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی' مآثر الکرام میں تحریر فرماتے ہیں کہ سید محب اللہ بلگرامی شاہزادہ محمد اعظم کے توسل و معتمد منصب دار تھے۔ شاہزادہ جب ادجین کا صوبہ دار مقرر ہوا تو میر بھی ادجین چلے گئے اور وہیں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ فوج سے الگ ہو گئے اور سرائے دسٹی کے قریب پہونچے۔ سرا کے دروازہ کے سامنے سایہ دار درختوں کے نیچے گھوڑے سے اترے۔ زین پوش بچھا کر بیٹھے۔ وردی اتار دی۔ سفید لباس بدلا۔ شربت پیا۔ تلاوت میں مشغول ہوئے۔ پھر چادر اوڑھ کر لیٹے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہاں کے حاکم نے قبر مع چبوترہ اینٹ اور گچ سے پختہ بنوا دی۔ ان کے گھوڑے نے بھی دانہ گھاس چھوڑ دیا تھا۔ رات دن آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لوگوں سے اس بے زبان ماتمگسار کی حالت دیکھی نہ گئی تو گھوڑے کو ذبح کر کے ان کے مزار کے پائیں دفن کر دیا۔ گھوڑے کی قبر مربع پختہ و مضبوط تعمیر کی گئی تھی۔ دستور کے مطابق ساتھ ساتھ کنواں بھی بنایا گیا تھا۔[1]

عمارت مقبرۂ خسرو کے ذیل میں گزارش ہو چکا ہے کہ شاہزادہ خسرو کے مرنے کے بعد اس کے کسی گھوڑے کے الہ آباد پہونچنے اور دفن ہونے کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ جب حرمان نصیب شاہزادے کا داد رس و عزادار کوئی نہ تھا تو اس کے کسی بے زبان رفیق کا پرسان حال کون ہوتا اور کیوں اتنا احترام کرتا۔ پھر باد شاہزادہ (خسرو) کی قبر کے پاس ہی اس نزہت گاہ سلطانی میں' جہاں شاہزادوں' امرا اور بیگمات کی آمد و رفت بلکہ سکونت بھی رہتی تھی' کسی حیوان کا دفن کیا جانا قیاس سے بعید اور شاہانہ آداب و شان سے دور ہے۔ رنگینیِ خیال گو رسانہ ہیے۔ خسرو کا دبّن راہوار اگر یہاں دفن ہوتا تو اس پر تمام عمارت شاہانہ اہتمام و حوصلہ کے ساتھ سنگین و مرمریں' جہانگیری عمارات کے نمونہ پر بنائی جاتی۔ گنبد بھی اسی رفعت و شان کا تیار کیا جاتا۔ جس پر قدامت و کہنہ سالی خود بخود نثار ہوتی۔ آج یہ اینٹ چونے کا معمولی چبوترہ بہ اول نظر کہہ دیتا ہے کہ وہ کوئی پرانی چیز یا نشانی پیش نہیں کر سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ جگہ شاہزادہ مرزا جہانگیر کا عارضی مدفن رہی ہے۔ اس لئے اس کا استحکام و احترام باقی ہے۔ راست و دروغ بگردن راویاں۔ ان کی شہسواری اور ان کے سمند تیز گام کا حال جو کچھ

---

[1] پرگنہ سپہری میں پائیں زرد کا ایک باغ۔ صفحہ ۳۰۔ [2] صفحہ ۴۰۹۔

سنا جاتا ہے، ابھی حوالۂ قلم کیا جائے گا۔ یہ تیموری نسل کے آخری لعلِ شب چراغ تھے، جن سے نہ صرف خسرو باغ بلکہ سارا الٰہ آباد روشن و بارونق تھا، جیسا کہ ان کی وفات کے قطعاتِ تاریخ شاہد ہیں۔ مرزا اس باغ میں سالہا سال رہے تھے۔ پیوندِ خاک ہونے پر بھی اسی قطعۂ زمین نے اُن کو برسوں اپنی آغوش میں رکھا تھا۔ ان کے متعلق، مختلف حالات مختلف تاریخوں میں ملتے ہیں۔ ان کو گزرے ہوئے بہت زمانہ نہیں گزرا، اس لئے بہت سی روایتیں اور حکایتیں پچھلوں سے سنی سنائی یا اِدھر اُدھر لکھی ہوئی اب تک زبانوں پر ہیں۔

عالم زما تہی وز آفغان ما پُر است　　　　شد عندلیب خاک و چمن از نوا پُر است

مرزا کا ذکر مختصراً آغازِ کتاب میں کر چکا ہوں۔ مزید احوال کسی قدر تفصیل بلکہ تطویل کے ساتھ بعض اصل ماخذوں سے نقل کیا جائے گا۔ تاکہ ہوشمند و ذی فہم پڑھنے والے اس سے مستفید ہو سکیں۔ اور تکرار و اعادۂ واقعات سے قطع نظر فرما کر، سلسلۂ حالات کو مربوط کر لیں۔ دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں:-

(۱) تیمور گورگان کی آخری ہندوستانی نسلوں میں ایک تاجدار last but one گزرا ہے ابو نصر معین الدین محمد اکبر شاہِ ثانی۔ جس سے ملک اور تاج دونوں رخصت ہو چکے تھے، لیکن رہنے کے لئے شاہ جہان صاحب قران کا لعل قلعہ اور بیٹھنے کے لئے چغتائی باپ دادا کا تخت باقی تھا اور اقلیم سخن پر حکمرانی۔ باپ شاہ عالم ثانی "آفتاب" تھا تو بیٹا "شعاع" ہوا۔ شاعری کی دنیا میں اسی نام یا تخلص سے چمکا۔ یہ محض بے اختیار خطابی بادشاہ تھا، نہایت رحیم و کریم۔ اور جیسا کہ مفتی غلام سرور لکھتے ہیں انگریز اس کی عزت و حرمت کا پاس بے حد کرتے تھے[1] اس کا عہدِ سلطنت ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) سے ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) تک یعنی بتیس سال شمار ہوتا ہے۔ اسّی برس عمر پائی تھی۔ اس کی اولاد میں دو[2] شاہزادوں کے نام اوراقِ تاریخ پر روشن نظر آتے ہیں۔ ایک ابو ظفر بہادر شاہِ ثانی جس کو ۱۸۳۷ء کے

---

[1] صفحہ ۱۳ - [2] گنجینۂ سروری یا گنج تاریخ، صفحہ ۱۱، حاشیہ اول۔ [3] ایک تیسرے شاہزادہ سلیم کا نام بھی ملتا ہے۔ قرینہ و قیاس چاہتا ہے کہ مرزا جہانگیر ہی کا اصلی نام سلیم رہا ہو۔ اس کی طرف باپ کا شغف اور مہر و شفقت کی نگاہ بھی اوروں سے زیادہ تھی۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے ذی قعدہ ۱۲۳۵ھ (مارچ ۱۸۲۰ء) میں ایک قصیدہ بڑے زور کا لکھا تھا۔

ملکی انقلاب اور لشکری شورشوں کے طفیل برائے نام بادشاہی کے نام کو بھی خیرباد کہنا پڑا تھا۔ یہ لعل بائی کے بطن سے تھا۔ دوسرا مرزا جہانگیر ممتاز محل سے۔

بس کلیات غالب کی کلیات فارسی میں تیرھواں نمبر ہے (صفحہ ۲۱۲) یہ شعر مدح کے دونوں شعروں میں وقت کی تصریح بھی کر دی ہے جشن جلوس، نوروز اور عید قرباں کے مبارک موقعہ پر دربار میں پیش کیا تھا مرزا غالب جیسے زمانہ شناس، معاملہ فہم اور دور اندیش تھے باپ کے ساتھ ساتھ بیٹے کی بھی مدح وثنا کرتے جاتے ہیں۔

ستایش شہ وشہزادہ ہی کنم ہم آہنگ　　سپار حسن ادب در مقام ذوق سلیم

ملکہ شاہزادہ کو پہلے یاد کرتے اور اس ترجیح وپیش آورد کی معقول توجیہ فرماتے ہیں

ز شاہزادہ نخست آورم سخن کہ بہ باغ　　شگوفہ را بہ ثمر در نمود بود تقدیم

اسی کے مطلع ثانی میں شاہزادہ کا نام لیا ہے

زہے مناسبت طبع شاہزادہ سلیم　　بہ فیض تربیت بادشاہ ہفت اقلیم

قصیدہ کو حسب معمول شعر دعا پر ختم کیا ہے۔ خدا سے چار چیزیں مانگی ہیں۔

عطائے بخشش مہر و عطائے پذیرش ماہ　　بقائے بادشہ و عیش شاہزادہ سلیم

لیکن یہ قصیدہ سنہ ۱۲۵۳ھ کا ہے اور مرزا جہانگیر سنہ ۱۲۳۶ھ میں اس عالم سے رخصت ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ سلیم کوئی چوتھا شاہزادہ تھا۔

آب حیات شعرا کا تذکرہ ہے مرشد زادوں کا نہیں۔ لیکن لکھنے والا دلّی کا اصل قدم بقدم ولیعہدی اور ان وقتوں کا داستان گو ہے۔ فرماتے ہیں کہ "ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم، کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا۔" (صفحہ ۴۲۹ المسلم لاہور سنہ ۱۹۰۰ء)

مرزا عرش تیموری (رسالہ ساقی دہلی اپریل سنہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۵۸ میں) تحریر کرتے ہیں کہ مرزا سلیم کا انتقال اکبر ثانی کی حیات ہی میں ہو چکا تھا۔ فیروز شاہ انہیں کے بیٹے تھے۔ اکبر ثانی ان دونوں (باپ بیٹے) کو بہت چاہتے تھے۔ سلیم ہی کی ولیعہدی کے لئے تمام کوششیں کی گئی تھیں۔ مرچوتھے شاہزادے کا نام مرزا بابر تھا۔

کرنل میلیسن فیروز شاہ کو سرغنہ باغیان اور ابوظفر بہادر شاہ کا فرزند لکھتے ہیں نہ کہ اکبر شاہ کا۔ (ڈکشنری صفحہ ۹۳)

(۲) مشہور ہندوستانی نژاد مورخ ولیم طامس بیل نے اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری میں مرزا جہانگیر
کو بڑا بیٹا لکھ دیا ہے۔[1] آئینِ تیموری نیز دنیا کے پرانے معمول و دستور کے مطابق اُس کو خود بخود
ولی عہدِ سلطنت قرار پا جانا چاہیے تھا۔ اور اس طرح ساری بنائے نزاع ختم ہو جاتی اور قصہ پاک
ہو جاتا ہے۔ مگر یقیناً یہ موصوف کا سہو ہے۔ ان کی غلطی مستند و معاصر لکھنے والوں کی تحریرات
سے آشکارا ہو جاتی ہے۔

مسٹر سٹین SETON سنہ ۱۲۲۰ھ[2] (۱۸۰۵ء) میں شاہ جہان آباد کے عہدۂ ریذیڈنسی
پر مامور ہوئے۔ ان سے اور مرزا جہانگیر سے شدید ناچاقی ہو گئی تھی۔ ۱۸۰۹ء یا بقول سلی مین ۱۸۰۷ء[3]
میں ان پر مرزا نے طمانچہ (تفنگچہ[4]۔ پستول) سر کیا۔ وہ بچ گئے اور یہ نظر بند کرکے الہ آباد بھیج دیے گئے۔
گیارہ بارہ سال اسی باغ میں رہے۔[5] الزام تو ان پر سخت تھا لیکن یا تو ان کی عظمت مرتبت و
شاہزادگی کی بدولت، یا کسی اور مصلحتِ ہنگامی و ملکی کے لحاظ سے یا اُن وقتوں کے کسی رواجی
آئین و قانون کے رُو سے، یا حسب تحریر راجہ درگا پرشاد سندیلوی عفو تقصیرات کے بعد ان کی نگرانی
اور دیکھ بھال میں چنداں جبر و سختی کو راہ نہیں رہی تھی۔ انھوں نے سنہ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں اس
زندانِ آب و گل سے رہائی پائی تو اسی باغ میں ان کو اپنے دادا، سلطان خسرو، کی قبر کے پاس جگہ
دی گئی۔[6] کچھ دن بعد (یا حسب تحریر سر ولیم سلی مین ۱۸۳۲ء میں[7]) انگریزوں سے اجازت
ملنے پر ان کی لاش یہاں سے نکال کر دہلی بھیجی گئی۔ نواب ممتاز محل، ان کی ماں کو ان کے مرنے کا
بڑا رنج و قلق تھا۔ وہ اس حالت میں بھی اپنے لختِ جگر کا اپنے سے دور رہنا برداشت نہ کر سکیں۔
ان کی الفت اس پیکرِ بے جان کی کشش کا باعث ہوئی۔ نواب مختار الدولہ خواجہ وحید الدین احمد خاں[8]

---

[1] صفحہ ۲۰۰۔ [2] تاریخ جسد دہلی، صفحہ ۵۴۴۔ [3] سیاحت نامہ، جلد دوم، صفحہ ۱۶۷۔ نوٹ
ذیلی۔ [4] ادبیاتِ مغل، صفحہ ۲۰۰۔ [5] منتخب التواریخ، صفحہ ۵۰۰۔ [6] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۰۔
بیلس ڈکشنری، صفحہ ۲۰۰۔ [7] جلد دوم، صفحہ ۱۶۷۔ نوٹ۔ مگر یہ غلطی تصحیح و کا سال معلوم ہوتا ہے،
مطابق ۱۲۴۸ھ۔

بہادر اس خدمت یعنی لاش کی ہمراہی اور لے آنے پر تعینات کئے گئے۔ یہ اکبر شاہ ثانی کے وزیرِ اعظم نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ[1] کے رشید خلف اور جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ کے ماموں[2] تھے۔ لاش کے دہلی پہونچنے پر بڑا ماتم ہوا۔ وہ لاش جو خسرو باغ میں ایک سادے سے مٹی کے ڈھیر کے نیچے دبادی گئی تھی، درگاہِ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے صحن میں محمد شاہ بادشاہ کے حجرے کے پاس شاہانہ مراسم و اہتمامات کے ساتھ دفن کی گئی[3]۔ اس پر ایک شایانِ شان حجر سرتاپا سنگ مرمر کا تیار ہوا[4]۔ اہلِ نظر کہتے ہیں کہ مرزا کا حجر بعینہ محمد شاہ کے حجر کی نقل ہے، اس کی جالیاں بھی بہت باریک و نازک ہیں۔ سید صاحب اس سے بھی نفیس تر و پُر تکلف بتاتے ہیں۔ "البتہ سنگ مرمر ویسا آبدار و شفاف اور بے جرم خوش رنگ و خوش قماش نہیں پایا۔ تاہم اپنی جگہ یہ بھی عجائب روزگار سے ہے۔ یہ حجر ۱۲۳۰ھ کی تعمیر ہے۔"[5] تحفۃ الابرار یعنی کلیاتِ جدولیہ[6] میں بھی یہی سال ۱۲۳۰ لکھا ہے۔ بقول سر سلی مَن لاش لے آنے کی اجازت ۱۲۳۲ھ میں ملی تھی۔ یہ سال ۲۳، رجب ۱۲۲۷ھ کو شروع ہوا تھا۔ لاسی الہ آباد آنے اور لاش لے جانے میں بھی کچھ زمانہ لگا ہوگا۔ حجر کی تکمیل کی نوبت ۱۲۳۰ میں پہنچی ہوگی۔

یہ بھی آشکار ہے کہ ایک تنگ حال شخص کے لئے جو خود دوسروں کا دست نگر ہو، اس چیز کے لئے بھی سرمایہ فراہم کر لینا آسان نہ تھا۔ میرا مقصود بے خطا الخطابی شہنشاہ اکبر ثانی سے ہے۔ جس نے لال قلعہ دہلی کی موتی مسجد سے سنگ مرمرے کو اُٹھوا کر اس مقبرہ میں چڑھائے تھے[7]۔ یہ حجر اب تک بہت اچھی حالت میں ہے۔ اس پر کوئی کتبہ یا قطعۂ تاریخ کندہ نہیں ہے۔

فرخ آباد کے دلچسپ کارنامۂ وقائع "لوح تاریخ" سے پایا جاتا ہے کہ ملکہ ممتاز محل کو مرزا جہانگیر کا غم

---

[1] جن کے حالات میں سر سید نے سیرتِ فریدیہ لکھی ہے۔ مطبوعہ مفید عام آگرہ۔ خواجہ صاحب بڑے محقق و مصنف گزرے ہیں۔ فن پرکار سازی پر فارسی میں ایک عالمانہ رسالہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار یادگار چھوڑا تھا۔ نیز سوانح عمری مولوی مسیح اللہ خاں، مطبوعہ ۱۹۰۹ء، صفحہ ۱۱۔ و۔ مشاہیرِ اسلام، صفحہ ۲۳۶۔ و۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۷۰۔ [2] سوانحِ مذکورہ صفحہ ۱۳۔ [3] قاموس المشاہیر صفحہ ۱۰۲۔ و۔ ڈکشنری، صفحہ ۳۰۔ [4] مفتاح، صفحہ ۲۷۵۔ [5] آثار الصنادید، صفحہ ۴۰۔ [6] صفحہ ۵

[7] رسالہ شاہکار، لاہور، اکتوبر ۱۹۳۵ء، صفحہ ۱۰۔

والم مدتوں رہا تھا۔ حتےٰ کہ جب سنہ ۱۲۳۹ھ (سنہ ۱۸۲۴ء) میں نواب غلام حسین خانِ شوکت جنگ رئیس فرخ آباد نے دہلی میں وفات پائی اور اُن کی نعش چند روزہ تدفین یا تعویق کے لئے "قلعۂ دہلی کے نیچے سے ہو کر گزری تو بیگمات میں ایک شورِ ماتم اور فریاد کا برپا ہوا۔ علی الخصوص مادرِ جہانگیر شاہزادے کو نہایت قلق اور کوفت گزرا۔ اور آواز نوحہ کی بلند کی۔ اور اُس حالت میں اُن کی زبان پر گزرا کہ آج غم اپنے جہانگیر شاہزادے کے مرنے کا پھر مجھ کو تازہ ہوا کہ جیسے وہ پردیس میں جا کر موئے تھے ویسے ہی یہ بھی غریب الوطن ہو کر بے یار و غمگسار فوت ہوئے۔"[1]

سر ولیم سلی مین نے اپنے سفرنامہ میں مرزا کی نسبت دوستانہ رنگ میں جو کچھ لکھا ہے اُس کو پڑھ کر بے اختیار غالب مرحوم کا ایک شعر یاد آجاتا ہے۔

برمن چنداں گنہ اندر گمانی می کند نسبت
کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

وہ ذاتی شناسائی اور مشاہدۂ حال کے مدعی ہیں اس لئے مجھے اُن کی تحریر کے نقل کر دینے سے چارہ نہیں۔ اس سے دہلی کے سنگین حظیرے کی تعمیر کا صحیح حال اور انگریزوں کی نگاہ میں اُس کی خوبی و شان کا پتہ بھی چل جائے گا۔

"مرزا جہانگیر دہلی میں سنگ مرمر کے ایک روضہ میں دفن ہیں۔ جس پر نہایت عمدہ نقاشی کی گئی ہے (ملاحظہ ہو نوٹ ۱) مرزا جہانگیر اکبر ثانی بادشاہِ حال کے بیٹے تھے۔ مرزا جہانگیر کو میں الٰہ آباد سے اچھی طرح سے جانتا تھا۔ نیپال کی لڑائی کے ختم ہونے کے بعد اپنی رجمنٹ کے ساتھ میرا قیام الٰہ آباد میں رہا تھا۔ یہ سنہ ۱۸۱۶ء کی بات ہے۔ ان کو ہافمین کی چیری برانڈی HOFFMAN'S CHERRY BRANDY کا بے حد شوق تھا اور جلد سے جلد اپنے کو اس کے ہاتھوں ختم کر رہے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "صرف یہی تو ایک شراب ہے جو واقعی تم انگریزوں کے یہاں پینے کے قابل ہے اور اس میں صرف ایک ہی عیب ہے کہ انسان اس کو جلد سے جلد پی جاتا ہے۔" وہ اپنا لطف قائم رکھنے کے لئے ہر گھنٹہ ایک بڑا گلاس پی لیتے تھے یہاں تک کہ سرشار و مدہوش رہتے۔ اس اثنا میں باجا بجانے والوں اور

[1] تالیف سنہ ۱۲۸۳ھ۔ صفحہ ۲۶۷۔ قلمی، کتاب خانۂ صمدن۔ بزبانِ اُردو۔

ناچنے والیوں کے دو تین طائفے اُن کے لطف و تفریح کے لئے باری باری مشغول خدمت رہتے تھے۔ مرزا کی موت جلد آ گئی۔ اُن کی ماں بادشاہ بیگم جن کو معمر بادشاہ بہت محبوب رکھتا تھا، بادشاہ کو یہ یقین دلاتی رہیں کہ انگریزوں کا برتاؤ اُس کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ وہ رنج و آہ کرتے کرتے رخصت ہو گیا۔ انگریز اس کو دہلی میں نہیں رہنے دیتے تھے کیونکہ وہ برابر اسی فکر و تدبیر میں لگا رہتا تھا کہ اپنے بڑے بھائی شاہزادہ ولی عہد کو مروا ڈالے۔ وہ رعایا میں شورشیں برپا کرنے کی کوششیں کیا کرتا تھا۔ سو وہ الہ آباد میں اسیر و محبس کی حالت میں نہ تھا۔ صرف اس کو دہلی واپس جانے کی ممانعت تھی۔ اُس کا مکان شاندار تھا۔ آمدنی معقول تھی اور اُس کے مرتبہ و شان کے مطابق تمام اعزاز برقرار تھے۔"

"(نوٹ تحتی ۔ لفٹنٹ ہارکوٹ اپنی تاریخ کے صفحہ ۹۰ میں صحیح لکھتے ہیں کہ یہ قبر دستکاری کا ایک بے مثل حد درجہ کامل نمونہ ہے۔ خود قبر زمین سے کئی فٹ بلندی پر ہے۔ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں ہیں۔ اس کے گرد نہایت خوبصورت تراشا ہوا سنگ مرمر کا پردہ (حظیرہ) ہے۔ تابوت پر اعلیٰ درجہ کی دستکاری کی گئی ہے۔ پھول پتے سنگ مرمر کے بنے ہوئے اس کو اپنے اندر ڈھانپے ہوئے ہیں۔ قبر ۱۸۳۲ء میں تیار ہوئی تھی)"[1]

راجہ درگا پرشاد نے گلستان ہند میں مرزا جہانگیر کے ذاتی حالات اور بعض واقعات تحریرات بالا سے زیادہ لکھے ہیں اس لئے اُن کا اعادہ ضروری نظر آتا ہے۔

(شاہ عالم کی وفات بر تاریخ ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھے، تو حسب معمول فرامین جاری کئے۔ عہدے تقسیم فرمائے، خلعتیں دیں۔ صاحب رزیڈنٹ بہادر کو "ناظم الدولہ دو ستدار خاں تہامت جنگ صوبہ دار دہلی و مدار المہام مقدمات مالی و ملکی دخاصہ" کا خطاب ملا۔ مرزا ابو ظفر فرزند اکبر کو حسب تجویز رزیڈنٹ صاحب ولیعہدی میں لیا۔ سید رضی الدین خاں کو خطاب سیف الدولہ اور وکالت رزیڈنٹی پر ممتاز کیا۔ لیکن بادشاہ کا تعلق خاطر مرزا جہانگیر فرزند دوم کی طرف تھا اور اُس کی ماں سے پیشتر ہی اس امر خطیر کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس لئے سب کے سب اس انتظام کی تغییر کی فکر میں ہوئے۔ راجہ تکیلے

---

[1] جلد دوم، صفحہ ۱۹۷۔ [2] منتخبات التواریخ، صفحہ ۵۶۴۔ [3] تاریخ بادشاہان دہلی، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۳۰۲ھ، صفحہ ۱۵۔

بقال تحفوں اور ہدیوں کے ساتھ مرزا ابوظفر کی ولیعہدی کی تنسیخ اور مرزا جہانگیر کو یہ منصب جلیل دلانے کے لئے کلکتہ بھیجے گئے۔ مگر ناکامی ہوئی۔ رزیڈنٹ صاحب سے کدورت پیدا کر لی۔ اسی زمانہ میں ایک روز بادشاہ تماشا و تفریح کے لئے شکار کھیلنے کوٹلہ فیروز شاہ کی طرف تشریف لے گئے تھے کہ رزیڈنٹ صاحب نے چند ضرب توپ در دولت پر حاضر کیں، تاکہ بادشاہ کی واپسی پر مراتب سلامی بجا لائیں۔ ان بے عقلوں نے توہمات گوناگوں پیدا کر لئے اور کچھ اور معنی لگائے۔ بادشاہ کو خبر کی گئی۔ تلاطم عظیم پڑ گیا اور اردوئے بادشاہی میں قیامت برپا ہو گئی۔ رزیڈنٹ صاحب نے انواع استمالت و اظہار امور اطاعت سے بادشاہ کو مطمئن کر کے قلعہ میں پہنچا دیا۔ اس روز سے قطعی ممانعت ہو گئی کہ بادشاہ کبھی قلعہ سے باہر نہ نکلنے پائیں۔ مقربان خدمت کی نافہمی اور بادشاہ وقت کی سادہ لوحی سے یہ صورت بھی باقی نہ رہی۔ یہ کدورت ابھی دلوں سے رفع نہیں ہونے پائی تھی کہ تازہ گل کھلا۔

مرزا جہانگیر کثرت شراب سے ہر وقت مخمور رہتے تھے۔ بادہ خواری کی زیادتی سے بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ رزیڈنٹ نے خیر اندیشی نیز انسداد باب فساد کے لئے ترک بادہ خواری کا انتظام جس جس طور سے مناسب تھا، کیا۔ لیکن جہانگیر مرزا تو بادۂ گلرنگ کے دلدادہ اور بھولے دختر رز کے جان باختہ تھے، اس سد باب سے مغموم و مکدر ہو گئے۔ رزیڈنٹ صاحب سے انتقام لینے کے لئے کمین گاہ میں بیٹھے۔ ایک روز صبح کو رزیڈنٹ صاحب ہوا خوری نیز ملاحظہ امور ضروری کے لئے تن تنہا سیر کرنے چھوٹے قلعہ میں آ نکلے تو مرزا نے بے اختیار (تماشا) اُن پر تپنچہ سر کیا۔ ان کا نشانہ غلط پڑا۔ رزیڈنٹ صاحب بھاگ کر رزیڈنسی میں چلے آئے۔ اپنی فوج جمع کر کے قلعہ کے اندر گئے اور زد و گشت اور گیر و دار شروع کی۔ نواب شاہ نواز خاں، جو امور خانگی کے مختار کل تھے، امیر الدولہ خطاب تھا، جلدی سے رزیڈنٹ صاحب کے پاس پہونچے۔ اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ کیا غلام قادر خاں پھر زندہ ہو گیا ہے! خدا کے لئے رحم فرمایئے۔ رزیڈنٹ صاحب نے فرمایا کہ جب تک جہانگیر مرزا ہاتھ نہ آجائے گا، ہاتھ سے کام اور کام سے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ شاہ نواز خاں نے مرزا کو لے جا کر رزیڈنٹ صاحب کے سپرد کر دیا۔ تو وہ فتنہ و فساد بند ہوا۔ امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی۔ جہانگیر مرزا محبوس کر کے الٰہ آباد بھیج دئے گئے۔ کچھ دن بعد بادشاہ نے رزیڈنٹ سے صفائی کر کے اپنے پر مہربان کر لیا۔ ایک لاکھ روپیہ ماہوار مواجب مقرر ہوا جہانگیر مرزا نے بھی قید سے رہائی پائی اور حضور شاہی میں پہنچ گئے۔

مرزا کو سیر و شکار کی ہوس میں سمائی تو اودھ جانے کی رخصت مانگی۔ اجازت ملی اور رزیڈنٹ کی عنایت سے بڑے شکوہ اور جلوس کے ساتھ اودھ پہونچے۔ نواب سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ مراسم مہمانداری اور مراتب اطاعت و فرماں گزاری بجالائے۔[1] اظہار اخلاص کیا۔ لیکن مرزا کے اطوار اچھے نہ تھے۔ ہنجار درست نہ تھا۔ عشرت پرست ندیموں اور کم فطرت مصاحبوں کی صحبت میں بُرے بُرے کام کر گزرتے تھے۔ اپنی قوت اور خاندان شاہی کی عزت برباد کر دی۔ اکثر اوقات عصمت پرست پردہ نشینوں کو گھر سے زبردستی باہر کھینچ لاتے۔ بے حرمتی کرتے اُن کی عصمت و عفت اور اپنی عالی منزلت میں داغ لگاتے تھے جبر و تعدی سے طلب کر کے رنڈیوں سے دہ سب کچھ کر ڈالتے تھے جو اُن کو نہ کرنا چاہئے تھا اس لئے نواب سعادت علی خاں کی استدعا پر اُن کا اخراج لکھنؤ سے ہوا۔ الٰہ آباد میں قیام قرار پایا۔[2] اسی خسرو باغ میں۔

بہ تفریح گاہ، بہ جسایۂ خسلد بریں ۔۔۔ گل بداماں، گل فشاں، گل ریز، گلشن آفریں ۵۳

میر ناصر علی خاں بہادر صلائے عام دہلی میں 'زیر عنوان دہلی شاہ جہاں آباد' لکھتے ہیں۔

"شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ ثانی کا زمانہ بھی خاصہ ہوا۔ لیکن ایک بات اکبر شاہ ثانی کی ضرور قصہ طلب ہے کہ تخت پر بیٹھتے ہی بادشاہ کو اپنے بڑے بیٹے ابوظفر سے اُلجھن پیدا ہو گئی۔ اگر سرکار انگریزی کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو ابوظفر بہادر شاہ کو تخت نصیب نہ ہوتا۔ اس معرکے کے طے کرنے میں سرکار انگریزی نے جو کوششیں کیں، بہادر شاہ کو بھولنی نہ چاہئے تھیں۔ اکبر شاہ ثانی نے اپنے بیٹے کو خلل دماغ بتایا اور چھوٹے بیٹے جہاندار شاہ[3] کی ولیعہدی کے لئے بہت زور دیا۔ جہاندار شاہ

---

[1] مرزا محمد حسین قتیل لکھتے ہیں کہ شاہزادہ جہانگیر بتاریخ ۲۲ محرم کو لکھنؤ میں داخل ہوئے تھے۔ جناب عالی (نواب وزیر) نے بڑے ترک و احتشام کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ شاید آصف الدولہ نے شاہزادہ مرزا جواں بخت کا بھی اس شان سے استقبال نہ کیا ہوگا۔ سعادت علی خاں کو اپنے ہی ہودے پر اپنے پہلو میں بٹھایا تھا۔ قتیل بھی سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ کرسی سنگ گراں کو بٹھایا اور اپنے ساتھ کچھ کھلایا بھی تھا (صفحہ ۱۰۰ رقعات مطبوعہ ۱۲۸۳ھ)۔

[2] گلستان ہند تتمہ دفتر دوم، صفحات ۲۰۲ تا ۲۰۷۔ [53] رسالہ نمبر ۶، ماہ جولائی ۱۹۱۵ء صفحہ ۲۶۔

[3] شاید غلطی ہے۔ اکبر ثانی کا کوئی بیٹا اس نام کا نہ تھا جہاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت بہادر، شاہ عالم ثانی کا

الہ آباد جلاوطن کئے گئے۔ اس کی مفصل کیفیت بھی تاریخ کے لئے لطف سے خالی نہیں"۔

افسانہ از افسانہ کی تیز رو۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی فرماتے ہیں کہ مرزا جہانگیر نہایت حسین جوان تھے۔ مگر شراب بہت پیتے تھے۔ 'متوالا' ان کا لقب ہو گیا تھا۔ ان کی اور بیویوں اور حرموں کا حال کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک محبوبہ بیگم 'حسینی بیگم' نام تھیں۔ ان سے اور بہادر شاہ سے دو مشہور باغوں کی نسبت تنازع تھا۔ بیگم نے دہلی کی دیوانی عدالت میں دعویٰ کر کے کامیابی حاصل کی۔ آگرہ کی صدر عدالت سے اپیل میں فیصلہ بحال رہا۔ حسینی بیگم نے دوسرا نکاح شاہزادہ مرزا چپا سے کر لیا تھا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پہلے مر گئی تھیں۔ حسینی بیگم کے ایک لڑکی مرزا جہانگیر سے تھیں۔ حسن آرا بیگم نام تھا اور واقعی حسینہ و حسن آرا تھیں زندگی بھر معقول پنشن سرکار سے پاتی رہیں۔ شوہر نے بالزام بغاوت پھانسی پائی تھی۔ بیگم نے مرنے والے کی یاد میں جل جل کر باقی عمر بیوگی میں کاٹ دی۔[1] ذرائع تحقیقات و واقفیت اور مقامی روایات و وسعتِ معلومات کے اعتبار سے میں خواجہ صاحب کی تحریر کو قابلِ استناد سمجھتا ہوں۔

ان طول طویل عبارتوں کے نقل و اعادہ کے لئے عفو خواہ ہوں۔ ان میں واقعات و حالات کا کچھ ایسا حصہ بھی داخل و شامل نظر آتا ہے' جو بظاہر خسرو باغ اور الہ آباد سے باہر کا ہے۔ لیکن شاہزادہ کی داستانِ حیات کا آخری ورق خسرو باغ میں قلمبند ہوا تھا' اس لئے اس کے تتمہ

بڑا بیٹا اور ولی عہد یعنی اکبر شاہ ثانی کا بڑا بھائی تھا۔ باپ کے ساتھ مناقشات رہتے تھے۔ ناخوش ہو کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ وہاں سے مسٹر ہیسٹنگز W. HASTINGS کے ہمراہ بنارس گیا۔ تھا وہاں ۱۲۰۷ھ (یکم اپریل ۱۷۹۳ء) میں وہاں انتقال کیا۔ شاعر بھی تھا۔ "جہاندار" تخلص کرتا تھا حسب روایت گارسن دی تاسی GARCIN DE TASSY اس کے کلام کا مجموعہ "بیاض عنایت مرشد زادہ" کے نام سے انڈیا ہوس میں موجود ہے۔ (بیلس ڈکشنری' صفحہ ۱۲۰' گلشن بیخار' تصنیف ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء (صفحہ ۵۴) اور گلستان بیخزاں' تکمیل ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء (صفحہ ۴۳) میں مختصر حالات مع نمونۂ کلام کے مندرج ہیں۔ مفتاح التواریخ سے بھی واقعات و حالات مذکورہ بالا کی تصدیق ہوتی ہے (صفحات ۱۴۲ و ۳۴۵' مطبوعہ ۱۸۴۹ء) ۔ سلطان رسالہ "نشاہ کار" لاہور' اکتوبر ۱۹۵۳ء' صفحہ ۱۰۔

[1] خواجہ صاحب نے انھیں حالات کا اعادہ اپنے گرامی نامہ میں بھی فرمایا ہے۔

دفعیہ کا الحاق اور الہ آباد و شاہجہاں آباد دونوں کی بیس مرگ کی کیفیتوں کا تقابل ناگزیر نظر آیا۔ یہ خیال بھی دامنگیر ہوا کہ شاید آگے چل کر بیکس خسرو کی طرح غریب و بدنصیب جہانگیر مرزا کو یاد کرنے والا اور اُن کی یاد پر دو آنسو بہانے والا پیدا نہ ہو۔

یاد آگئیں وہ محسن کی یوسف فروشیاں   ہنگامہ خیز عشق کا بازار دیکھ کر

اب وہ روایتیں مرقوم ہوں گی جو ثقہ اور قابلِ استناد بزرگوں سے سُنی ہیں۔
ان کے ہم وطن رفقا اور پرانے اہلِ خدمت کا بیان تھا کہ مرزا جہانگیر بچپن سے ذہین تھے۔ طباع و زود فہم تھے۔ خوش لیاقت فنونِ مجلسی اور آدابِ صحبت کے ماہر تھے۔ باوجودیکہ اس قدر ناز پروردہ اور ماں باپ کے لاڈلے تھے جس روز چار برس، چار مہینے، چار دن کے ہوئے، پڑھنے کے لیے بٹھا دیے گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ خاص ہوتی تھی۔ شروع کے سبق اسلامی اخلاق، ارکان و احکام اور دینیات کے متعلق تھے۔ یہ دستور دہلی کے قلعہ اور مغلوں کے خاندان میں ہمیشہ سے چلا آتا تھا۔

راقم احوال کے نزدیک بھی اس رواج کی قدامت غیر معین ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ مسلمانوں کے ممالک اور مقبوضات میں یہی دستور چلا آتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بابر نے ہمایوں کی تعلیم اسی سن، چار سال چار ماہ چار روز، میں شروع کرادی تھی۔[۱] اسی طرح حسب تحریر ابوالفضل، اپنے آباد و اجداد کی سُنت دیرینہ کی تقلید و پیروی میں ہمایوں نے بھی اکبر کو وہی عمر ہو جانے پر مکتب نشین کرا دیا تھا۔[۲] ہیرودوٹس[۳] HERODOTUS کی تحریر[۴] سے پتہ چلتا ہے اور اسٹرابو STRABO[۵] سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ پرانے زمانہ میں اہلِ ایران اپنے بچوں کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع کر دیتے تھے۔ اس کا کچھ حصہ مذہبی ہوتا تھا۔ لیکن حکیم افلاطون PLATO فرماتا ہے کہ آغاز تعلیم ساتویں برس ہوتا تھا۔[۶] ان عمروں میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں۔

۱؎ تذکرۃ السلاطین۔ ایجوکیشن آف محمڈن لرننگ، از نریندر ناتھ لا۔ صفحہ ۱۲۰۔

۲؎ اکبر نامہ، جلد اول، صفحہ ۲۰۹، مطبوعہ نولکشور۔ ۳؎ ہیروڈوٹس۔ مشہور یونانی مورخ۔ ۴؎ پہلی کتاب صفحہ ۱۳۰۔ ۵؎ پندرھویں کتاب، باب سوم صفحہ ۱۰۔ ۶؎ صفحہ ۳۱۔ First Alcialiades.

بذآمدہ تیمور سے لے کر بہادر شاہ تک تمام مغل شہنشاہ اپنا روزنامچہ رکھتے تھے جس میں اپنی حکومت کے واقعات قلمبند کرتے اور محفوظ رکھتے جاتے تھے۔ تیمور، بابر اور جہانگیر کے تزک مطبوع و عام ہیں۔ ترجمے بھی متعدد ہو چکے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے رقعات و تحریرات سے فارسی کا ہر با استعداد واقف ہے۔ اکبر ثانی کا قلمی روزنامچہ دہلی کے لال قلعہ کے میوزیم میں موجود ہے اور اُس میں بھی بہت سے حالات مرزا جہانگیر کے مندرج ہیں۔ بہادر شاہ کا روزنامچہ خواجہ حسن نظامی کی توجہ سے چھپ چکا ہے۔ مرزا جہانگیر کا روزنامچہ بھی الہ آباد تک رہا تھا، جس میں ان کے اس عالم اسیری اور ان کے متوسلین کے واقعات روزانہ لکھے جاتے تھے۔ کسی وقت اس کے بعض دلچسپ و پُرلطف حصے میرے محترم بزرگ مولانا حاجی سید محمد سعید صاحب کے متروکات آبائی میں موجود تھے۔ راقم احوال اُن کے لئے نگاہِ التفات کا برسوں متوقع رہا تھا۔ لیکن آخر کار میری حرماں نصیبی اُن کی دستیابی میں مانع آئی۔

واہ ری ہمتِ کرم آتشِ شوق پھونک کر ۔ میں نے کہا خطا ہوئی دل نے کہا معاف ہے

موصوف کو اس میں کی بعض باتیں یاد ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کی سرکار میں نجومیوں اور جوتشیوں کی بھی بڑی پرسش و قدر تھی۔ اور اُن کی صوابدید و تلقین پر عمل ہوتا تھا۔ سنیچر کے دن تیل، کالی ماش اور لوہا خیرات کیا جاتا تھا۔ یوں بھی خسرو باغ میں داد و دہش اور خیر خیرات کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا

سلونوں کا تیوہار بڑے اہتمام و تکلف سے مناتے تھے۔ جس کی بنیاد ان کے دادا شاہ عالم ثانیؒ نے ستر بہتر برس پہلے ڈالی تھی اور باپ نے بھی جاری رکھا تھا۔ اس کو یہ بھی ایک خاندانی رسم کے طور پر انجام

۱؎ شاہ عالم ! آپ کے شاہانہ اخلاق اور آپ کی رعایا پروری پر ہندوستان قربان۔ آپ نے صرف یہاں کی بیان ہی کو نہیں سرفراز بلکہ اپنی رعیت کو بھی ہمیشہ نوازا۔ ایک برہمن آپ کی بہن اور شہزادیوں کی چھپی بنی۔ اس کے ہاتھ سے آپ نے راکھی بندھن بندھوایا اور ہندو مسلم رشتہ کو مضبوط کر دکھایا۔

عالمگیر ثانی جب وفات کوٹلہ (فیروز شاہ دہلی) میں شہید کئے گئے تو ان کی لاش جمنا میں ڈال دی گئی۔ بہتے بہتے وہ رات کو ایک کنارے جا لگی۔ اتفاقاً اُدھر سے ایک عورت گزری۔ لاش دیکھ کر بھی پہچان کر اُسکے پاس بیٹھ گئی کہ صبح ہو تو خبر کرے۔ یہاں قلعہ میں بادشاہ کی سواری کوٹلہ سے نہ لوٹی تو فکر ہوئی تلاش ہوئی مگر پتہ نہ چلا صبح کو حال کھلا۔ شاہی لاش

دیتے تھے۔ خوشی خوشی خود لیتے اور اپنے رفقا و مصاحبین کے راکھیاں[1] بندھواتے تھے۔

باوجودیکہ یہاں کے قیام کا زمانہ دس گیارہ سال سے تجاوز نہیں ہوا، اطراف الہ آباد میں بعض

ہندو عورت قلعہ میں لائی گئی۔ شاہ عالم بادشاہ ہوئے۔ آپ نے اُس عورت کو انعام اکرام دیا اور اُسے اپنی بہن بنایا۔
اُس دن سے یہ بہن جن کا نام رام کنور تھا قلعہ میں ایسا حق جتا کر آتیں اور رہتیں۔ انھیں کی خاطر سے ہندوؤں کی ایک
خاص رسم سلونو کی شاہی محل میں نیل ہوئی۔ یہ تہوار سالانہ منایا جاتا اور اس میں کل ہندوانی ریت رسم برتا جاتا۔
برسات میں یہ تہوار ہوتا۔ جھولے پڑتے، پینگ بڑھتے، جوڑے سلتے، کڑھائیاں چڑھتیں، عورتیں پکوان
تلتیں۔ اتنے میں بہن جی آتیں اور سونے کی تھلی میں کچھ ساتھ لاتیں۔ حضور (بادشاہ) تک پہنچتیں اور اپنی تھلی سے سچے
موتیوں کا سرن نکالتیں۔ اس میں سونے کی گھونڈیاں ہوتیں۔ جھجک کر ایک ادا کے ساتھ شاہ عالم کی کلائی میں
اسے باندھتیں۔ بادشاہ مسکراتے اور بہن جی کی پیٹھ پر ہاتھ دھرتے اور ان کی اور اس راکھی بندن کی سلامتی کی
دعا کرتے۔ پھر اُن کے ہاتھ میں خود بدولت زمردی چوڑیاں پہناتے اور بھائی ہونے کا حق ادا کرتے۔ پھر شال
دوشالے بٹتے۔ برہمن بڑھ کر اسیس (دعا) دیتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کی دھوم مچتی، باجے بجتے، ناچ رنگ ہوتے،
ساز چھڑتے، دسگلے پڑتے۔ محفل اُٹھتی تو شاہ بھائی کے گھر سے رام کنور بہن ایک شان سے رخصت ہوتیں۔ شہزادیوں
کے جھرمٹ میں دیوڑھی دولت تک آتیں اور پھر سواری میں گھر جاتیں۔

شاہ عالم کے بعد بھی یہ رسم قائم رہی۔ اکبر ثانی کے وقت میں ان رام کنور کی بیٹی راکھی بندن باندھتے اور اپنا
نیگ لیتی تھیں۔ بہادر شاہ نے بھی سلونو کو باقی رکھا تھا۔" (مغل اور اردو، صفحات ۱۰۰ و ۱۰۱)۔

[1] مغلیوں کے یہاں اس کی رسائی اور قدر دانی کا قصہ بہت پرانا اور بہت مشہور ہے۔ کرنیل ٹاڈ اس کے
راوی ہیں۔ یہ بھی سُن لیجیے۔

سمبت ۱۵۸۹، مئی ۲۳ - ۱۵۳۲ میں ہمایوں چنار کے قلعہ کا محاصرہ کر رہا تھا۔ بیرم خاں اور شیر خاں اس کے
لشکر کے سردار تھے۔ دو راجپوت سوار خستہ و پریشان حال چوڑے آئے۔ سر پیتی مہارانی کرناوتی کا خط مع ایک
راکھی کے پیش کیا جو ریشم کی ایک مرصع خوبصورت چیز تھی۔ جس میں سونے کی زنجیر لگی تھی اور قیمتی جواہرات
جڑے تھے۔

مستقل باتیں اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے۔

عید کے دوسرے دن موضع مڑوانرہ میں "ٹر" کا میلہ منایا جاتا تھا۔ اطراف و جوانب کے شرفاء و رؤسا جوق جوق آتے اور لطف و محبت سے باہم ملتے تھے۔ خود شاہزادہ بھی ان کی بزم سور و سرور میں شریک ہوتا۔ میلے کی رونق اور چہل پہل روز افزوں ہوتی جاتی تھی۔ مرزا کے انتقال کے بعد بھی کچھ مدت تک یہ اجتماع باقی و جاری رہا۔ لیکن وہ کیفیت و جمعیت نہیں تھی۔

واقعہ یہ تھا کہ سلطان بہادر شاہ والیٔ گجرات اپنے باپ مظفر شاہ ثانی کی شکست و ذلت کا بدلہ لینے کے لئے چتوڑ پر چڑھ آیا تھا۔ منڈو کا راجہ اس کا حلیف و رفیق تھا۔ رومی خاں کمانڈر اور جنرل اس کا سپہ سالار تھا۔ چتوڑ کو بچانے کے واسطے ادھر سے بھی بوندی کا بہادر فرزند پانسو راجپوتوں کے ساتھ آیا تھا۔ جھالور کا راجہ سونگر راج آبو کا راجہ دیوراؤ اور بہت سے سورما راجا مہاراجا پہنچ گئے تھے۔

نوجوان ہمایوں نے اس معزز و نیک نام رانی اور راجپوتوں کے سب سے ممتاز و محترم خاندان کے سردار رانا اودے سنگھ کی ماں کی فریاد اور صدائے استمداد کو سنا۔ چنار کا محاصرہ چھوڑ کر چتوڑ کا رخ کیا۔ چنار گڑھ سے چتوڑ سوا پانچ سو میل ہے۔ سارنگ پور پہنچا تھا کہ چتوڑ کی تباہی کی خبر ملی۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ تاہم ہمایوں نے یا یوں کہیے کہ ایک مسلمان بادشاہ نے دوسرے مسلمان بادشاہ سے ایک ہندو رئیس پر لشکر کشی اور اس کے برباد کر ڈالنے کا انتقام لے لیا۔ منڈو کے قریب، علاقہ مالوہ میں ہمایوں اور بہادر شاہ کا سامنا ہوا اور اسی سلسلے میں بہادر شاہ کی قسمت کا فیصلہ۔ کتنی بے اعتبار ہے دنیا!
[نیز ملاحظہ ہو "اکبر اور سلطنت مغلیہ کا عروج" از کرنل میلسن، صفحہ ۱۰۱۔]

لیکن ہمارے ملک کی قرون وسطیٰ کی تاریخوں میں ایسی مثالیں اور بھی ملتی ہیں۔ جن سے روشن ہوتا ہے کہ صلح و آشتی یا معرکہ آرائیاں مذہبی اختلافات کی وجہ سے نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ اغراض و مقاصد کا اتحاد یا باہمی منافع اور مصلحتیں ان کی محرک اور باعث ہوتی تھیں۔ عصر حاضرہ کے مورخ ہم کو غلط بتاتے اور جھوٹ سکھاتے ہیں۔
حسن خاں میواتی نے رانا سنگرام عرف رانا سانگا کے شریک حال و متحد ہو کر شہنشاہ بابر کا مقابلہ کس جوانمردی سے کیا تھا۔ راجہ بکرماجیت کو ساتھ لے کر ابراہیم لودی بابر کے خلاف میدان جنگ پر گیا تھا اور پانی پت کے میدان میں دونوں نے ایک ساتھ جان دی تھی۔

موضع بسونان (پرگنہ چاپل) کے اور سمت ایک موضع ڈاہی ہے جہاں اندنوں تنبولیوں کی آبادی ہے۔ تعلقداران اسراوے کلاں کی ملک ہے۔ اس کے شمال جانب ایک باغ ہے، جس کی چار دیواری اور دکھن طرف کا پھاٹک بالکل مغلیہ طرز تعمیر کا، شاندار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ زمانۂ قیام الہ آباد یعنی اپنی شاہزادگی میں شہنشاہ جہانگیر یہاں ٹھہر کر شکار کھیلا کرتا تھا۔ وسطِ باغ میں ایک گنبددار عمارت بھی اُسی طرز کی تھی جس کا ذکر اس کتاب کے صفحات پر آچکا ہے۔ آس پاس میدان ہے اور آبادی کے ٹیلے سے ملحق، دکن کو ایک طویل و عریض جھیل، جو مقامی طور پر 'تال' سے معروف ہے۔ پانچ چھ پشت بعد مرزا جہانگیر یہاں پہونچے اور اپنے ہمنام سلف کی یادگار کو از سرِ نو آباد کیا۔ تازہ رونق دی۔ اپنا شکارگاہ بنایا۔ اس وسیع میدان پارسنہ میں ہرن اور جنگلی جانور رہتے تھے۔ باقیات میں وہ قمرغہ[1] یا اُس کے آثار ابھی قائم ہیں، جن کا عام طور پر، ان اطراف کے باشندے اور دہقان حوالہ یا نشان دیتے ہیں۔ مرزا جہانگیر یہاں اپنے خیمہ و خرگاہ کے ساتھ تشریف لاتے اور قیام و تفریح فرماتے تھے۔ ان کی شہ سواری و چابک دستی کے متعلق اب تک بہت سی باتیں زبانوں پر ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ اُن کو افسانہ سمجھیں۔ میں کہوں گا کہ تذکروں میں اس قسم کی داستانوں اور قصّوں کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ کوئی مدعیٔ دانش و ادراک تو ان کو باور ہی نہیں کرتا؛ اور کوئی سادہ دل حُسنِ عقیدت کی ڈالی نذر لاتا ہے، نیازِ پرستاری پیش کرتا ہے۔ بہرکیف۔ میں تو ان روایات یا تاریخی حکایات کو اس اندیشہ سے حوالۂ قلم کر رہا ہوں کہ جس طرح لکھے ہوئے واقعات کا بتانے والا (مرزا کا روزنامچہ) ضائع یا غائب اور ہمارے دسترس سے باہر ہو گیا ہے، کسی دن ان احوال و اقوالِ زبانی کا سنانے والا بھی صفحۂ دہر سے ناپید ہو جائے گا۔

حلش اے خارِ جنوں کوئی نہ باقی رکھنا　　پھر نہ آئے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

کہتے ہیں کہ مرزا جہانگیر گھوڑے پر سوار ہو کر کوڑے کی ایک ہی ضرب سے گوزن و آہو کو

---

[1] قمرغہ (ترکی) شکار جرگہ کا طریقہ بہت پرانا چلا آتا ہے جس میں بہت سے آدمی جنگل کو ہر طرف سے گھیر لیتے تھے۔

گزاردیتے تھے۔ ان کے شکار کو جانے اور وہاں پہونچنے کا غلغلہ جب بلند ہوتا تو دور دراز مواضع سے لوگ سیر و تفریح کے لئے آتے اور دُور دُور کنارے کنارے بیٹھ کر تماشا دیکھتے تھے۔

ان کے گھوڑے کی سواری کی نسبت عجیب و غریب قصے سننے میں آتے ہیں۔ خسرو باغ کی بلند دیواریں پھندا کر گھوڑا دوسری طرف کود ڈالتے تھے۔ سڑک اعظم پر جس وقت سواری نکلتی ہو اور بھوسہ، چارہ وغیرہ کی لدی ہوئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہوں جو خوب بھری ہوئی اور اونچی ہوتی ہیں تو حکم تھا کہ راہ سے گاڑیاں ہٹائی نہ جائیں بلکہ تھوڑا تھوڑا فاصلہ دے کر کھڑی ہو جائیں۔ مرزا اپنے مرکب باد رفتار پر سوار ان گاڑیوں کے اوپر سے گھوڑا کوداتے پھنداتے نکل جاتے تھے۔

شاہانہ فیاضی اور مہمان نوازی کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی تنہا نہیں کھاتے تھے صلائے کرم عام تھی۔ اور خوان یغما وسیع۔ ہمراہی و تماشائی خواہ کسی مرتبہ و حیثیت کے اور کسی تعداد میں ہوں سب کو وہی کھانا پہونچتا تھا جو شاہزادہ کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ مرزا اس وقت تک خاصہ تناول نہیں فرماتے تھے جب تک یہ اطلاع نہیں مل جاتی تھی کہ ہر رفیق و متنفس کو کھانا پہنچ گیا ہے۔ اگر اُس وقت شاہی دسترخوان پر کھچڑی ہو گی تو وہی چیز اُسی اہتمام و تکلف کی ہر ایک کو پیش کی جائے گی۔

شاہزادہ کی ہیبت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے دل گُردے والے ڈرتے اور گھبراتے تھے۔ ایک روز کوئی انگریز شاہزادہ کی اطلاع و اجازت بغیر اسی شکارگاہ میں شکار کھیلنے چلا آیا۔ دریائے جمن کے کنارے اپنا خیمہ نصب کرایا۔ کوئی شریف زمیندار اتفاقاً اُدھر سے گزرا تو صاحب کو اُس کا آنا ناگوار ہوا۔ اُس کو پکڑوا کر خیمہ کی طنابوں اور میخوں سے بندھوا دیا۔ ادھر سزا دینے کے لئے ہنٹر لانے کو خیمہ کے اندر گئے، اُدھر شاہزادہ کے جلوس کے نقارہ پر چوب پڑی۔ [شاہی آداب و آئین کے مطابق انکے آگے آگے اونٹ پر نقارہ چلتا تھا اور زور زور سے بجایا جاتا تھا] ۔ صاحب تو فی الفور بہ نفس نفیس جمنا کی طرف رواں دواں ہو گئے اور ملتزمانِ خدمت و ہمراہیان کو حکم دے گئے کہ خیمہ ابھی توڑ کر گھسیٹ لاؤ اور دریا کنارے پہونچاؤ۔ اتنا وقت نہیں ہے نہ فرصت کہ تہ کر کے اُٹھایا جائے۔

اور رفتہ رفتہ اس حلقے کو تنگ کرتے جاتے تھے حتے کہ تمام جانور گھر کر اسٹ کر سامنے نشانہ کی زد پر آجاتے تھے تو ان پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا جاتا تھا۔ بہت سے مارے جاتے اور بہت سے زندہ پکڑ لئے جاتے تھے۔ رو رو دو آہو وغیرہ سے

پُر تکلف و خوش رنگ لباس کے دل دادہ تھے۔ ایک رنگریز مزاج شناس تھا، جو انعامات و بخشش سے مالا مال رہتا تھا۔ فرمایش ہوتی کہ ایسا کپڑا رنگ کر لاؤ جو بظاہر سفید ہو لیکن اگر اتنی تہیں کر دی جائیں۔ تو فلاں رنگ پیدا ہو اور اتنی تہیں ہوں تو فلاں رنگ معلوم ہو۔ یہ ہنرمند اگر پسند کے قابل چیز تیار کریگا تو اُس کی قدردانی، زر بخشی و زرپاشی کا کیا ٹھکانا ہوتا، ورنہ خلاف مرضی ہونے پر اُتنی ہی قمچیاں بھی عنایت ہوتی تھیں۔

مرزا قتیل لکھتے ہیں کہ شاہزادۂ جہانگیر انگریزی لباس پہنتے تھے۔ سر پر کسی جانور کے پر لگاتے تھے جو ارغوانی رنگ کے ہوتے تھے۔ ان کے چار رفیق یا مصاحب بھی اسی وضع و ہیئت میں رہتے تھے[1]۔

الہ آباد والوں نے شاہزادہ کے مرنے کا بڑا ماتم کیا اور انجو و اندوہ کے ساتھ تاریخیں کہی تھیں۔ ادبیاتِ مغل اور مفتاح التواریخ سے چند قطعے نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱)
چوں جہانزار[2] ابنِ اکبر بادشاہ — در جہاں با دانش و با داد گشت
از قدومِ آں دُرِ بحرِ کرم — رونقِ شہرِ الہ آباد گشت
آں چناں بنہاد خوانِ فیض را — ہر یک از فکرِ معاشش آزاد گشت
چوں ز سی یکساں عمرش شد فزوں — طبعِ او از زندگی ناشاد گشت
خیمہ زد در منزلِ جنت سرا — ایں چہ از دورِ فلک بیداد گشت
عالمے شد در غمش چنداں اسیر — نامِ شادی از جہاں برباد گشت
ابر آمد در عزا گریہ کناں — بر فلک ہم ماتمے[3] ایجاد گشت
از پئے تاریخِ فوتِ او دلم — ہر طرف با نالہ و فریاد گشت

شد عیاں ایں مصرع از ترکیب آہ
حیف بے رونق الہ آباد گشت
۱۲۳۶ = ۱۲۳۰ + آہ

[1] (صوبۂ گورکھپور؟) کی کر جیتے اور شہر تک کوئی چرند و پرند بچانا تھا (صفحہ ۱۰۱) رقعات بر ۱۷۷۲ء لکھنؤ صفحہ ۸۰۔ [2] جہاندار لکھتے ہیں، جہانگیر نہیں۔ [3] ماحی۔

(٢)

چوں از جہاں برفت جہانگیر میرزا ۔ نورِ نگاہِ اکبر و سالارِ دوسرا
شد خانۂ عزا بغمش دارِ سلطنت ۔ محزوں شد از وفاتِ وے آں ظلِ کبریا

تاریخ فوتِ او بظہور آمدہ چنیں ۔
از کانِ شاہ رفت زہے لعلِ بے بہا

۱۲۳۷ھ

(٣)

جہانگیر شہزادہ چوں از جہاں ۔ بشہزادگی دل بہ برداشتہ
بسیج فنا اشہبِ عزم راند ۔ بگلگشتِ جنت عناں تافتہ
پہ شورِ قیامت فغاں در غمش ۔ بروئے زماں آہ برخاستہ
بہ ہاتف بگفتم کہ کلکِ سعید ۔ پئے تاریخِ فوتش رقم ساختہ

بدیں گونہ گفتہ کہ بے پائے مید
بملکِ بقا سلطنت یافتہ

۱۲۳۶ = ۴ - ۱۲۴۰

(۴)

از گردشِ چرخِ ستم ایجاد چرا شد + کاں فخرِ زمانی
افسوس کہ عازم سوے فردوس سرا شد + در عینِ جوانی

تاریخ وے از کلکِ قضا منشیِ تقدیر + بر لوحِ محفوظ
بنوشت "جہانگیر جہاندارِ بقا شد + از منزلِ فانی" [1]

۱۲۳۶ = ۲۷۶ + ۹۶۰

بوڑھوں سے سنا ہوا اُن کے بوڑھوں کا دیکھا ہوا لکھتا ہوں۔ مرزا جہانگیر کو جب دہلی سے چلے ہیں تو نمازِ جنازہ جامع شاہجہانی (مسجدِ نواب شائستہ خاں) میں پڑھی گئی تھی۔ شاہزادہ کے آخری

[1] از رسالۂ مغل۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۷۱۔

نظارے کیلئے ہزاروں لاکھوں آنے والوں سے قلعہ کا لق و دق میدان بھرا ہوا تھا۔ جسقدر ازدحام ہر ایک طبقہ و جماعت کے لوگوں کا اُس روز ہوا تھا پھر کبھی دیکھا یا سُنا نہیں گیا۔ اور جو ماتمی باجا اُس وقت بجایا گیا تھا اُس کے درد انگیز ترانے اور دلدوز تانیں ان ثقہ و متین بزرگوں کے کانوں اور دل و دماغ میں ان کے آخر دم تک گونجتی رہی تھیں۔

بازہوائے چمنم آرزو ست۔ سید کمال الدین حیدر متوسلِ دربارِ لکھنؤ نے گورنمنٹ ہند کے سیکرٹری اعظم (نامور مورخ) سر ہنری ایلیٹ کے ایماء سے ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں سوانحاتِ سلاطینِ اودھ کے نام سے ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی۔ بقول اُن کے ڈاکٹر اسپرنجر محافظ کتب خانۂ شاہی، کرنل ونکاکس مہتمم رصد خانۂ سلطانی، کلنٹ صاحب منتظم کالج، جنرل مارٹن اور جنرل سلیمن رزیڈنٹ نے اُس کو دیکھا اور پسند فرمایا تھا۔[1] مرزا جہانگیر کا لکھنؤ جانا اور پھر وہاں سے ہٹایا جانا ان کی یاد اور ان کے سامنے کی بات ہے۔

کتاب مذکور کی اردو ایڈیشن میں "ورود مرزا جہانگیر شاہزادہ دہلی" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔[2]

محمد اکبر شاہ بادشاہ دلی مرزا جہانگیر شاہزادہ کو بہت چاہتے تھے کہ محبت پدری سے حالت تعشق تھی۔ ان جرات سے جو اُن سے حرکت خلافِ منزلت شاہی یا صحبتِ بد کی جہت سے سرزد ہوتی تھی اُسے ازرہ محبت عفو فرما کر دردلی سے سمجھاتے رہتے تھے۔ جب تاثیرِ صحبتِ غیر جنس سے اُن کے حرکات ناشائستہ بڑھے۔ سیٹن صاحب رزیڈنٹ دربارِ شاہی میں ہر صبح حاضر ہوتے تھے اُن کی نسبت بھی حرفہائے خلاف و نامعقول کہنے لگے۔ اُن کو دیکھ کے ملازم "لوبے" کہا کرتے تھے۔ آخر تنگ ہو کر صاحب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ شاہزادے سے حرکات خلافِ منزلت شاہی سرزد ہوتے ہیں۔ مبادا ان سے کوئی بیجا امر خلاف ہو جس کی اصلاح بہت دشوار و موجبِ توہین ہو۔ لہٰذا اگر صاحب عالم بہادر چندے بطریقِ تفریح مثلِ حضرتِ علی علمدار کی ملکات شرقیہ میں رہیں غالب ہے کہ اصلاح حال ہو جائے۔ بادشاہ نے پھر نہیں سمجھا یا اُن کی مفارقت بہت شاق تھی چندے تامل فرمایا مگر لاڈلا بیٹا کب سنتا ہے۔ خلاصہ انھیں الفاظ رکیک بیٹے "لوبے" سنتے سنتے یک دن شاہزادہ بہادر نقار خانے پر کھڑے تھے طپنچہ ہاتھ میں تھا دیکھے صاحب رزیڈنٹ باہر نکلتے تھے۔ گولی کنارہ ٹوپی سے ہو کر نکل گئی اسوقت

---

[1] صفحہ ۱۷، جلد اول، مطبوعہ نول کشور کانپور سنہ ۱۹۰۷ء۔ [2] ایضاً صفحات ۱۷۶ تا ۱۷۹۔

صاحب تو وہیں کھڑے ہو گئے توپ منگوا کر سیر دروزۂ نقار خانہ سے دیوان عام تک توپ مارتے چلے گئے بادشاہ نے سب ملازمین کو حکم قطعی فرمایا کہ ہر شخص اپنے مقام پر مثل تصویر کھڑا رہ جائے۔ جس طرح سے صاحب آتے ہیں آنے دو۔ صاحب عالم بہادر کشتی پر سوار ہو پار دریا کے بادشاہ کے پاس جا کر چھپے۔ صاحب رزیڈنٹ تنہا کشتی پر سوار ہو حاضر حضور شاہی ہوئے۔ عرض کی آپ حضرت صاحب عالم کو ہمارے سپرد فرمائیں بادشاہ نے شاہزادے کا ہاتھ انکے ہاتھ میں دیکر فرمایا انھیں تعلیم و تربیت کے واسطے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ صاحب اُنھیں اپنے ساتھ قلعہ کے باہر لیکر چلے گئے۔

اُس دن شاہزادہ باہر شہر کے رہا۔ دو چار دن میں سامان ضروری شاہانہ درست کر کے راہی ملک داری سرکار ہوئے۔ ہزار آدمی کی جمعیت لشکر، اور سامان ہاتھی گھوڑا وغیرہ سب درست ہو گیا ناگاہ خیال میں آیا کہ پہلے لکھنؤ میں وزیر اعظم کے پاس چلیے اور وہاں کا عیش و نشاط دیکھیے جو مشہور آفاق ہے۔ اہل صحبت جو اس طریق کے جمع ہو گئے تھے وہ بھی غنیمت سمجھے۔ کسو سے کہ لکھنؤ پر سب از ہر کھائے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے وقت روانگی کہلا بھیجا تھا کہ اگر لکھنؤ جانے کا اتفاق ہو تو وزیر اعظم کا بہت پاس خاطر رکھنا کیونکہ ہمیشہ سے قرب منزلت اُن کی اس سلطنت میں رہی ہے۔

غرض جناب عالی نے خبر آمد آمد شاہزادہ، عمدہ لکھنؤ کی سنی بہت خوش ہوئے اور مزید عزت و تفاخر سمجھ کر مع جناب رزیڈنٹ کرنل جان بیلی صاحب مرزا سلیمان شکوہ مرزا سکندر شکوہ شاہزادے بڑی دھوم دھام سے تا کر شہر تک استقبال کو گئے اور شہر میں چوک کی بڑی طیاری کی۔ کوچہ و بازار و بام تماشائیوں سے بھر گیا۔ جناب عالی نے یک سو اشرفی نذر گذرانی عرض کی آج حضور کی بدولت منصب آبائی قدیم خواصی نشینی بعد ایک مدت العمر کے پھر حاصل ہو گئی۔ شاہزادے نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو جانب چپ بٹھا لیا برج سعادت میں قران السعدین ظاہر ہوا۔ نظر خاص و عام میں بھی جلوہ افروزی ہوئی۔ شہر میں ایثار زر کرتے ہوئے داخل فرح بخش ہوئے۔ شلک سلامی توپ ہوئی۔ لباس شاہزادہ، انگریزی سر پر لمبی کالی ٹوپی ترکانی ولایتی زیب کمر بڑا جوان حسن سلیمان ہاتھی کے ماتھے پر رہتے اُس کا پیچ شاہزادے کے ہاتھ میں ہر طرف ہجوم عام کو دیکھتے ہوئے بعد چاہ پانی کے کشتیاں نذر کی دیں۔ چار گھوڑے کی گاڑی اُسی پر سوار ہو کر پسند باغ میں داخل ہوئے دو سو روپے کا خاصہ طعام معین ہوا۔ شیخ امام بخش دلیل و الماس علی خاں مرو من صاحب لیاقت مہتمم بجا آوری خدمت مقرر ہوئے۔

دوسرے دن جناب عالی مع صاحب رزیڈنٹ اور مُرشد زادے دگر کے حاضر ہوئے۔ بعد چاے پانی کے سب کی نذریں بمراتب گذریں۔ جب وقتِ خلعت آیا شیخ امام بخش نے وزرا و عظمن مرزا جعفر سے کہا وزیر اعظم کو خلعت معمولی وزارت ہوگا۔ صاحب رزیڈنٹ کے واسطے آپ نے کونسا خلعت تجویز کیا ہے۔ یہ سُن کر لاجواب ہوئے۔ جناب عالی کو پارچہ خلعت ہونے لگا۔ ہر پارچہ پر جنابِ عالی آداب گاہ پر جاکر آداب بجالاتے تھے۔ نذر دیتے تھے۔ افسوس ہے اُس دن تک خاندان طیموریہ کا یہ مرتبہ تھا۔ ظاہر حال سب آدابِ شاہی باقی رہا تھا۔ صاحب رزیڈنٹ کا بھی خطاب اُسی سلطنت سے ملتا تھا عمادالدولہ افضل الملک میجر جان بیلی صاحب بہادر ارسلان جنگ نواب گورنر جنرل بہادر کو بھی خطاب زبان لارڈ مایرا سے سب موقوف ہوگیا۔ غرض جب نوبتِ خلعتِ صاحب رزیڈنٹ پہونچی فقط دو شالہ و رومال کا حکم ہوا۔ جناب عالی نے عرض کیا پانچ پارچہ عنایت فرمائیے۔ صاحب نے ناد انستگی سے چاہا کہ مثل وزیر اعظم میں بھی ہر پارچہ خلعت پر نذر دے کر آداب گاہ پر آداب بجالاؤں۔ خواصِ شاہی نے کہا کہ یہ مخصوص بہ وزیر اعظم کا ہے۔ تمھارا یہ رتبہ نہیں ہے۔ یہ سُنتے ہی کیسا انفعال صاحب کو ہوا اور اپنے آج کے آنے پر بہت شرمندہ ہوئے۔

غرض جناب عالی ہر روز ہر قسم کے برابر تحائف بطیب خاطر بھیجتے تھے اور ہمہ تن معروف تھے اور بدل منظور تھا کہ انکی ایسی خدمت سب طرح سے کیجئے کہ باعث خوشی دلی بادشاہ ہو بلکہ رفع کدورتہاے ماضیہ ہو اور بادشاہ کے بھی متواتر شقے شاہزادے کو آتے تھے کہ خبردار کوئی امر خلاف وزیر نہ کرنا۔ شاہزادۂ عالم پر کب ایسی بات سُنتے تھے۔ اشرف علی خاں[1] ایک شخص ستار خوب بجاتا تھا اُسے جلو وزیر اعظم کیا تھا اُسے جناب عالی کی خبر کو بھیجتے تھے۔ جناب عالی انکی آدھ گھنٹہ گر ٹہلتے تھے۔ یہ سلام علیک ہمسری کہتے تھے۔ بہت ناگوار ہوتا تھا۔ شاہزادے ہر صبح گھوڑے پر سوار گلی کوچوں میں ہوا کھا دوڑاتے جاتے تھے۔ اکثر دوزمین موگل جاتے تھے۔ نخاس میں بھی پکڑ ایک دن گھوڑا بیچنے لگے۔ دسترخوان پر عجیب صحبت ہوتی تھی۔ ایک دن شیخ امام بخش نے استفہام کرکے عرض کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ ارباب نشاط حاضر رہتے تھے۔ غرض شب شب عید و صبح نوروز تھی۔ جناب عالی کو بریدۂ اخبار جب ایسے گزرتے تھے۔ افسوس کہہ کر رہ جاتے تھے۔ قصہ مختصر شاہزادۂ عالم ایک کسبی ستارہ دلتزی جو ناچ میں بہت نامور تھی اُس پر عاشق ہوئے اور اُسے داخل محل کیا۔ اپنے عم نامدار مرزا جوان بخت کا

---

[1] شاہزادے کے سلسلۂ ملازمت کے قطع ہو جانے پر (بعہد غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ) دو دن ولی بیگ مقتوہ شاہی کا مقرب ہو گیا تھا۔ ہلاتہ پیچ اردوں نے ملک خود کو تباہ نازو نیاز اور دفتر سفارت کو غرق شُدہ نابود کر دیا۔ [تاریخ سلاطین اودھ، صفحہ ۲۹۰، جلد اول]

ورثہ پایا[1]۔ جب یہ صورت ہوئی جناب عالی نے بڑے صاحب سے کہلا بھیجا کہ خوار شاہزادے کے شاہجہاں آباد سے بھی یہاں زیادہ ہوتے ہیں۔ ہم پاس آداب شاہی سے مجبور ہیں۔ ایسا نہ ہو انکی کسی حرکت سے جبث جبث مذمت وحجاب بادشاہ سے ہو۔ مناسب ہے کہ اب صاحب عالم بہادر مملکت سرکار میں سیر وسیاحت کریں تو بہتر ہے۔ صاحب رزیڈنٹ پیشتر سے خار کھائے تھے۔ حکم قطعی کہلا بھیجا۔ اُسی دن پردۂ شب میں سوار ہو کر الہ آباد چلے گئے۔ سلطان خسرو کے باغ میں مقیم ہوئے۔ یہاں کوئی خبر بھی نہ ہوا۔ بلکہ سب کو غنیمت ہوا۔ عافیت سب کی تنگ ہو گئی تھی۔ پانچ ہزار روپے ماہوری گورنمنٹ سے خرچ کو ملتے تھے۔ ازبسکہ بادشاہ اور نواب ممتاز محل[2] کی محبت پدری و مادری حد سے زیادہ تھی بہ سفارش صاحب رزیڈنٹ پھر دلی تشریف لیگئے۔ بعد قیام چند روز کے اُس سے زیادہ حرکات خلاف شروع ہوئے۔ آخرش باپ نے لاچار ہو کر پھر صاحب رزیڈنٹ سے کہا کہ ان کے حرکات جنون اُس سے زیادہ بڑھتے جاتے ہیں۔ ہمارے واسطے موجب توہین ہو چکا ہے۔ یہ کچھ متنبہ نہ ہوئے۔ مبادا پھر کوئی ایسی حرکت کریں گے۔ لہٰذا مناسب حال ان کا رہنا تمھاری عملداری میں بہتر ہے۔ بڑے صاحب نے عرض کی کہ سیٹن صاحب کے، اختیار سے صاحب کی مراجعت دلی کو ہوئی مگر اب ہمارے حکم و تجویز سے جائیں کے مراجعت نہ ہو سکے گی۔ اس جہت سے پھر الہ آباد گئے۔ دائم الخمر رہتے تھے۔ آخر اسی بیخودی میں ایک دن ہنستے ہنستے دنیا سے سفر کر گئے۔ جنازہ روانہ دلی ہوا۔ جب داخل شہر ہو جلوس شاہی ساتھ ہوا۔ مذہبی شاہی اور تمام مردم شہر وضیع وشریف ساتھ تھے۔ شہنا نوازوں نے یہ شعر اپنے مضامیر[3] میں شروع کیا ؎

سرو سیمینا تو تنہا میروی ۔۔۔ سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اس پر بیخودی سے سب روتے تھے کہ حسب حال تھا۔ تین دن تک ماں باپ نے کھانا نہ کھایا۔ حجرۂ خلوت سے باہر نہ نکلے۔ آخر بڑے صاحب نے آکر سمجھایا اور کلمات صبر عرض کیئے بدستور پھر دربار ہونے لگا۔

---

[1] مرزا جہاندار شاہ عرف مرزا جواں بخت (صفحہ ۲۲۶ نوٹ ۲) کو زمانۂ قیام لکھنؤ میں ایک آشوب شہر رقاصہ "بھگیا" نام سے تعشق و تعلق ہو گیا تھا۔ نواب آصف الدولہ نے روک ٹوک کرنا چاہی تو شاہزادے نے ازرہ چینگز سے التجا کی کہ "مجھے نواب بھائی سے تم جگیا کو دلا دو"۔ یہ کامیاب ہوئے، وہ محل میں داخل۔ نواب جہان آبادی خطاب ملا۔ شاہزادۂ عالی قدر اسی کے بطن سے تھا۔ سید کمال الدین حیدر نے اس داستان حسن و عشق کو تواریخ اودھ میں مزے لے لے کر لکھا ہے۔ (جلد اول، صفحات ۱۱۰ و ۱۱۱ و ۲۷۹)۔ [3] "مزامیر" ہونا چاہیئے۔ کتابت کی غلطی ہے۔

اعتراف۔ حقیقتِ تاریخ

ان اوراق میں میں نے بارہا تاریخ اور تاریخ لکھنے والوں کا نام لیا اور اکثر جگہ اُن کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں فنِ تاریخ، اُسکی تعریف و تفصیل، سیرت و تذکرہ پر تفصیل یا اس کے بیسوں علمی شعبوں سے اجمالاً بحث چھیڑنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت کا جتا دینا، اسی کے ساتھ اپنے معتقدات سے آگاہ کر دینا مد نظر ہے۔

دنیا جانتی ہے کہ تاریخ کا شریف فن بزرگانِ عرب اور مسلمانوں کا ارث اور اُن کے افتخار و مباہات کا سرجوش چشمہ ہے[۵]۔ سب سے پہلے انھیں نے آفرینشِ عالم، کم از کم رسول مقبول صلعم کی بعثت سے چھ سات ہزار برس پیشتر تک کے واقعات فراہم و یکجا کرکے اُن کی تنقید و تنقیح فرمائی۔ معین اصول پر ترتیب دی۔ تدوین کی۔ جس جس قسم کی تاریخی شہادتیں موجود پائیں اُن کا استقرا و استقصا فرمایا۔ فصیحِ عرب نے تاریخ کے معنی دو جامع و مانع کلموں میں بتائے تھے۔ تَعْرِیْفُ الْوَقْتِ یعنی وقت کی پہچان کرانا۔ ان حضرات نے اپنے علم تاریخ کی بنیاد صدق و راستی پر قائم کی تھی اور اسی سچ کی پابندی کے لئے تاکید کرتے رہے۔ یہی انکے سلفِ صالح اور اکابرِ دین و ملت کا شیوۂ حسنہ تھا۔ خدائے برتر د

---

۵ عروجِ اسلام کے زمانہ میں یورپ کے بادشاہ بھی جو تحائف و ہدایا مسلمان سلاطین کو بھیجا کرتے تھے ان میں انکے علمی ذوق و قدر شناسی کی رعایت سے زیادہ تر علمی نوادر ہوتے تھے۔ ارمانوس Ar-mani-nus شہنشاہ قسطنطنیہ نے ۳۳۷ھ (۹۴۸ء) میں جو بیش بہا چیزیں سلطان عبدالرحمٰن الناصر بن محمد اموی فرمانروائے قرطبہ (اندلس) کو بھیجی تھیں، ان میں منقش و مذہب یونانی کتابوں کے سوا ہروسیس Ha-ro'shath صاحب القصص کی قابلِ قدر تصنیف کا بھی ایک نسخہ تھا جو رومیوں کی ایک عمدہ و نفیس تاریخ تھی۔ جس میں گزشتہ زمانوں کے واقعات، شاہانِ سابق کی نبرد آزمائیاں اور مہمات اور بہت سے عجیب و غریب سبق آموز حالات مندرج تھے۔ (تاریخ خلافت اندلس از نواب ذوالقدر جنگ، صفحہ ۳۵۲، بحوالۂ اخبار الحکماء از قفطی، صفحہ ۱۳۰۔

بزرگ سے اُس کے پاک و برگزیدہ نبی خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْآخِرِیْنَ ۔ [اور پچھلوں میں میرا بول سچا رکھ۔ سورۂ شعراء۔ ع ۵]۔ جھوٹ لکھنے والوں کی نسبت حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ نے توبیخ و سرزنش کی ہے، یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ [کلام کو اُس کے ٹھکانے سے بدلتے ہیں۔ سورۂ مائدہ ع ۳]۔

یہ تسلیم کر لینا ناگزیر ہے کہ علوم اجتماعیہ میں تاریخ کی شان بہت بڑی ہے اُس کو منزلتِ متقل حاصل ہے۔ اس کے بارہ میں خطیبِ رومان شیشرون کا قول عربوں نے اپنی زبان میں یوں نقل کیا ہے۔ شَاهِدُ الْأَزْمِنَةِ وَالْحَقِيقَةِ۔ مَدْرَسَةُ الْحَيَاةِ۔ رَسُوْلُ السَّلَفِ اِلَى الْخَلَفِ

تاریخ زمانوں اور حقیقت کی گواہ ہے، زندگی و حیات کی درسگاہ، پچھلوں کے لئے اگلوں کی پیام رسات

ایک جگہ (صفحہ ۲۳ و بر) عدم ضرورت سے میں نے اپنے عرض مدعا کو طول نہیں دیا، واضح نہیں کیا ہے۔ مبادا کسی صائب الرائے کو اس سے کچھ غلط فہمی پیدا ہو، اور وہ سمجھے کہ میں تذکروں کو تاریخ کے سامنے معیارِ تحقیق و صداقت سے گرا ہوا بتاتا ہوں۔ نہیں، حاشا کہ نہیں۔ لیکن نفس امام یہ ہے کہ میں نے موجودہ تاریخی اخبار کو بھی کبھی اعتماد کی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ نہ ان کے منقولات کو اپنے یا اوروں کے واسطے مایۂ استناد سمجھا ہے۔ بے شبہ تاریخوں نے اقوامِ عالم کے جذبات کو ابھارنے اور ملتوں اور جماعتوں کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ لیکن دانشورانِ فرنگ اور ان کے متبع و خوشہ چین شاگردوں کی لکھی ہوئی تاریخوں نے، خواہ اقوام و ملل و ادیانِ دیگر کے متعلق ہوں خواہ ممالکِ غیر یا ان کی فتوحات اور فیوض و برکات کے بارہ میں، ہم اہل ہند کی اُخوت و حُریت پر بڑا برا اثر ڈالا ہے۔ ان صاحبوں کا مقصد و مطلب تاریخ نہیں ہوتی بلکہ پالسی اور پرچار ہے[۱]۔ اپنے سوا تمام قوموں کے تاریک پہلوؤں کو چمکا کر ان کے مقابلہ میں اپنے تمدن، اپنی معاشرت کو روشن و تابدار بنا کر دکھانا اور اپنا اثر و اقتدار جمانا ان کا مطمحِ نگاہ ہے۔

عام تاریخوں سے بدگمانی، ان میں حق و باطل کی آمیزش اور ان کو مشتبہ سمجھنے کا مجرم و خطا کار اکیلا میں ہی نہیں، بلکہ اس خیال میں بہت سے عالی مرتبت منکرین اور مشاہیر حکماء و فضلاء کو بھی مبتلا

۱؎ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۰ و ۱۱۴ (مع نوٹ ۲) و ۱۲۲ و ۱۳۰ و ۲۲۲ و ۲۳۱ (نوٹ)۔

پاتا ہوں۔ یا یوں کہوں کہ بطا شریک ہیں۔

حاجی خلیفہ (مصطفےٰ بن عبداللہ، کاتب شلبی[1]) نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون[2] میں تیرہ سو تاریخیں مختلف انواع و عنوانات کی گنائی ہیں۔ مگر صاحب نتائج نے ان میں سے صرف پندرہ سولہ کو حسنِ ترتیب، ربطِ معنوی اور صداقتِ واقعی کے اعتبار سے قابلِ اعتبار بتایا ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ تاریخوں کے لکھنے والے بھی انسان ہی ہوتے تھے۔ اور کم مورخ کو ان تاریخوں میں خود اپنے جذبات، حق شناسی و حق گوئی سے زیادہ ملک و قوم کی اُس وقت کی حالت اور سلطنت کے رجحانات اور مصلحتوں کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔

مشہور مصنف و ادیب، ابو اسحٰق صابی[3]، عضد الدولہ تاج الملک کی فرمایش سے اُس کی دولت دیلمیہ[4] کی ضخیم تاریخ "تاجی" لکھ رہا تھا۔ نام ہی سے ظاہر ہے کہ "تاج الملک"[5] سے منسوب ہے۔ اُسکا کوئی دوست آ گیا۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ بولا کہ اَبَاطِیْلُ اُنَمِّقُہَا وَ اَکَاذِیْبُ اُلَفِّقُہَا [لغو و دروغ جسکو قلمبند کر رہا اور جھوٹی باتیں جنکو ترتیب دے رہا ہوں۔] یہی اقرار خطا یا اعلانِ فرماں اس بادشاہ کے مصائب[6] اور جان جانے کا سبب ہوا۔ ایک دوسرے بلند پایہ مورخ نے بعض لڑائیوں کی تاریخ لکھتے وقت

---

[1] متوفی ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء)۔ مدفن قسطنطنیہ [2] اس کتاب کی عظمت و وقعت کی شہادت یہی کافی ہے کہ اورنٹیل ٹرانسلیشن فنڈ نے ۱۸۳۵ء میں اس کو مع اس کے لاطینی ترجمہ کے چھپوانا شروع کیا تھا ۱۸۵۸ء میں یہ کام ختم ہوا۔ پروفیسر فلوگیل FLUEGEL مترجم و مہتمم تھے۔ [3] ابن اسحٰق صابی کا پورا نام ابو الحسن ہلال بن محسن بن ابراہیم حرّانی تھا۔ عضد الدولہ کا کاتب تھا۔ اسی حیثیت سے شہرت زیادہ پائی۔ صابی کہلاتا ہے۔ جو ایک مذہب سے دوسرے مذہب بدلنے والے کو کہتے ہیں۔ آخر عمر میں مسلمان ہوا تھا ۳۵۹ھ (۹۷۰ء) میں پیدا ہوا۔ ۴۴۸ھ (۱۰۵۶ء) میں اس عالم سے رخصت ہوا۔ تاجی کے سوا کتاب الاماثل والاعیان یادگار تصنیف تھی [4] یہ خاندان دیالمہ بھی کہلاتا ہے۔ [illegible] سال قمری فرمانروائی کی۔ دیلم ایک موضع کا نام ہے، جہاں کا علی بن بویہ باشندہ تھا۔ بویہ مورث کا نام تھا ان کو قدیم شاہانِ ایران کی نسل سے ہونے کا دعویٰ تھا۔ خوشامدی مستفین اس پر ایمان رکھتے تھے تاریخ یہ ثابت کرتی تھی کہ بویہ ایک معمولی ماہی گیر دیلمی تھا۔ اس کے تینوں بیٹے علی (عماد الدولہ)، حسن (رکن الدولہ)، احمد (معز الدولہ) نے بڑا عروج پایا۔ بڑے بڑے کام کیے۔ رکن الدولہ کا بیٹا عضد الدولہ تھا، والی فارس و عراق۔ خلیفہ [illegible] الطائع باللہ نے اس کو اپنا وزیر اور امیر الامرا بھی بنا دیا تھا۔ [تاریخ ابو الفداء اول جلد دوم، صفحہ [illegible] مطبع قسطنطنیہ [illegible] مختصری صفحہ [illegible]۔]

[5] ایضاً ابو الفدا صفحہ [illegible]۔

اقبال کیا تھا انھا تفسد التاریخ فلا تبقی من جوھرہ الا اضیلاد کلا رسماً مخیلا [اسی سے
تاریخ خراب ہوتی ہے۔ اس کے جوہروں کا ذرا سا نشان بھی باقی نہیں رہتا اور نہ حیلہ و حوالہ کے لئے کوئی نقش]

ٹامس کارلائل[۱] Thomas Carlyle انگلستان کا مشہور مورخ و اہل قلم
کہتا ہے کہ تاریخیں اتنی ہی مکمل ہوتی ہیں جتنا کہ ان کے مورخ دانشمند ہوں اور ان کو موہبت الٰہی سے
نقد و نظر کی قوت اور روح کی لطافت بھی نصیب ہوئی ہو۔

متکلم و مورخ سر آرتھر ہیلپس[۲] Sir Arthur Helps فرماتا تھا کہ تاریخ
میرے سامنے مت پڑھو میں جانتا ہوں کہ سوائے غلط اور جھوٹ ہونے کے یہ اور کچھ نہیں ہوگی۔

امریکا کے بہت بڑے کاتب و مصنف ہنری تھورو[۳] Henry Thoreau کا قول ہے
کہ میتھالوجی (داستان ہائے باستان) میں زیادہ سچائی پائی جاتی ہے بہ نسبت تاریخ کے۔

جرمن فلسفی و مفکر شاپن ہوار Schopenhauer کی رائے ہے کہ تاریخ عالم
کے لئے اخبارات منٹ بلکہ اکثر دفعہ سکنڈ کی سوئی کا کام دیتے ہیں۔ جس گھڑی کے منٹ ہی درست
نہ ہوں گھنٹے کب ٹھیک ہوں گے۔

ہندوستان کے فلاسفر سنیاسی رام تیرتھ[۴] کا ارشاد ہے کہ تاریخ پر کبھی اعتبار ہی نہ کرنا چاہیے کیونکہ
اس میں صداقت نہیں ہوتی ... سوامی جی کے نزدیک تو اس شخص سے بڑھ کر کوئی مورخ ہی نہیں ہوتا
جس نے محبت میں اپنے اور اپنے دل کو مٹا دیا ہو۔ اللہ رے اخلاص!

سر جارج کاکس نے "ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قائم ہونے کی تاریخ"[۵] اپنے

---

[۱] ولادت ۱۷۹۵ء، وفات ۱۸۸۱ء۔ [۲] ولادت ۱۸۱۳ء، وفات ۱۸۷۵ء۔ [۳] انیسویں صدی میں گزرا ہے۔ آخر عمر میں
گوشہ گزیں ہو گیا تھا۔ دنیا چھوڑ کر جنگل کی راہ لی تھی۔ ویلڈن Walden اس کی تصنیف یادگار ہے۔ [۴] ولادت
۱۸۷۳ء گوجرانوالہ پنجاب۔ وفات ۱۹۰۶ء [۵] History of the Establishment
of British Rule in India by the Revd. Sir George
W. Cox, Bart. London, 1889, Sixth Edition.

اپنے دو صاحبزادوں کی وُسعتِ معلومات و آگاہی کے لئے لکھی تھی جو اسی ملک میں معزز ذمہ دارانہ عہدوں پر مامور تھے۔ فرماتے ہیں کہ "تاریخ نویس کا سب سے پہلا نیز سب سے آخر فرض یہی ہے کہ سچ بولے... [کسی ملک میں کسی حکومت کا تذکرہ کرتے وقت] لازماً حد سے زیادہ ستایش اور حد سے زیادہ شکایت ونکوہش کرنا ہوتی ہے۔ اگر ہم ایماندار ہیں تو ہم کو بُرائی بھی اُسی صفائی کے ساتھ کر دینا چاہئے جیسی کہ تحسین کرتے ہیں۔" (دیباچہ صفحہ ۱)۔ "تاریخ اگر واقعات کی سچی سچی تحریر نہ ہوگی تو لاشئے محض ہے۔ اگر وہ اپنا کام انجام دینا چاہے تو اُس کو ہر ایک طرف کی اچھائی اور بُرائی قلمبند کر دینا واجب ہے۔" (صفحہ ۲۲۰)

بہر حال، میں نے جن کتابوں سے فائدہ اُٹھایا اور ذکر کیا ہے وہ ہمارے ملک اور حلقۂ علم وخبر میں بڑی عزت وعظمت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں۔ تاریخی حیثیت سے اُن کی روایات واقوال پر پورا بھروسا کیا جاتا ہے۔ بعض کے منقولات تو صدیوں سے ہند کے آئین وقوانین کا مدار ومسند علیہ ہو رہے ہیں۔

ان خیالات اور اپنے اعتقادات کو واضح کر دینے کی ضرورت میں نے اس لئے اور بھی سمجھی کہ قلم کا سیلاح اپنے نزدیک تاریخ کا ہفت خواں طے کر چکا ہے۔ بہ حالاتِ موجودہ و بہ اسبابِ ظاہر شاید اُس کو پُرانے قصوں اور داستانوں کے دُہرانے اور اُن کو یاد کرنے کی نوبت اب نہ آئے گی۔

اچھا مقبول! باز گو از باغ واز احوالِ باغ تا کہ از دیوار و در یابی فراغ

پھولوں کی ٹوکری - باقی چیزیں

وہ دوسرے مشتاق سیاحوں کی طرح اب تھوڑا ٹھہر کر ایک ایک چپے اور ایک ایک گوشے کو دیکھ بھال آیا، تھک کر بیٹھ جانا چاہتا ہے۔ کسی پرانے اُستاد کا شعر زبان پر ہے۔

سیر کی، خوب پھرے، پھول چُنے، شاد رہے
باغباں! جاتے ہیں، گلشن ترا آباد رہے

پھر بھی وہ بڑی حسرت و عبرت کے ساتھ دیکھتا ہے کہ قرار و سکون اُس کے نصیبوں میں نہیں۔ اُس نے سمجھا تھا کہ اُس کی آنکھ اور قلم، دونوں اپنا کام پورا کر چکے۔ اب فراغت و راحت میسر ہے۔ لیکن بہ یک نظرِ سرسری باغ کے اندر اور باہر کی کچھ اور یادگاریں اُس کے سامنے آجاتی ہیں۔ دامن چھوڑنا نہیں چاہتیں پیشِ نگاہ باغ کے رُخ پھاٹک کی عمارت ہے۔ اُس کے اندر (جمنوں) کی طرف بھی نشست گاہیں اور سیر گاہیں ہیں۔ ایک اچھی قطع اور نئے ڈھنگ سے گنجائش پیدا کر کے کچھ نہ کچھ اور جگہ بھی رہنے سہنے کے لئے نکال دی گئی ہے۔ بجائے خود بہت سی چیزیں جاذبِ نظر اور دلکش ہیں اور۔ اے جنونِ ہمت کہ منزل اور دو اِک گام ہے۔ لیکن ہمت عذر خواہ نے بڑھ کے جواب دے دیا۔ پھر بھی دو چار متفرق باتیں ایسی ضرور رہی جاتی ہیں جن کا ذکر اسی سلسلہ میں مختصراً و مجملاً ہو جانا مناسب ہے۔

(۱) واٹر ورکس کا کارخانہ، دفتر، تالاب اور ٹنکی وغیرہ باغ کے مشرق و شمال[۱]، دیوار کے متصل ہیں۔ ان کے سلسلہ میں دروازے بھی نئے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ چیزیں نئی ہیں اس لئے اس وقت میرے دائرۂ خدمت تحریر سے خارج ہیں۔ اسی طرح اینٹ کی دیوار، جو اُس طرف کی دیوارِ باغ کو ہٹا کر بازار کی طرف یعنی باغ کے پورب اور دکھن، واٹر ورکس نے اپنی ضرورتوں سے، بالو گودام وغیرہ کے احاطہ کے لئے ۱۹۰۱-۰۲ء میں بنائی تھی ابھی ہے۔ مگر اُس کو شوریت کے خانہ بر انداز اثر نے بوڑھا بنا رکھا ہے۔ وہ باغ کی اصلی، سنگین و عریض دیوار کے مقابلہ میں بہت کمزور اور اپنی پستی و کم چوڑائی کی بدولت

---

[۱] ڈسٹرکٹ گزیٹیر، حال ۱۹۱۱ء، صفحات ۲۰۲ و ۲۶۵۔

انگشت نما ہے۔

(۲) سنہ ۱۸۵۷ء کے آشوب و انقلاب سے پہلے کے معمر و سن رسیدہ حضرات کی چشم دید ہے کہ اس پھاٹک کے سوا بود و باش کے قابل شاہی زمانہ کے مکانات یہاں نہیں تھے۔ اتفاقیہ سیر و تفریح آمد و رفت کی اور بات ہے۔

(۳) موجودہ کوارٹرز (مساکن) حالات اور ضرورتوں سے مجبور ہو کر مالیوں اور شاگرد پیشہ کے لئے بنوائے گئے ہیں۔ بعض شمال و غرب کے گوشہ میں دیوار سے ملحق ہیں اور بعض منتقل، مگر اس انداز سے تیار ہوئے ہیں کہ اس حصۂ باغ کی قدیم آراستگی اور قصر پیشا دار پر ان سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کے سامنے کے بلند درختوں کے گھنے جھنڈوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔

(۴) سپرنٹنڈنٹ باغات یعنی محکمۂ زرعی کا دفتر و سامان خانہ، تمبولی بیگم کے گنبد کے اور سابقہ وشمورے نیا تعمیر ہوا ہے۔

(۵) محافظ آثار قدیمہ کا دفتر پھاٹک کے ایک مغربی کمرہ میں (صفحہ ۹۱) بدستور عزلت گزیں ہے۔ سیاہ تختہ پر سفید حرفوں میں یہ عبارت تحریر ہے Office. Conservation Assistant Archaeological Survey, Muham-madan and British Monuments, Northern Circle. Allahabad. مقابل کی کوٹھری میں نگراں سپاہی رہتے ہیں۔ ان کے سوا بھی نیچے اوپر کئی کمرے اور کوٹھریاں ہیں خالی پڑے ہیں۔ سناٹا چھایا رہتا ہے۔

خامشی میں زندگی کی بو کہیں باقی نہیں ہیں مکاں باقی مگر ان کے مکیں باقی نہیں

(۶) باغ کے اندر اندر دیوار احاطہ کے ساتھ ساتھ پختہ سڑک گھومتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کہیں کہیں بانس اور تاڑ وغیرہ کے آسمان شگاف درخت بھی نظر افروز و سایہ انداز ہو جاتے ہیں۔

(۷) باغ کے پرانے پختہ چاہ لائق ذکر تین ہیں۔ یہ کنوئیں خوب بڑے بڑے اور چوڑے پکے ہیں۔ اس عالم کی تمام فنا پذیریوں اور اس دارِ ناپائدار کی بیوفائیوں اور زود میریوں کے باوجود مضبوط و مستحکم اور دیرپا ہیں

جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے کسی پر کوئی کتبہ نہیں لگا ہے۔ نہ بہ ظاہر سطح زمین پر کوئی سابقہ تعمیر کھلی ہوئی ہے جس سے ان کی قدامت وحالت گزشتہ کا اندازہ ہو سکے۔ قیاسِ غالب یہ ہے کہ آبیاری کے واسطے یہ کنوئیں پہلے تیار کر دئے گئے ہوں گے تب باغ و درخت لگائے گئے ہوں گے۔ (پہلا) یہاں والوں کے حسن آمیز قول کے مطابق واٹر ورک پر منصدق ہو گیا۔ کچھ دن اُس کے کارپردازوں اور خدمت پیشہ جماعت کے مصرف میں رہا تھا۔ بہر کیف اب اس سے شہر اور باغ کی آب رسانی اور باشندگان کی راحت وفیضان کا کام نہیں لیا جاتا ہے۔ اصلی غرض مفقود اور اُس کی نفع رسانی عام معدوم ہے۔ بے شبہ موجودہ عظیم الشان سلسلہ آب رسانی کے قائم ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت بھی چنداں نہ رہی تھی۔ اس میں آہنی زنجیریں اور گراری ہے۔ صفائی کے وقت کبھی اس کے اندر سے پیتل کے نل (پائپ) مخصوص وضع اور مضبوط ساخت کے نکلے تھے۔ (دوسرا) تمبولی بیگم کے گنبد کے قریب "اُترچھم کو" باغ کی غربی دیوار سے متصل ہے۔ زیادہ تر مالیوں محافظانِ باغ اور اُن کے مالی کے تصرف میں رہتا اور "پوروہ والا" کہلاتا ہے۔ (تیسرا) تقریباً وسط میں شاہ بیگم کے مقبرہ کے پیچھے یعنی شمال کو شت بل ہے "خزانہ والا" اس کے دو شہنیا دہانے تھے۔ ایک اوپر کا دہانہ اصلی جہاں سے پانی کھینچا جاتا ہوگا اور اب بھی لیا جاتا ہے۔ دوسرا کنوئیں کے دور یا گھیرے میں۔ اس کی سنگین جگت، پختہ من، اور چرخ وغیرہ بہ تغیر خفیف سب کچھ موجود ہے۔ پورب پچھم دونوں طرف یکساں۔ دونوں جانب کی دیواروں کو بقدرِ ضرورت بلندی دے کر پھر نشیب میں لا کر سیڑھیاں بنا دی ہیں اور مناسب طور پر ڈھالو بنا کر دو، دو نچائی دے کر خشک مٹی سے بھر دیا ہے ان پر بیل چلتے ہوں گے۔ اور شاید اب بھی کبھی کبھی چلتے ہیں۔ بظاہر یہ اضافے یا ان کی ساخت نئی نہیں معلوم ہوتی۔ کنوئیں کا وہ دوسرا (خاص) دروازہ جنوب کو مقبروں کے رُخ لمبی دیوار کے عین وسط میں تھا، سلطان نثار ماتو کے گنبد کے بالکل پیچھے۔ کھلا ہوا، بے کواڑوں کا تھا۔ جو کسٹ باز و پتھر کی تھی۔ اسی (صدر) دروازہ میں ہو کر اندر جانے کے لئے زینہ تھا۔ اور صرف یہی ایک راستہ نیچے جانے کا تھا۔ داخل ہونے پر ایک اوسط درجہ کا چوکور تقریباً تین تین گز لمبائی چوڑائی کا کمرہ ملتا تھا جس کی چاروں طرفوں میں چار کھڑکیاں یا چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ گز ڈیڑھ گز سے زیادہ اونچے نہ رہے ہوں گے۔ اندر اندر قالبوتی یا محراب دار بنے تھے اور کنوئیں کی گولائی میں کھلتے تھے۔

دروازوں کے اوپر روش یا آڑ کے لئے پتھر کے والے کھڑے اور جڑے تھے۔ کواڑ نہیں تھے۔ کنوئیں کی ساخت اور اس کی گہرائی کے وسط سے کچھ اوپر محرابوں کے نشان اور کچھ اور آثار باقی ماندہ اب بھی نظر آتے ہیں۔ جاننے والے بتاتے ہیں کہ یہیں کھڑکیاں یا بغلی دروازے تھے۔ اس جگہ غسل ہوتا تھا یہاں سے پانی تک پہنچ جانا اتنا ہی آسان تھا جتنا یہاں سے بیٹھے بیٹھے پانی کھینچ لینا۔ پانی سے اٹھنے والی ہوائیں اور ابخرے اس کو سرد رکھتے تھے۔ وقت ضرورت یہی خلوت خانہ ہو جاتا تھا اور یہ سب کارخانے اور کھیل تماشے رعایا کی سیر و تفریح کے لئے تیار و مہیا کئے گئے تھے۔ ورنہ قلعہ و محلات و قصور کو چھوڑ کر بیگمات و شہزادیاں یہاں آتی تھیں اور نہ امراء و عمائد کی خواتین کی نشست و برخاست اور چہلیں کبھی یہاں ہونے پاتی تھیں۔ باشندگانِ شہر کے لئے یہ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ انہیں کے سوز و ساز کے رنگین دفتر یہاں کھلتے اور راز و نیاز کی داستانیں چھڑتی تھیں۔ محبت و نشاط اور مہر و وفا کی روح بالیدہ ہوتی تھی۔ گرمی کا موسم یہاں کی لطف اندوزیوں، سرمستیوں اور عیش پرستیوں کے لئے فصلِ بہار تھا۔ جگت سے کچھ نیچے بڑے بڑے پتھروں کے گڑھے ہوئے سوراخ دار دو دو ڈول کنوئیں کے اندر، چاروں طرف برابر برابر لگے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان سے شامیانے نصب کرنے، پردوں کے لگانے اور اور ضرورتوں کا کام لیا جاتا تھا۔ بیس برس ہوئے کنوئیں کا یہ دروازہ یا مدخل باہر سے بند کر دیا گیا۔ دیوار میں ایک چوکھٹ یا دروازہ صاف نمودار ہے جو اینٹوں سے چن دیا گیا ہے اور جس کو دیوار پر لٹکی ہوئی بیلیں نگاہ سے پنہاں رکھتی ہیں۔ پل چلانے یا پانی لینے کے لئے صرف اوپر کا منہ کھلا رکھا ہے۔

یہ کنواں فوارہ والے حوضوں کے واسطے سب سے قریب ہے۔ یہیں سے دونوں حوضوں اور فواروں کے لئے پانی کی بہم رسانی ہوتی تھی۔ اس کی جگت کی اونچائی دیوار کی بلندی کی مناسبت سے رکھی گئی تھی۔ کنوئیں سے دیوار یا پشتہ پر بہتا ہوا پانی حوضوں میں بھی پہنچتا تھا۔ فوارے چھوٹتے تھے۔ حوض اب خشک رہتے ہیں۔ کوئی قدرداں نہیں۔ فوارے اپنی خستہ حالی پر نالاں ہیں۔ کوئی پرساں نہیں۔ یہ سنگین و منقوش تھے۔ ایک بالکل ٹوٹ گیا۔ اس کی جگہ سادہ سا نیا لگا دیا گیا ہے۔ ان مل بے جوڑ۔ یہ کنواں نہ صرف معمولی چاہات بلکہ اپنے جیب و راست کے کنوؤں سے بھی بڑا ہے۔ مسٹر اینڈی کے کھینچے ہوئے

نقشہ میں یہی کنواں اور یہی دیوار دکھائی دیتی ہے۔ حاجت مندوں اور پیاسوں کا ہجوم ہے۔ بیلوں اور اور جانوروں پر پکھالوں، زنبیلوں اور مختلف وضع و طرز کے برتنوں میں، نیز سروں پر لوگ پانی لئے جا رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس پر کوئی کتبہ نہیں اور کہا جاتا ہے کہ جو حصہ بند کر دیا گیا ہے وہاں بھی کوئی پتھر نہیں تھا۔

(۸) مقبروں کے درمیان کے دونوں حوض، جن کا ذکر صفحات ۹۰، ۱۰۰ پر آچکا ہے، اندر اندر مربع ہیں۔ لیکن ان کی سطح بالائی پر، چاروں کونوں پر، پتھروں کے چھوٹے بڑے تختے، بقدر مناسب، سلیقہ سے رکھ کر مثلث بنا دئے گئے ہیں، جس سے ان کی شکل اوپر ہشت پہل نظر آتی ہے۔ ان میں مصنوعی آبشار بھی تھے، پانی کے اخراج کے لئے بدر رو بھی۔ زرد و سرخ پتھر لگا تھا۔ چڑھنے کے لئے پچھم پورب، دونوں طرف، سیڑھیاں ہیں۔

(۹) مقبروں کے شمالی چبوتروں سے ہٹ کر، اینٹ چونے کی پختہ دیوار[1]، شاد بیگم کے روضہ سے سلطان بہار کے گنبد تک شرقاً غرباً چلی گئی ہے۔ مقبرۂ خسرو کے شمالی و غربی گوشے کو مَس کرتے ہوئے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس میں جا بجا آبشار اور جھرنے بنے تھے۔ جھرنے خشک پڑے ہیں۔ بدنمائی دور کرنے کے لئے دیوار پر سدا ہری بیلیں چڑھا دی گئی ہیں۔ خوب پھیلی اور بڑھ گئی ہیں۔ دیرپا اور لطف نظر ثابت ہو رہی ہیں۔ کنوئیں کے اندرونی کمرے کا تعلق اسی دیوار سے تھا۔ اور اسی ضرورت سے نیچے کو ایک دروازہ بھی اس میں رکھا گیا تھا۔ دیوار کا طول پچھتر قدم، عرض ساڑھے تین فٹ اور بلندی گیارہ فٹ ہے۔ دیوار کی بلندی سے ڈیڑھ فٹ نیچے کنوئیں کی سنگین جگت ہے۔ سو دس فٹ کی بلندی پر پہنچ کر دیوار پر تو ایک چوڑی نہر یا نالی رواں کی گئی ہے۔ دیوار کی ساخت میں بھی خوشنمائی اور استحکام کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ دیوار تین حصوں میں منقسم نظر آتی ہے۔ بیچ والا حصہ، جو زیادہ بلند اور بظاہر کچھ زیادہ مضبوط بھی ہے گیارہ فٹ اونچا ہے۔ اسکے دونوں سروں پر گولائی دے کر پشتہ سا بنا دیا ہے، اور اس کے ذریعہ سے نہر کو دوسرے یعنی پست حصۂ دیوار پر اُتار دیا ہے۔ اس کے بعد، دونوں طرف یعنی دائیں بائیں ہاتھ کی دیوار اس کم بلند،
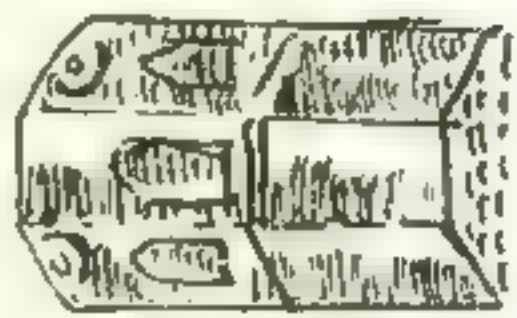
---

[1] تذکرہ صفحہ ۹۰۔

مقبرہ کی جانب کوٹ کا دروازہ
۵۰ قدم
دیوار کے شمالی جانب سے کوٹ
کا اندرونی حصہ
۳ قدم
حوض کا سطحی نقشہ
پانی
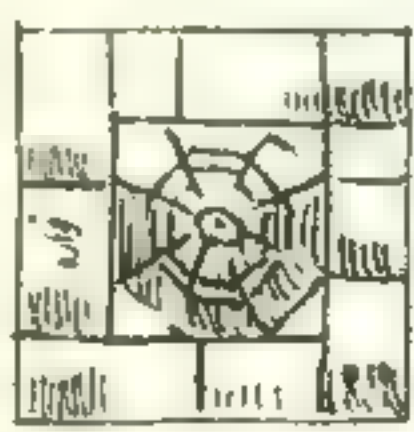
اور اسی مناسبت سے موتی بھی کم ہیں۔ پچھم کو جہاں دیوار ختم ہوتی ہے، یہ نہر دو فرشتہ میں ہو کر پانچ فٹ کی بلندی سے پتھر کے گول خوبصورت دہانہ (پرنالے) کے ذریعے نیچے کو گر جاتی ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا آب گیر (حوض) یا آبدان ہے جس میں اس نالی یا نہر کا لایا ہوا پانی گرتا اور جمع ہوتا تھا اور یہیں سے تقسیم ہو کر ہر طرف پہنچتا تھا۔ دیوار کے آس پاس، ایک دو حوض اور چھوٹے چھوٹے جابجا آب دُزد (زمین دوز) و آب خورد و آب ریز کی ضرورتوں سے بنائے گئے تھے۔ اب تک ہیں سنگی آبشا کا زیریں حصہ جو پتھر کا خوشنما تراشا ہوا ایک بڑا تختہ ہے، سلامی دار نصب کیا گیا ہے۔ اس کے کھلے ہوئے دامن پر اُبھرے ہوئے پھول اور نہرو ماہی کی شکل کے نقش و نگار ہیں، جو دلکشی اور جذبِ نگاہ کے سوا پانی کے منتشر کرنے اور نیچے پہنچانے میں بھی خوب کام دیتے ہوں گے۔ پرانے راجبہاؤں اور نالیوں کا سلسلہ ہنوز قائم و کارآمد ہے۔ جہاں تک تحقیق کر سکا، دیوار کے اندر یا کسی اور جگہ کوئی اور آب رَو یا آب خُور یا سَرداب ایسا نہیں ہے، جو میری آنکھ سے اوجھل رہا اور تلاش سے چھوٹ گیا ہو۔ یہ مختصر، سادہ سا بندوبست، بجائے خود آبیاری و آبپاشی کا نہایت کارآمد، عمدہ اور مکمل طریقہ اور کارخانہ تھا جو اس وسیع رقبہ کے لئے کفایت کرتا اور سارے باغ کو خوب سیراب رکھتا تھا۔

(۱۰) اسی دیوار کے پچھم والے سرے پر ایک چھوٹی سی کوٹھری شاہ بیگم کے مقبرہ کے نزدیک ہے۔ "بُرجیا" کہلاتی ہے۔ دکھن کو چھوڑ کر اندر سے بالکل گول ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ یا سنگی چوکھٹ بازو جنوب رُخ نصب ہے۔ کواڑ اب نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی حمام تھا۔ لیکن اس کے ماننے میں مجھے تامل ہے۔ کسی معمولی مسجد کے غسل خانہ سے زیادہ گنجایش اس میں پائی نہیں جاتی، نہ اُٹھنے بیٹھنے کے لئے کافی جگہ ہے۔ پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کے اندر، نیچے بھی کوئی عمارت تھی یا نہیں۔ اگر تھی تو اُس کا راستہ کہاں اور کدھر سے تھا۔ میرے نزدیک اس حجرہ کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ غریب خدمت پیشہ دھوپ اور بارش میں یہاں پناہ لیتے ہوں گے۔

(۱۱) سلطان بہار بیگم کے گنبد کے اُتر ایک ہشت پہل مُرتفع سنگی چبوترہ ہے اور اچھی حالت

ہیں ہے۔ اس کے چاروں طرف اور تمام دیواروں پر عمدہ و دل پسند کام پتھر پر نقش و نگار کا ہے۔ اندر کا جوف بھی بیکار نہیں چھوڑا گیا بلکہ ایک متوسط گنجائش کے کمرے کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اس کا دروازہ شمال رُویہ، مربع بلا چوکھٹ اور کواڑ کا تنگ نیچا اور مختصر ہے۔ اندر اُترنے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ کمرہ روشن اور ہوادار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افسران و منتظمانِ باغ یہاں بیٹھ کر شاگرد پیشہ مزدوروں اور ملازموں کو تنخواہ، زرِ اُجرت و انعام تقسیم کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قرینِ قیاس نہیں۔ اُمرا و عمائد کے داخلے کے لئے یہ نیچا دروازہ یا چوڑا سوراخ اور مشغول ہونے کے لیے یہ پست چھت قطعاً موزوں نہیں۔ تفریحاً نشست کے واسطے چبوترہ اوپر اچھا بہت کافی اور اچھا ہے۔

قلم کا مسافر خدا خدا کر کے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا۔ اُس کی محنت ٹھکانے لگی۔ اُس نے خسرو باغ کے در و دیوار، گُل و گلزار، خزاں و بہار کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ عہدِ جہانگیری کی رنگ رلیاں اُس کے سامنے ہیں اور سلیم کی وفا پرستیوں کی تصویر پیشِ نظر۔ وہ خسرو باغ کے ایک ذرّہ ذرّہ میں محو ہو رہا اور اُس کی ایک ایک چیز کا خیال کر کے والہانہ انداز سے گنگنا رہا ہے۔

سرایں جا، سجدہ ایں جا، بندگی ایں جا، قرار ایں جا　　بہار ایں جا، قفس ایں جا، مزار ایں جا، نگار ایں جا

نگارِ اولیں، بہارِ آخریں

باغ کا مجوزہ خاکہ یا بعدِ تعمیر و نصب کا کوئی پُرانا نقشہ مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ نہ کسی کا پتہ چلا۔ جس سے اس کی ابتدائی ترتیب و تشکیل اور بعد تنظیم کے اضافوں اور اصلاحوں کا اندازہ ہو سکتا۔ ضلع کے محافظ خانۂ مال میں قلعۂ الٰہ آباد کا ایک نقشہ شاہی عہد کا محفوظ ہے جس کے ساتھ کچھ تفصیلات وحساباتِ تعمیر بھی منسلک ہیں مگر ان سے خسرو باغ کے معاملات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔

سب سے پُرانی چیز جو میری نظر سے گزری وہ رانی (شاہ بیگم) کے روضے اور اُس کے حوالی کا نقشہ ہے جو ۱۷۹۵ء میں یا اُس کے قریب مشہور صنّاع و دست کار ٹامس ڈانیال نے کھینچا تھا اور جس کی پرانے طرز سے چھاپی اور رنگ دی ہوئی نقلیں اب بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔ میں نے اس کو قیصر باغ لکھنؤ کی امیر الدولہ پبلک لائبریری میں دیکھا تھا (صفحات ۱۰، نوٹ ۴، ۵، ۶، ۱۴۰) موجودہ خسرو باغ کا اس نقشہ سے مقابلہ کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ اس لئے کہ نہ وہ کمیاب چیز قیصر باغ سے خسرو باغ پہنچ سکتی ہے، نہ خسرو باغ کا کوئی حصہ قیصر باغ تک منتقل کر سکتا ہوں۔ میرے امکان و قوت سے دونوں باہر ہیں۔

اس لئے باغ کی گزشتہ و موجودہ حالت کے موازنہ کے لئے آپ کو زیادہ تر قرائن و قیاسات سے کام لینا ہو گا۔ ساتھ ہی ایک انصاف کوش ناظر و ناقد کی حیثیت سے یہ دو باتیں پہلے ہی دیکھ لینا ہوں گی:-

(۱) باغ کی نگہداشت و پرداخت کیسی کی جاتی ہے۔ حکومت کے چشمۂ فیض و چشمِ کرم کی کیا کیفیت ہے؟

(۲) کسی ایسے پُرانے باغ کا بحالہٖ و اصلہٖ اَب تک قائم رہنا کہاں تک ممکن تھا؟ جدید ترتیبات، گلشن آرائی و چمن پیرائی سے اس کے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟ گزشتہ چار سو برس میں رائج الوقت اصلاحات و تنظیمات کا کیا اثر پڑا ہو گا؟

ایک غیر ذمہ دار تبدیل انکار شخص نے نئے مال جبات سے بے تکلف کہہ ڈالنا آسان ہے کہ باغ کی وہ صورت وہیئت نہیں رہی جو مجوزین اور کاریگروں کے ذہن وخیال میں تھی۔ تاڑوں کی افراط اور جا بجا موجودگی کے سوا قدامت و کہن سالی کی باتیں اور پرانی چیزیں یہاں کیا رکھی ہیں؟ منتظمان حال نے بالفاظ شائستہ خود ہی تسلیم فرمایا ہے کہ نو دس برس پہلے جو بعض ٹکڑے مغربی طرز پر ڈھلے اور رنگے ہوئے تھے، جن کی ایک بڑی حد تک درستی کر دی گئی ہے۔ بیگانہ وضع کی دراندازیاں دور کر دی گئی ہیں (صفحہ ۔ ۷)۔ بایں ہمہ پہلی ہی غلط انداز نگاہ سے روشن ہو جاتا ہے کہ اس مرغزار کی متدعویہ اصلاح یافتہ ترتیب وحالت بھی اس کے بانیوں کی اصلی تجویز ومقصود کی آئینہ دار نہیں مانی جاسکتی۔ شاید اس کی مکمل بازگشت ورجعت کے لئے کئی قرن درکار ہوں گے۔

مانا کہ وہ گنجان وتناور درخت اور گھنی گھنی جھاڑیاں اور کنج اب اس وسیع رقبہ پر ہر جگہ پھیلے ہوئے نظر نہیں آتے، جو مغلوں اور وسط ایشیا کے اُمرا کے قدیم باغوں کی رونق ودلکشی کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے اور جن کے یہاں بھی بکثرت موجود ہونے کی توقع کی جاتی ہوگی۔ لیکن کیا پھاٹک سے مقبروں تک کے فراخ راستہ پر رو رویہ پُرانے پُرانے درختوں کی قطاریں ہم کو بھلی نہیں معلوم ہوتیں؟ کیا مقبرۂ خسرو کے تین جانب (یعنی پچھم چھوڑ کر) اس کے بسیط وعریض سنگین چبوترہ کے گردا گرد املیوں کے جھنڈ ہم کو مبہوت نہیں بنا دیتے۔ کیا اور مقبروں، روضوں اور مرفہ الحال خاندانوں کے گورستانوں کی طرح مولسری کے درخت اس جگہ پائے نہیں جاتے، جن کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور گھنی گھنی چھاؤں کوئی کشش ودلربائی نہیں رکھتی؟ کیا مقبروں کے پاس سے دیکھنے پر ہر جانب، خصوصاً دیوار باغ کے برابر شاندار چھتنار پیڑوں کا سلسلہ ہماری آنکھوں اور دلوں کو نہیں کھینچتا؟ کیا لہلہاتے ہوئے سبزے اور تروتازہ گھانس کے ہموار لمبے چوڑے پارک نما قطعے خوش نما و نظر فریب نہیں کہے جاسکتے؟ قدیم چمنوں اور خیابانوں کا نشان اگر کوئی ٹھیک نہیں پاسکتا، تو کس کا قصور ہے؟ گردش لیل ونہار کا اقتضا یہی ہے۔ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ دنیا کے حافظہ کا خزانہ کسی بہت کی مثالوں سے مالا مال ہے۔ اتنی دور کیوں جائیں، جیتا جاگتا تاج محل کے ایسے نادر روزگار

دعجوبۂ عالم روضے کے پُرانے پُرانے درخت جو بجائے خود ایک ایک تاریخ کے حامل اور اہم واقعات کے مستقل یاد دلانے والے تھے، ایک سبک مغز کوتاہ اندیش حاکم نے کٹوا ڈالے[1]۔ ان کی خالی جگہ تو پُر کر دی گئی ہے، مگر ان صنادیدِ کہن کے وَداعِ دائمی اور تاریخی یادگاروں کے نابود ہو جانے کا قلق وتاسف کس کو سوہانِ روح نہ رہے گا؟

دل کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہے زبانِ نیرنگ ساری دنیا کے ہیں قصے بھرے افسانے میں

خوش نصیب ہیں آپ اور خوش قسمت ہے آپ کا باغ، کہ ایسی گردشوں اور تباہ کاریوں سے مأمون ومحفوظ رہا ہے۔

یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ شاہ عالم ثانی کے قیامِ الہ آباد اور برائے نام عہدِ سلطنت اور انگریزوں کے تسلط سے پیشتر باغ کی کوئی تقسیم اور آرکیالوجیکل اور ایگریکلچرل ٹکڑوں کی تفریق نہ رہی ہو گی۔

تو فتنۂ زمانہ شدی، ورنہ روزگار بود است پیش ازیں قدرے آرمیدہ تر

لیکن مقبروں اور اُن کے حوالی ومتعلقات کی بدیہی حالت دیکھ کر کون حق شناس وحق گو اس سے انکار کرے گا کہ ان کی حالت میں حسبِ اقتضائے زمانہ کوئی شاندار رونق افزا تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

اُن کا احسان ہے اور ہم پر شکر لازم، کہ عاملانِ حکومت کی توجہ واہتمام سے عمارت وغیرہ کی قرار واقعی حفاظت ونگرانی اور صفائی بوقتِ ضرورت مرمت بھی، ہوتی رہتی ہے۔ ان کے آس پاس حال میں بعض سروت وثمر آور اقسام کے درخت بھی لگا دیئے گئے ہیں۔ وہ قدرتی دلکشی اور مرکزی خوشنمائی جو بابر کے اخلاف کی یادگاروں اور تیموری تاجداروں کے باغات کا طرۂ امتیاز ووجہ نمود بتائی جاتی ہے، اگر اب بھی مفقود اور کسی حد تک نیست ونابود ہو، عظیم الجثہ پھل دار درختوں کے ساتھ ساتھ شمشاد وصنوبر انار وسنگترہ کے پیڑوں، گل وریاحین، لالہ ونرگس کا امتزاج واختلاط جو دوسری جگہوں پر اتنا اثر انداز، کارگر اور کیف افزا معلوم ہوتا ہے، یہاں پورے طور پر قائم یا کہیں پیدا ہی نہیں ہوا ہو تو اس کے لئے کچھ روز اور صبر وانتظار کی ضرورت ہے۔ آپ کے توقعات یقیناً کامیاب اور بار آور ہوں گے۔ انگریزی مثل ہے۔ Everything comes to him who waits.

---

[1] سیر الآثار صفحہ ۷۰۔

رہا دوسرا جزو زرعی۔ مانا کہ اس تُرُوج پرور قطعۂ خاک میں اس کے اصلی خاکے کے کچھ نقش و نگار مٹ گئے ہیں، یا یوں کہئے کہ ان کو خاطر خواہ بدل کر اپنی مصلحت دید یا مغربی ذوق کے موافق یا نفع خیز کاروباری شکلوں میں تغیر دے دیا ہے۔ کچھ نظر فریب پھلواریاں اور فرح بخش چیزیں فراہم، یا تجارتی اصولوں پر پودگاہیں قائم کر دی گئی ہیں، تو اس کے لئے علامۂ قبلہ سید سلیمان ندوی کا ایک فقرہ مجھے بے اختیار یاد آجاتا ہے جو رسالۂ نقاد کے تبصرہ میں فرمایا تھا۔ "یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ اس قسم کی ادبیات سے ہم کو علمی و دماغی فائدہ نہیں پہنچتا کہ اس باغِ ہستی کی ہر چیز کھانے کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ کچھ دیکھنے اور سونگھنے کے لئے بھی ہے۔" [1]

ان جزئیات و خفیف تغیرات سے قطع نظر فرمائیے گا تو باغ کے یہ چاروں حسین روضے جو ایک لائن، ایک محاذ میں، ایک دوسرے سے مناسب فصل و دوری پر واقع ہیں، بجائے خود قابلِ دید، جاذب نگاہ اور شاندار نظر آئیں گے۔ آپ ان چار گلدستوں میں اہلِ ہند کے فردوسِ فراغ و سکون کے چار شگفتہ پھول نُستاں افروز پائیں گے، یا گو، گانیوں کے سحرکارانہ سلسلۂ تعمیرات اور اُن کے کمالاتِ رنگ و جمال کے جادو طلسم جلوہ افزا دیکھیں گے یہی نہیں، جب اس مقام سے آپ اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالیں گے تو سارا باغ اپنے سرسبز و عالی شان حاشیوں اور ہرے بھرے دامنوں، دلکش لانوں کے ساتھ پوری رعنائیاں لئے ہوئے آپ کی آنکھوں میں کھِنچ کر آجائے گا اور آپ اُس وقت محسوس فرمائیں گے کہ اس پیکرِ لطیف میں وہ سب خوبیاں اور زیبائیاں مجتمع ہیں جن کا آپ کا ذوقِ سلیم مشتاق و متمنی تھا، نہیں۔ خسرو باغ میں، ایک علاوہ بھی آپ کو وہ بہت سی باتیں موجود ملیں گی جو ہمارے ملک کے بہت سے باغات اور نزہت گاہوں میں عموماً ملحوظ نہیں رکھی جاتیں۔ میرے نزدیک اگر کچھ کمی ہے اور فرق و امتیاز تو اسی قدر کہ اکبری و جہانگیری عہد کی بعض تفریح گاہوں کی طرح اس میں سنگ مرمر کی نہریں اور حوض نہیں بنائے گئے تھے، نہ کوئی شاہانہ کوشک یا بارہ دری تعمیر ہوئی تھی۔ میں کہوں گا کہ سنگ مرمر کی کھپت اور زیادہ استعمال تو نفاست پسند شاہجہاں کے دل و دماغ کی ایجاد اور اُس کی نازک خیالی کا کارنامہ تھا۔ حقیقتاً اس کا پورا رواج اس باغ کے

---

[1] رسالۂ معارف، مئی ۱۹۱۹ء صفحہ ۵۱۰۔

پچاس ساٹھ برس بعد ہوا ہے۔

صاحبِ مفتاح التواریخ نے اس کو "باغِ بادشاہی" کے نام سے یاد کیا ہے۔[1] ممکن ہے کہ سو برس سے پہلے یہ باغ اسی نام سے یا زیادہ تر اسی نام سے مشہور و معروف رہا ہو۔ لیکن وہی ممتاز مورخ کچھ دن بعد اپنے انگریزی تذکرۂ مشاہیر شرق میں اس کو ہر جگہ "باغِ سلطان خسرو" لکھنے لگا تھا۔[2] آجکل تو عوام الناس میں "بڑی باغ" کے نام سے شہرت رکھتا اور خلد آباد کی منڈی اور تر و تازہ میووں اور موسمی پھلوں کی جائے فروخت کے قرب کی وجہ سے زیادہ تر اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

ایک عطائی یا ناماہرِ فن کہہ سکتا ہے کہ بادی الرائے میں باغ کے لئے اس سے زیادہ موزوں اور اچھی جگہ قلعہ کے قریب اور دریا کے کنارے ہو سکتی تھی۔ جہاں محلات و قصور کے غرفوں اور دریچوں اور بادشاہی ایوانات کے برجوں اور کنگروں سے صانعِ قدرت کی جاندار بے جان مخلوق صبح کے طلوع اور شام کی شفق کی رنگا رنگ تجلیوں اور نظاروں سے متمتع ہوتی۔ باغ کے سرسبز و سدابہار اشجار دھوپ گرمی اور روشنی سے فائدہ اٹھاتے اپنے پتوں پر سونے کے ورق چڑھاتے تابشِ مہر و ماہ سے حیاتِ تازہ حاصل کیا کرتے۔

غالباً یہ باغ کسی ویران غیر مسطح رقبہ پر آباد کیا گیا تھا۔ اسی لئے یہاں کوئی قدرتی مناظر یا چشم فریب تماشاگاہیں پائی نہیں جاتیں۔ بنیاد پہلے ہی پڑ چکی تھی کہ شاہ بیگم کی اچانک موت اور بہ عجلت تدفین اس غیر آباد وسیع قطعۂ زمین کی عزت افزائی و سربلندی کا باعث ہوئی' جو نو آباد شہر کے سواد میں ہونے کے سوا اس وقت بھی کوئی سامان و اسباب دلکشی اپنے اندر نہ رکھتا ہوگا۔ اور پھر مقبرہ کے اطراف اور متصلہ رقبہ کو شاداب بنانا' پُر لطف و بارونق رکھنا لابد ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رعایا کی سہولت' باشندگانِ شہر کی آسائش و تفریح کے خیال سے قربِ شہر کی اس اراضی کو ترجیح دی گئی ہو۔ کوئی اور معقول وجہ میری ناقص فہم اور رسائی ذہن سے باہر ہے۔

سلام: اے خسرو باغ سلام! ـــــ اے گلگشت آخریں سلام!!! اور رخصت
بہارِ لالہ و گل پھر کبھی کاہے کو دیکھیں گے ـــ چلے ہیں اس چمن سے ہم نگاہِ واپسیں ہو کر

---

[1] صفحہ ۲۸۸ طبع دوم ۱۸۸۳ء آگرہ [2] ادیشن بیگرافیکل ڈکشنری' صفحات ۲۲۲ و ۲۲۳۔

حوالیِ باغ

خدا کا شکر ہے کہ "خسرو باغ" اور اس کے مسانید و تفصیلات سے فراغت ہوگئی۔ لیکن باغ کے قریب باہر بھی بعض چیزیں پرانی اور اسی کے ساتھ کی پائی یا بتائی جاتی ہیں، جو قابلِ التفات ہیں اور جن کا تذکرہ ان اوراق پر ضروری ہے۔

نقوشِ عبرت ۔ مسجدیں

شاہِ عالم ثانی کا قیام الہ آباد میں سالہا سال رہا تھا۔[1] اس کے منصب داروں اور مقربانِ دولت نے اطرافِ بلدہ کے مختلف حصوں، نیز شہر کے چند محلوں میں یادگاریں چھوڑی تھیں۔ بعض کا ذکر مسٹر بیل نے مفتاح التواریخ میں کیا ہے۔ "مسجدِ الہ آباد" کے زیرِ عنوان ایک مسجد کی نسبت تحریر فرماتے ہیں کہ باغِ بادشاہی (خسرو باغ سے مراد ہے) کے قریب حسام الدین علی خاں[2] نے سنہ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں تعمیر کرائی تھی۔

---

[1] منتخب تیج الاخبار، مطبوعہ ۱۸۷۶ء صفحہ ۱۰۵۔ گلستانِ ہند، دفتر دوم، صفحہ ۲۲۰۔ مفتاح التواریخ مطبوعہ ۱۸۸۳ء صفحات ۵۲۲ و ۵۲۹۔ بیلس ڈکشنری، صفحہ ۲۲۲۔ سفرنامہ جنرل گاڈفرے منڈی، صفحہ ۲۵۲۔ شاہ عالم کی سکونت ۱۷۷۱ء تک الہ آباد میں رہی۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹیر، مطبوعہ ۱۹۱۱ء، صفحہ ۱۲۷۔)

[2] نسلاً ایرانی تھا۔ یہ اور اس کا چھوٹا بھائی وجیہ الدین خاں دونوں سخن فہم اور شعراء کے قدر شناس و سرپرست تھے۔ اس کے پانچ بیٹوں میں سے دو نامور و باکمال شاعر گزرے ہیں۔ (۱) محمد علی خاں تسکین مؤلف تذکرۃ الاحیاء الاشعر۔ یہ بھی بادشاہی منصب داروں کے زمرہ میں داخل تھا۔ (۲) مرزا قلندر، جو کبھی کبھی قیصر بھی تخلص کرتا تھا۔ ایک لاکھ شعر یادگار چھوڑے تھے۔ میر غلام حسین خاں طباطبائی، صاحب سیر المتاخرین، حسام الدین کا ایک ہمعصر مورخ تھا۔ وہ اس کو برے الفاظ میں یاد فرماتا اور سفلہ چشم ملازمینِ شاہی میں شمار کرتا ہے۔ لکھتا ہے کہ پری پیکرانِ نودمیدہ کو راگ و رقص کی تعلیم دلا کر حضور میں پہنچاتا اور منفعتِ کثیر حاصل کرتا تھا۔ اسی سلسلہ سے معتمدِ سلطنت بن گیا تھا۔ شاہ عالم اس کا بے حد مطیع تھا۔ (ترجمہ اردو، جلد سوم، صفحات ۲۰ و ۳۰ و ۸۹)۔

اس کے دروازے پر قطعۂ تاریخ منقوش ہے۔

در زمانِ شاہ عالم خسروِ روئے زمیں[1] | خلق پرور داد گستر حامیِ دینِ کرام

صاحبِ عدل و سخا و بادشاہ ذو الکرام | مستفیض از جودِ او ہستند جملہ خاص و عام

تا کہ مہر و ماہ باشد رونق افزائے سپہر | زیرِ حکمش ہفت کشور باد نصرت مستدام

چوں حسام الدین علی خاں خانہ زادِ بارگاہ | ساختہ تعمیرِ ایں مسجد بآئینِ نظام

سالِ تاریخش سروش آورد از عرشِ بریں | کعبۂ دیں سجدہ گاہِ مسلمیں بیت الحرام[1]

۱۱۸۱ھ

میری رسائیِ خیال نے رہبری کی کہ اس کی تعمیر باغ کی آبادی سے پونے دو سو برس بعد ہوئی تھی، وہ بھی ایک مفلوک[2] بادشاہ کے ایک متوسل یا نام لیوا کے ہاتھ سے۔ شاید اس لئے باغ کے

[1] منتخب التواریخ، صفحہ ۲۲۹۔ [2] ایضاً صفحہ ۵۲۵۔ نیز مقبول بیگ خاں کا سفار ملاحظہ ہو، رسالۂ معارف، نمبر ۲، جلد ۱۶، صفحات ۱۵۱ تا ۱۵۷، ۱۹۲۵ء۔

مانٹیر رے مان (حاجی مصطفیٰ) اپنے ترجمۂ انگریزی سیر المتاخرین (جلد دوم) کے ایک نوٹ میں لکھتے ہیں "لارڈ کلایو جب صوبجاتِ بنگال و بہار و اڑیسہ کی سند بادشاہ سے لے کر آئے تھے تو خود الہ آباد میں اپنی جانب سے کرنیل (جنرل) اسمتھ کو دربارِ بادشاہی میں ایجنٹ مقرر کر گئے تھے۔ ان کا کام صرف بادشاہ کے قریب رہنے کا تھا۔ مگر کرنیل مذکور عملی طور پر بادشاہ کے آقا بن گئے۔ اپنی قوت و زور کے بھروسے پر قلعہ کے محلات شاہی میں سکونت اختیار کی۔ بادشاہ کو باہر رہنا پڑا۔ جہاں، جہاں پناہ نے اپنی خست و بیکسی کے چھپانے کو مگر بظاہر تفریحِ خاطر کی خاطر سنگ و خشت سے سر مارنا اختیار کیا تھا۔ یا بالفاظ دیگر سلسلۂ تعمیرات شروع کر دیا تھا۔ غریب کو پھر بھی نجات نہ ملی۔ ایک نئی ذلت اٹھانا پڑی۔ ایک مرتبہ کرنیل صاحب نے نوبت خانۂ شاہی کے شور و غل سے ناخوش ہو کر نیز قلعہ کے دروازوں پر جو آلاتِ جنگ و نقارہ وغیرہ لگے رہتے تھے ان کی جھنکار سے برافروختہ ہو کر سب کے بند کر دینے کا حکم دے دیا اور بجانے کی ممانعت کر دی۔ جس سے بہت سے افراد سلسلۂ رزق اور اداے خدمات سے محروم ہو گئے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، چاہے انگریز اس کو کچھ ہی سمجھیں۔ باجوں کا بجانا جن میں متعدد چیزیں ہوتی ہیں اور تین یا چار بار دن میں اور ایک مرتبہ رات میں بجائی جاتی ہیں، شاہانہ شان و شوکت، جبروت و جلالت کی علامت و نمائش اور فرمانروائی و حکمرانی کی دلیل ہوتی ہے۔"

اندر اس مسجد کے بنانے کی اجازت نہ ملی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کرنیل اسمتھ مانع آئے ہوں جو اُس وقت انگریزوں کی طرف سے دربار میں ایجنٹ کے طور پر مامور تھے اور شاہ عالم کی ذات و حرکات و سکنات کے نگراں اور مکانات و عمارات شہنشاہی (قلعہ وغیرہ) پر متصرف و دخیل اور ہر حیثیت سے مختارِ مطلق ہو رہے تھے۔ جن کی دراز دستی کے بہت سے واقعات تاریخ الہ آباد کے صفحات پر مذکور ہیں۔ [1] بہر کیف محافظان باغ اور یہاں کے فوجی و لشکری طبقے کے نمازیوں کی عبادت گاہ تو یہی رہی ہوگی۔ اہل بازار بھی یہیں آکر بارگاہ خداوندی میں سر جھکاتے ہوں گے۔

مجھ سوداز دہ شوریدہ سر کو اس مسجد کی تلاش میں بے اندازہ زحمت و تردد سے سابقہ پڑا پھر بھی ناکام رہا۔ خسرو باغ کے پچھم کی کوئی پرانی یا نئی مسجد دور دور تک ایسی نہ تھی جس پر نظر نہ ڈالی ہو۔ نہ کوئی ٹوٹا پھوٹا یا ثابت مقبرہ ایسا چھوڑا جس کے اطراف و گردونواح میں اس کی جستجو نہ کی ہو۔ اگر کہیں کوئی دل خوش کن تبدیلی دیکھی بھی تو اُس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ جواہر پاروں کی جگہ خزف ریزوں نے حاصل کر لی ہے۔ جس کو میں تو تضییعِ مال و تنقیصِ حال سے تعبیر کروں گا۔

جاننے والوں نے اس کا موقع خسرو باغ کے پھاٹک کے باہر مگر اس کے نہایت قریب یعنی صحنِ پیش دروازے کے مغربی بازو کا جنوبی گوشہ تجویز کیا تھا۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب

---

[1] منشی نول کشور پرشاد لکھنوی اسی کتاب کے ترجمۂ اردو (جلد دوم) صفحہ ۲۶۰) میں تحریر کرتے ہیں کہ "جب لارڈ کلایو تا ت جنگ ساورنے بنے دارالحکومت کلکتہ کو معاودت کی وہ کرنیل اسمتھ کو جو بعد جانے لارڈ موصوف کے ولایت میں جنرل ہو گئے تھے انگلشی فوج کا سردار بنا کر بادشاہ کے حضور میں الہ آباد میں چھوڑا۔ لیکن فی الحقیقت وہ حاکم تھے اور بادشاہ محکوم وہ قلعہ میں رہتے تھے اور حضرت بیرون چھاؤنی میں جو خود تعمیر کرائی تھی۔ جنرل نقارہ نوبت بادشاہی کی دھوں دھول سے جو قلعہ میں تھا ناخوش ہوئے۔ نوبت نوازوں کو ممانعت ہوئی۔ سچ ہے ہر کرا پنج روز نوبتِ اوست"

جنرل موصوف کی سخت گیری کی نسبت مسٹر بیل فرماتے ہیں "جنرل صاحب خود قلعہ میں رہتے تھے اور بادشاہ سلامت بستی میں۔ شاہی نوبت خانہ کی آواز صاحب کو ناپسند و ناگوار تھی۔ اس لئے بجانے سے روک دیا تھا۔ ملازمانِ شاہی کو سرتابی کی کیا مجال ہو سکتی تھی" (اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری، صفحہ ۲۴۴)۔

میں نے اُس جگہ ایک نئی وضع قطع کی خوشنما مسجد، ایک حوصلہ مند مخیر تاجر کی (۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ع کی) بنائی ہوئی دیکھی۔ پہلے اس کو فریبِ نظر سمجھا پھر فلسفۂ تناسخ کا ردِّ عمل قرار دیا۔ اہل وقوف و خبرت نے یہ راز روشن بتایا کہ کسی وقت اس جگہ پر یکے بعد دیگرے تین مسجدیں رہی ہیں۔ ایک قناتی شکستہ و ریزہ و اس۔ دوسری قدرے کہن سال مگر کار آمد۔ جس کے کھمبے پتھر کے تھے۔ گنجائش کافی تھی۔ جس میں نمازِ جمعہ و جماعت ہوتی تھی۔ پُرانی شاہی زمانہ کی مشہور تھی۔ ایک اتفاقی حادثہ یا درخت کے گرنے سے شہید ہو گئی۔ بہ گمان غالب یہی حسام الدین علی خاں کی رہی ہو گی۔ تیسری کے آثار کئی گز گہرائی پر مع سنگی ستون اور پتھر کے تختوں اور ایک زیر زمین قبر کے اُس وقت برآمد ہوئے جب اس نئی مسجد کی بنیاد کھد رہی تھی۔ ان مساجد میں سے اب ایک کا بھی نشان باقی نہیں۔ سب پیوند خاک ہو چکیں۔ فَکَمْ مِنْ غَائِبٍ تَحْتَ التُّرَابِ انھیں کی جگہ موجودہ مسجد ایک بڑے پیمانہ اور وسیع تر رقبہ پر تعمیر ہوئی ہے۔

میں نے اس پُر تکلف و آراستہ و رنگین جدید مسجد کو کمال غور و توجہ سے دیکھا اور اس کے تمام قطعات، تاریخوں، ہدایتوں اور تحریروں پر نگاہ ڈالی، جو ہر ہر قدم پر عنا گیر نظر ہوتے ہیں اور اوپر سے نیچے تک دیواروں کی زیب و زینت ہو رہے ہیں۔ مجھے تاسف ہوا کہ ان کا ایک حرف بھی یہاں کبھی مسجد ہونے کے متعلق، یا بانیان سابق کی یاد دلانے والا اور اُن کا نام و نشان بتانے والا نہ نکلا، جنکو اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ[1] ہونے کا شرف و فضل حاصل تھا۔

یَا لَلْعَجَب۔ نئی مسجد کے تہ خانہ میں ایک سادہ سُرخ رنگ کا پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس تختہ پر اُبھرے ہوئے حرفوں میں، تین سطروں میں مع جدول یہ منقوش ہے۔

(سطر اول) اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (دوم) مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ ہجری ۴۲۷

(سوم) این مسجد ولقرسہ سردار خان لودھے تخذ سار ـــــ

آخری سطر مسماری نما (با صول میخی) رسم الخط میں (سیدھے سیدھے کھڑے کھڑے، اور کہیں کہیں بڑے بڑے حرفوں میں لکھی ہے، جس کے صرف چند لفظ بلا کسی دشواری کے پڑھے جاتے ہیں۔ اس جگہ یہ

---

[1] قرآن مجید، سورۂ توبہ، ع ۳۔

اعترافِ حقیقت سے قطعاً گریز نہ ہوگا کہ میری اور مجھ بے کمال کے بہت سے باکمال اور اہلِ بصیرت بزرگوں
اور اساتذہ کی چند در چند کوششیں اور دقیق مساعی اس معمے کے حل کرنے میں یک لخت ناکام رہی ہیں۔

اس پرانی مسجد اور برآمد شدہ قبر کے گزشتہ حالات مرقوم نہیں، معلوم نہیں۔ زبانی روایتیں تمام تر مختلف
و متبائن ہیں، اس لئے ان پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ نہ سیاقِ عبارت کو فہم و قیاس کی مدد سے درست کرنا چاہتا ہوں۔
مجبوراً "نقل را چہ عقل" سے کام لیا گیا ہے۔ خدا کرے کہ آئندہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

خطِ نسخ اچھا خاصا اور کسی حد تک باقاعدہ اور صاف ہے۔ تاہم خوش قلم محرر کی سرنوشتِ تقدیر نے حروف
اور اعراب کی پیہم غلطیوں کو نہ صرف اپنے دامن میں پناہ دی بلکہ نمودار کر رکھا ہے۔

کچھ بہت دن کی بات نہ تھی جو کوئی شخص یہ نہ بتا سکتا کہ یہ لوحِ تاریخ کب اور کہاں نکلی تھی۔ ثقہ و عادل،
معزز و مقدس ہستیاں شاہد ہیں کہ یہ بچا کھچا پتھر اسی زیرِ زمین مسجد کا تھا جو مدفون تبرکات اور منتشر متروکات
کے ساتھ دستیاب ہوا تھا۔ اسی [illegible] قدیم یادگار کے طور پر محفوظ و مخزون رکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ
تھوڑے ہی زمانہ بعد، قبل از وقت، اس سردار خانی مسجد کو کسی آفتِ ارضی یا سماوی نے رخصت کر دیا ہوگا،
یا کسی ناخدا ترس سنگدل نے اپنے بقائے نام و شہرت اور تعمیرِ جدید کے شوق میں خیرباد کہہ دیا ہوگا۔

اللہ رے انقلاب نہ محراب ہے نہ در — پتھر فقط عمارتِ مسجد کا رہ گیا

میرا مبلغِ علم و وسائلِ تحقیق یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ یہ سردار خاں لوحانی کون تھا؟ اُس زمانہ کی تاریخ
کے اوراق پر جس سردار خاں کا نام زیادہ روشن نظر آتا ہے، وہ ایک معتمد عالمگیری امیر اور شش ہزاری منصب دار
تھا[1] جو وفورِ اعتماد و سلوکانہ سے زیادہ تر ذاتِ شاہنشاہی کے قریب خدماتِ نظارت[2] و داروغگی فیل خانہ[3] وغیرہ پر
مامور رہا تھا۔ اُس کا کبھی الہ آباد آنا پایا نہیں جاتا اور ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۶ء) یعنی محمد شاہ کے عہد تک زندہ و
برسرِ کار رہنا تو قطعاً غیر متیقن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نام کے جتنے ممتاز ارکانِ دولت کا ذکر کتابوں
اور تاریخوں میں ملتا ہے ان میں سے کسی کا تعلق الہ آباد سے ثابت نہیں ہوتا۔

میرا دل اسی تحقیقات و خلفشار میں مبتلا اور دماغ انھیں گتھیوں کے سلجھانے میں مصروف تھا کہ

---

[1] عالمگیر نامہ، صفحہ ۲۲۶۔ [2] عالمگیر نامہ، صفحہ ۱۰۴۴۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۳۸۔

ایک خضرِ طریقت نے رہبری فرمائی اور اُس مسجد کا ذکر کیا جو خلد آباد کے مشرقی پھاٹک کے متصل بر لب شارعِ اعظم واقع ہے۔ میں نے وہاں بھی حاضر ہو کر آستان بوسی کی تو اُس جگہ بھی ایک نئی مسجد پائی۔ پھر کجا کہ رسیدیم آسماں پیداست۔ دریافت ہوا کہ یہاں کبھی ایک مختصر سی مسجد سنگی تین در کی ضرور تھی۔ بعض اُس کو اکبری عہد کی یادگار، کم سے کم خسرو باغ اور خلد آباد کی ہم عمر بتاتے تھے۔ لیکن کچھ باخبر ہوشمند چند در چند قرائن و قیاسات اور متواتر روایات کی بنا پر شاہجہانی قرار دیتے تھے۔ ایک بڑی جماعت اسی طرف تھی۔ اس بارہ میں کہ آیا یہ مسجد شاہی انقلابِ زمانہ در گردشِ ایام سے گر گئی تھی یا کسی شورش کے استیصال اور مفسدین کی تنبیہ و عبرت کے لئے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر مسمار کی گئی تھی اختلافِ اقوال ہے۔ بہر دو صورت کچھ دن یوں ہی گری پڑی رہی حتیٰ کہ گذشتہ سال[1] (۰۰۰۰ء) میں چند ذی ہمت، باثر مسلمانوں نے توجہ فرمائی اور اس کو از سرِ نو تعمیر کر دیا۔ اس کے بعد یعنی تیسری بار کی درستی و تکمیل میں اس کا دالان اور بھی عریض و طویل اور صحن وسیع و فراخ ہو گیا۔ اور اب تو ہر طور پر یہ ایک کامل و مکمل نئی چیز ہے۔

شاہی مسجد میں داخل ہونے کے لئے سرا کے مشرقی و شمالی کونے سے بھی ایک راستہ تھا اس جانب (پورب کو، جو اب محدود اور بلدیہ کی کسی عمارت سے مسدود سا ہو رہا ہے) مسجد کی پرانی دیوار ہنوز موجود ہے۔ اس میں دو دروازے سنگی چوکھٹ بازو کے نصب، اور اب تک باقی ہیں۔ جو اس کی عظمت و شان گذشتہ کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔ ایک دروازے میں ہو کر اوپر جانے کے لئے زینہ تھا۔ یہ بدستور قائم ہے۔ مگر آگے چل کر بندروں کی دستبرد و غارتگری یا اور مجبوریوں سے منتظمین نے خود ہی بند کرا دیا ہے۔ نمازیوں کو مسجد تک پہنچانے سے قاصر ہے۔

بایں ہمہ حرمان و ناکامی، تلاش در پیش رہی، کوشش جاری۔ شوقِ تدقیق باقی تھا اور عزیمت راسخ و استوار کہ ایک نیک منش آگاہ دل نے زحمت و رفاقت گوارا فرمائی اور مجھے خسرو باغ کے مغربی گوشہ تک پہنچایا جہاں حسبِ اصول فن دیوار گول کر دی گئی ہے اور جس کے سامنے سے جنوب کو بڑی شیر شاہی سڑک گزرتی ہے۔ بیرونِ باغ کی چند قدم کی سڑک طے کرنے کے بعد ایک بڑا "تکیہ" مع بہت سی خالی زمین اور متعدد

---

[1] میرا سالِ ولادت ہی عام اصطلاح ہے۔

قبروں کے پیشِ نظر تھا بارِ غم سُن ایک بند محراب وار چھوٹی سی دیوار کھڑی ہے۔ بظاہر عدم کا مسافر بھی
سامان باندھ چکا اور آخری اجازت کا منتظر ہے۔ اس کی ساخت کسی پُرانی قناتی مسجد کے جزو ہونے پر خود
گو ہے۔ اس کے آگے لمبا چوڑا فرش ہے۔ غریب مسلمانوں کی ایک محترم جماعت بڑے حوصلہ و ہمت
سے اس کو آج کل درست کرا رہی ہے۔ میرے رہنما کی چشمِ تصور میں وہاں پوری مسجد موجود تھی محرابیں تھیں،
طاقِ مسجد تھا نیز مسجد کا پیش دروازہ۔ دروازہ کی پیشانی پر پیل صاحب کا نقل کردہ قطعۂ تاریخ بھی ثبت
تھا۔ لیکن میری ظاہر بیں آنکھیں اس خیالی نقشہ پر نگاہیں ڈالتیں اور لوٹ آتیں اور اس مسجد کو مسجد
حُسامی ماننے میں تامل کر رہی تھیں۔ انھوں نے پُرانے گورستانوں اور مدفنوں میں ایسی بہت سی شکستہ
و ریختہ مسجدیں اور جا بجا دیواریں دیکھی تھیں۔ مزید برآں وہ اس کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں اور اور چیزوں کو
دیگر بادشاہی عمارات و جاہات وغیرہ کی اینٹوں اور اشیائے تعمیر سے جدا اور مختلف پاتی تھیں۔ میرا ذہن
و تجربہ بھی خاموشی و ادب کے ساتھ اُن کا ساتھ دے رہا اور اس تصویرِ تصور کو واقعی باور کرنے سے معذور
و معاف رہنا چاہتا تھا۔ ہاں یہ ایک سبق ضرور لے رہا تھا۔

ہے تری تصویر تکمیلِ تصور کی نشاط — جو فنا کا نقش بن کر دیدۂ عبرت میں ہے

وائے محرومی! کہ ان اطراف کی چھ صدی پُرانی مسجدوں میں سے ایک کو بھی قدیم اور بحالہ نہ پایا۔
ہم خیال و مخلص واقفِ حال احباب کی اعانت و رہنمائی کے باوجود مسجدِ حسامی کا پتہ نہ چلنا تھا، نہ چلا۔
آے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ البتہ یہ تجربہ و مشاہدہ اکثر جگہ ہوا کہ دو ڈیڑھ سو برس کی مضبوط سی مضبوط سنگین
عمارتوں اور عبادت گاہوں کو بھی زمانہ کے جفا کوش اور تباہ کار ہاتھ نے الہ آباد میں برقرار نہیں رہنے دیا ہے۔
کس آسانی سے مٹا دیا ہے ۔۔ جی بھر آیا عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر!

چاہِ خلد آباد

خسرو باغ کی دیوار سے متصل، پچھم طرف، خلد آباد کے بیرونی پھاٹک کے باہر، لب سڑک کلاں، اُسی وقت کا نہایت وسیع و عمیق دس بیل کا مضبوط پختہ کنواں واقع ہے۔ جو اب تک خوب کام دیتا اور باشندگانِ قرب و جوار کو سیراب کر رہا ہے۔ اور امید ہے کہ ابھی ایک مدت دراز تک اور کار آمد رہے گا۔ اس کے وسیع دَور میں اندر کی جانب مَن (دہانہ) سے ڈیڑھ گز نیچے ایک مربع سا پتھر، ہاتھ بھر لمبا اور اس سے کچھ کم چوڑا لگا ہے۔ کنواں اوپر سے نیچے تک موٹی اینٹوں کا بنا ہے اور اُسی جُڑائی میں پتھر پیوست ہے۔ اس پر خوب موٹے موٹے اُبھرے ہوئے نستعلیق حرفوں میں، فن و ہنر کی تمام نزاکتوں اور خوشنمائیوں کے التزام کے ساتھ "باہتمام محمد رضا مصور مرید نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی" تحریر ہے۔ حروف خوب جلی (یا آج کل کی عربی اصطلاح میں "بارز") ہیں، صاف پڑھے جاتے ہیں۔ یہ کتبہ اوپر سے کھڑے ہو کر دیکھنے والے کی آنکھوں کے سامنے نہیں پڑتا ہے بلکہ کنوئیں کے دہانے سے کچھ نیچے اندر کو ہے۔ اس پر کنوئیں کا قطر اور نیم تاریکی مستزاد ہے۔ اس لئے اس کے پڑھنے میں کسی قدر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

معمول کے خلاف (سہی، مگر کسی قدر وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ) سال تعمیر شروع ہی سے نہیں لکھا گیا تھا۔ مٹنے، مٹائے جانے کے نشان یا خراش پائے نہیں جاتے۔ باریک بین و خردہ نگر کی مدد سے بھی اطمینان کر چکا ہوں۔ بہت سے اہلِ علم و صاحب نظر حضرات نے بھی غور و توجہ سے دیکھا ہے۔ تاہم، اس کتبہ کا نظری نقشہ یا نقل بناتے وقت میرے عزیز سید اختر حسین نے رضا اور مصور کے درمیان، نیچے کو، پندرہ کا ہندسہ پڑھا اور لکھ دیا ہے۔ اگر اُن کا مطالعہ دُرست ہے تو اس کا مقصود صرف "۱۰۱۵ھ" ہو سکتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ باغ کے پھاٹک کی تعمیر (۱۰۱۰ھ) سے پانچ سال بعد اس کنوئیں کی تکمیل ہوئی تھی، حالانکہ جہانگیر اس سے سال بھر پہلے الہ آباد سے رخصت ہو چکا تھا اور آگرہ میں سریر شہنشاہی پر رونق افروز تھا[1] اور اس طرح خلد آباد کے پھاٹکوں سے لے کر اس کنوئیں کے بننے تک بیس سال لگے تھے۔

---

[1] جہانگیر کی تخت نشینی کی تاریخ ۲۰ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ ہے۔ تحفۃ الکرام، جلد دوم، صفحہ ۱۲۰

یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آقا رضا اپنی آقائیت ترک کر کے اس وقت صرف "محمد رضا مصور" رہ گیا تھا۔
عبارت کے گرد خوش سولو ابھری ہوئی جدول اور پھلواری موجود ہے محراب بھی نفیس و خوبصورت
پیالہ دار بنی ہے بادشاہ کا نام اور تکلفاتِ کتابت سب برقرار ہیں۔
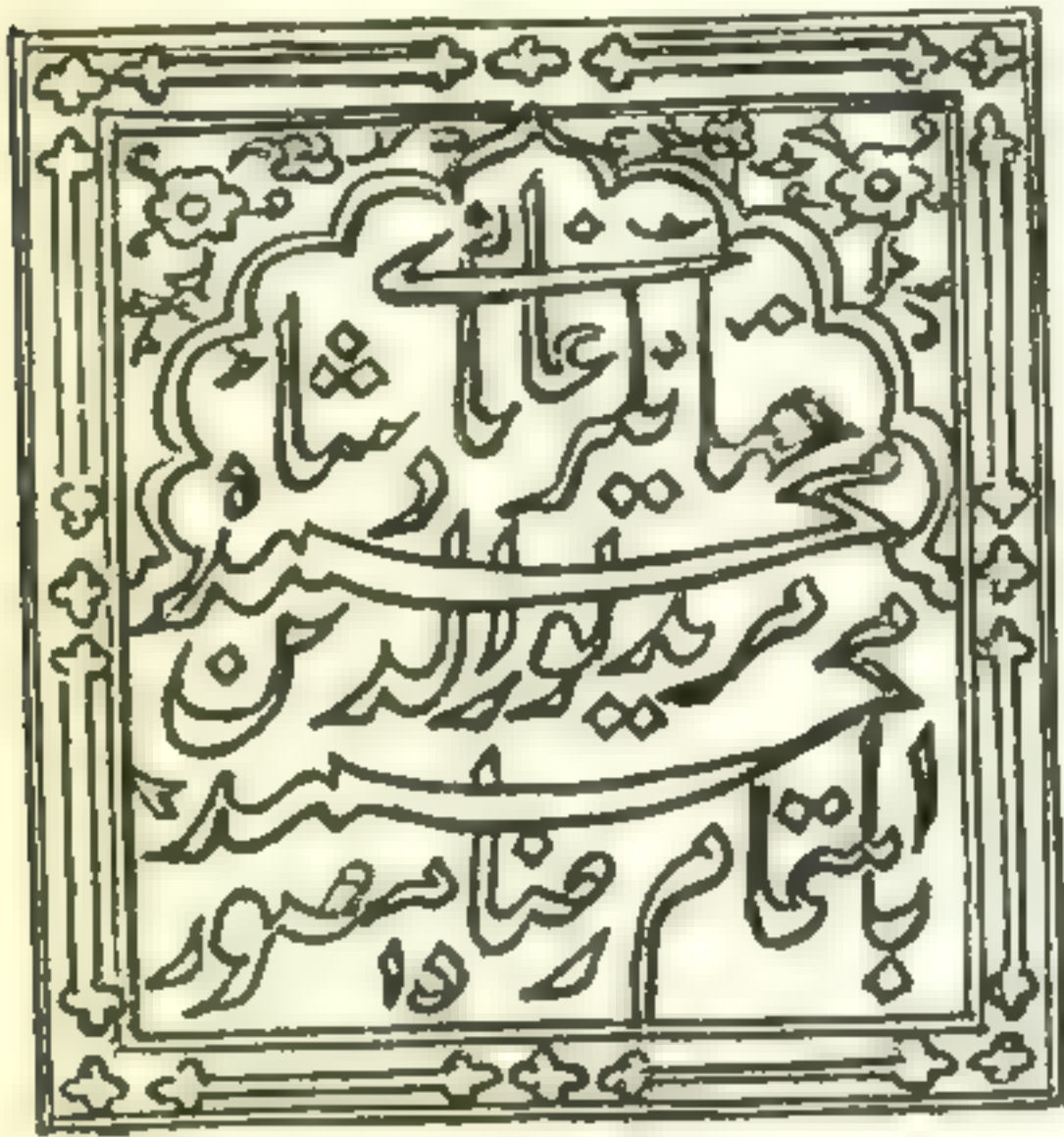
اس کتبہ کی اصلی شان مجموعی طور پر اب تک قائم و محفوظ ہے۔ البتہ ساڑھے تین سو برس گزر جانے
یا پانی کی بھاپ اور شوریت کے اثر سے نیچے والے حصہ میں بعض لکیریں یا حرف کسی قدر گھس گئے ہیں جہاں پتھر
جھڑنے لگا ہے۔ کچھ کچھ نشے بھی لگے ہیں۔ خدا را ے کہ کتبہ کی روز افزوں فرسودگی دیکھ کر آقا رضا کی روح چیخ اٹھے۔

محو ہونا ہی مجھے ہے اگر اسے یادِ وفا — میری تربت پہ نشانِ سرِ تربت ہونا

جب تک باغ کو واڑ دو کسی سے پانی نہیں دیا جاتا تھا باغ کے کنوؤں کے ساتھ ساتھ وقتِ ضرورت
اس کنوئیں پر بھی پور رہٹ چلتا تھا۔ اور اس سے پانی دیا جاتا تھا اس وقت اس پر پلاسٹر باقی نہیں ہے۔
بڑی بڑی اینٹیں، جو چونے کی خوب موٹی موٹی تہوں میں پیوست ہیں، اُگل رہی ہیں۔

سرائے خُلد آباد

خلد آباد کی سرا کی نسبت حال کے گزیٹیر والے تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ ایک بڑا اور وسیع احاطہ ہے۔ اس کے دونوں طرف بھاری بھاری پھاٹک لگے ہیں۔ پچھم والے پھاٹک پر سنگ کتابہ نصب ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر جہانگیر کے حکم سے ہوئی تھی۔"[1]

مسٹر اسٹیل اور اُن کے ہم قلم معاونین نے گزیٹیر سابق میں لکھا ہے "سرائے خلد آباد خسرو باغ کے متصل، جانب جنوب، ایک بڑا احاطہ دار بازار ہے۔ سرا کے پھاٹک پر یہ قطعۂ فارسی لگا تھا جو خسرو باغ کے اصلی پھاٹک کے مقابل تھا۔

بفرمانِ شہنشاہِ جہانگیر شاہ — کہ زیبد ملکش از مہ تا بہ ماہی
بنا شد ایں سرائے آسماں قدر — کہ باد آباد خلد آبادش ہی[2]

ڈاکٹر فوہرر اپنی کتاب یادگارہائے قدیمہ میں لکھتے ہیں کہ "سرائے خلد آباد ۹۹۶ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔"[3] معلوم نہیں کہ ان کی سندِ تحریر کیا ہے؟

سرا اور خلد آباد کے پھاٹکوں کا احوال گزشتہ و حال پوری تفصیل کے ساتھ آغاز کتاب میں (صفحات ۵۴ و ۵۵ پر) لکھ چکا ہوں اس موقع پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ سرا کی کوٹھریوں کی وضعِ تعمیر، خلد آباد یعنی باغ کے پھاٹک کے دونوں جانب والی کوٹھریوں سے مختلف اور الگ ہے۔ ان کے دروازوں کی محرابیں بھی جُدا جُدا طرز کی ہیں۔ سرا کا اصلی دروازہ تو باقی نہیں جس کا مرثیہ شروع میں (صفحات ۵۵ و ۵۶ و ۵۷ پر) پڑھ چکا ہوں۔ اُس کے موقع پر عمارات و شاندار دُکانات بن گئی ہیں۔ جنوبی دروازہ موجود ہے۔ وہ اُسی طول و عرض، بلندی و استواری کا ہے جیسا معمولاً قلعوں اور شہر پناہوں میں "کھڑکی" کا ہوتا ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر دیکھنے سے باغ کا پھاٹک بالکل سامنے نظر آتا ہے۔ سرا کا صحن

---

[1] گزیٹیر مطبوعہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۱۔ [2] مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۲۰۔ [3] مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۳۰۔

اب بھی لق ودق بسیط و عریض ہے۔ بادشاہی سڑک اپنے دونوں طرف کی زمین سے برابر بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ تاہم باغ کے پھاٹک یا سڑک پر سے دیکھنے سے سرا کی کوٹھریوں کے اندر تک کا سامنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس کھڑکی یا چھوٹے دروازہ سے باغ کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس دروازے کے دونوں کواڑ، پُرانے، اب بھی باقی ہیں؛ مگر اس حال میں کہ ایک بجائے خود کھڑا ہے، دوسرا ایک جانب یعنی بغل کو پڑا ہے۔ چوکھٹ بازو اِدھر اُدھر کی دیواروں سے الگ ہو رہی ہے، یا ہی تفرقہ یا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔

سرا کا کنواں بھی خوب وسیع اور مناسب حال و ضرورت ہے۔ مگر اتنا نہیں جتنا خلد آباد کا پھاٹک والا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے اندر بھی پتھر لگا تھا جو کہیں نیچے کو پانی کے قریب تھا۔ تصدیق کون کر سکتا ہے! نہ سیج تب تک رسائی ہو سکتی ہے، نہ نگاہ پہنچ سکتی ہے۔ قلم، دوات میں غوطے کھاتا یا لگاتا ہے مگر بوڑھا قلم کش قعرِ چاہ میں غوطہ بازی کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا۔ کیا یہ حقیقت ہے، یا مہربان بتانے والوں نے ستم ظریفی سے کام لیا ہے؟

صحنِ سرا میں گرمی بازار کے لئے ٹین کے سائبان جا بجا رونق افروز نظر آتے ہیں۔ سفالہ پوش اور مُسقّف و مکلّف دُکانات بھی ہیں۔

اس وسیع مربع کے گرداگرد کی باہر والی قدیم سڑک بدستور رواں ہے۔

سرا کی مسجد نہ تو شاہی ہے، نہ شاہی وقتوں کی ہے۔ سو اسو برس پُرانی بتائی جاتی ہے۔ کسی عالی ہمت بھٹیارے نے خوش سلیقگی و حسنِ اہتمام سے تعمیر کرائی تھی۔ صحن کے غربی نصف کے وسط میں مختصر و سبک تین در کی خشتی بنی ہے۔ آباد و درست حالت میں ہے۔ ایک مدت کی استر کاری اور سال بہ سال کی قلعی اور تہ بر تہ سفیدی کے باوجود اس عجوزِ پیر زال کے حسن و جمال کے نقش و نگار برقرار اور خط و خال ہنوز نمودار ہیں۔

باؤلی

خَيْرُ النَّاسِ أَفْضَلُ الْأَشْغَالِ خدا کی رحمت ہو اُن حق شناس، حق گزار حق پرست عالی ہمت بنوانے والوں پر جنھوں نے اپنی آسایش و تفریح کے لئے نہیں، بلکہ مخلوقِ خدا کی راحت و آرام اور سیرابی کے واسطے، فصیلِ باغ کے باہر یہ باؤلی بنوائی تھی، تاکہ لوگوں کی آمد و رفت میں روک ٹوک نہ ہو اور شاہی موکب و کوکبہ جاہ و جلال عوام الناس کی رسائی و بے تکلف و تردد فائدہ اُٹھانے اور آرام پانے میں مخل و مانع نہ آئے۔

یہ باؤلی باغ کے شہری پھاٹک کے جنوب و شرق، دیوار سے باہر یعنی احاطۂ باغ سے خارج مگر اُسکی جنوبی دیوار کے متصل، خدآباد کے شرقی پھاٹک کے قریب واقع تھی۔ باغ سے اس کو ہمسایگی کا حق اور قرب کا گہرا علاقہ حاصل تھا۔ اس کی عمارت بہت سی چوڑی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ حفاظت کے لئے اس کے گرد دیوار تھی۔ اندر جانے کا راستہ باؤلی کے پورب سڑک کے رُخ تھا۔ دروازہ خوش قطع خوشنما اور خاصا چوڑا اور اونچا تھا۔

میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ ۱۸۸۶ء کی یاد نہیں۔ ۱۹۱۰ء میں جب الہ آباد آیا اور خسرو باغ کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ باؤلی پچیس چھبیس برس ہوئے پاٹ دی گئی۔ الزام یہ تھا کہ یہاں کبھی کبھی کسی انسان یا کُتّے کی جان جاتی رہتی تھی یا کوئی شامت زدہ ڈوب مرتا تھا۔ متمدن ممالک اور نیم وحشی اقوام سب کے یہاں اتلافِ جان کی پاداش خود مجرم کا معدوم کردیا جانا ہے۔ چنانچہ اس بلائے جان، ناقضِ امن و امان کے لئے تعزیری قوانین کی سب سے بڑی سزا صادر کردی گئی۔ کم سمجھ ناحقیقت شناس کہتا ہے کہ اہلِ حل و عقد کو وحشت و بربریت قدیمانہ کا یہ مظاہرہ پسند نہیں آیا تھا۔ ورنہ کیا ممکن نہ تھا کہ ڈول و رسن کی جگہ جولان و زنجیر سے کام لے لیا جاتا اور روک کے لئے کنوئیں کے مُنہ اور منافذ و مخارج پر چوکھٹے اور جنگلے لگا دیئے جاتے۔ وہ کثیر صرف جو اس کے پاٹنے میں کیا گیا یقیناً اس سے بہت کم میں آیندہ کا تحفظ اور سدِ باب ہو سکتا تھا۔

تیری رُسوائی کے خونِ شہداد رپے ہے — دامنِ یار! خدا ڈھانپ لے پردہ تیرا

عرصۂ عالم کا سب سے پُرانا مشہور کنواں جس کی ظاہری عمر بھی ساڑھے چھ ہزار برس سے کم تجویز نہیں کی جاتی ہے[۱] اور جس کی پاکی و بزرگی اُنہتر کروڑ انسان (مسلمان) اپنے پہ حینِ حیات نیز بعد ممات، دجہِ برکت وشرف و تقدیس سمجھتے ہیں یعنی "زمزم" بھی مسلمانوں کے دستِ اقتدار میں آنے سے پیشتر اس قسم کے واقعات یا حادثات کا باعث ہو جاتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صدرِ اسلام میں بعہدِ حضرتِ عبداللہ بن زبیر ایک حبشی اس میں گرا اور مر گیا تھا[۲]۔ یہ تیرہ سو برس کی پُرانی بات ہے۔ مگر اُسی وقت سے ایسا انتظام حفاظتِ جان و انسداد کا کر دیا گیا کہ ہر سال کے آنے جانے والے پانچ چھ لاکھ زائر و حاجی، جن میں بھانت بھانت کے انسان اور مختلف اقلیموں، تمدن و تربیت اور کم و بیش سن و سال اور ہوش و حواس کے آدمی ہوتے ہیں اس سے بفراغت و اطمینانِ تمام ہر وقت فیضیاب و سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ وہ دو ڈیڑھ لاکھ مستقل باشندگانِ شہرِ مکہ، ان کے علاوہ ہیں جن کی زندگی و معیشت کا دار اسی متبرک پانی پر ہے۔ انہ طعام طعم و شفاء سقم۔

اس باؤلی کا صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جانا کچھ زیادہ دن کی بات نہیں۔ اس کے دیکھنے اور درد کے ساتھ یاد رکھنے والے اب بھی ہزاروں زندہ و باقی ہیں۔

سنو افسانۂ جمِ جام رکھ کر سامنے آنکھے — ابھی دو چار ہیں جم کا زمانہ دیکھنے والے

یہ باؤلی ۲۰ ۔ ۲۵ برس ہوئے بند کرا دی گئی۔ اس کی تمام وسیع و نفیس عمارت پر جو اُس وقت تک قائم تھی خاک ڈال دی گئی۔ اس کی پاتال توڑ گہرائی (قعر) لوہاروں کے کھنجر اور پژاووں کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور روڑوں سے بھر دی گئی۔ ہزاروں من مٹی اور باوجود اٹھ ورک کے نالابوں کی کھدائی سے نکلی تھی باؤلی کے اندر سما گئی۔ پانی کے سوت سے لے کر اوپر کے ستونوں تک بھر دی گئی یوں کہئے کہ اس کی آرام گاہیں، اس کی بھول بھلیاں، اس کے پوشاک بدلنے کے کمرے، اس کے سرد خانے

---

[۱] بیل کی بیاگرفی کل ڈکشنری، ذکر عبدالمطلب، صفحہ ۷۔ [۲] تاریخ عمارۃ المسجد الحرام، مطبوعہ جدہ مشرفہ ۱۳۵۴ھ، صفحہ ۱۶۲۔

سب کے سب مسلم زندہ دفن کردیے گئے۔ اسی پر قناعت نہیں ہوئی بلکہ اس کے قریب والے 'باغ کے حصۂ زمین کو اچھا خاصا ٹیلا یا ٹیکرا بنا دیا گیا۔ کافی ہوتا کہ باؤلی کے دہانے پر دروازہ یا کٹہرا لگا کر زینے اوپر سے محفوظ کردیئے جاتے۔ یا شہتیر و تختے رکھ کر بالائی حصہ مٹی سے پاٹ دیا جاتا یا کسی اور معقول و کارگر طریقہ پر آمد و رفت و داخل خارج انسانی کا راستہ مسدود کر دیا جاتا۔ لیکن اس سے یہ اندیشہ قائم رہتا تھا کہیں پھر کسی وقت اس فرمانِ قضا جریان پر نظرِ ثانی ہو تو یہ باؤلی کھلوا دی جائے۔ اس لئے اس کو انتہائی حد تک معدوم کر دیا جانا لازم ہوا۔ آیندہ نہ اتنے عظیم صرفہ کی فراہمی ہو سکے گی نہ اس کی مٹی نکالنے اور صفائی کی نوبت آئے گی۔ مزید برآں اس مقام یا اس کے قرب و جوار کی زمین پر قبضہ پانے والوں اور مکان بنوانے والوں کے دعووں پر ہرجہ و معاوضہ کی ناقابلِ برداشت رقم ادا کرنے پر سرکار یا بلدیہ کب تیار ہوگی۔

باؤلی تین درجہ یا منزل کی تھی۔ ہر طبقہ میں محراب دار دروازے بلا کواڑ کے تھے۔ دروازوں کے نچلے حصے میں دو دو فٹ اونچی مُنڈیریں (مینڈیں) اُٹھا دی گئی تھیں، تاکہ پھسلنے اور گر جانے کی روک رہے۔ دروازہ سے داخل ہونے اور کچھ ہی نیچے اُترنے کے بعد عمارات کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شمال و جنوب دونوں جانب سیڑھیاں، پندرہ پندرہ سولہ سولہ ہاتھ کے قریب لمبی اور ہاتھ سوا ہاتھ چوڑی تھیں۔ مزید آسایش اور نشستِ بافراغت کے لئے ہر دس بارہ سیڑھیوں کے بعد ایک ایک سیڑھی کئی کئی ہاتھ چوڑی چھوڑی گئی تھی۔ یہ سیڑھیاں نہایت پست تھیں، اور ایک بچہ بھی آسانی سے اُتر سکتا تھا۔ کوئی سیڑھی پانچ چھ انگل سے زیادہ اونچی نہ ہوگی۔ اطمینان و احتیاطِ مفرط یا سہولت کے لئے موٹی موٹی مضبوط زنجیریں دیواروں کے ساتھ ساتھ، پکڑ کر چڑھنے اُترنے کے لئے آویزاں تھیں۔ سطحِ آب پر ڈوبنے سے بچاؤ کے واسطے متقاطع (ٹیڑھی بیڑھی) زنجیریں الگ ڈالی گئی تھیں۔ بجز کہن سال ہو جانے کے اس باؤلی میں کوئی خرابی یا کمزوری پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پیر منڈی صاحب کی ۱۹۳۲ء کی بیان کردہ خوبیاں اور تفصیلات (مندرجہ صفحہ ۸۰، کتاب ہذا)، برقرار و قائم تھیں۔ باؤلی کے آس پاس اُس وقت تک اعلیٰ سرس اور نیب کے سایہ دار و تناور پُرانے پُرانے درخت اور آم نارنگی اور چکوترے کے پھل دار پیڑ بھی موجود تھے۔ پیڑوں پر دو روپیہ بازار لگتا تھا۔ تیوہاروں کے زمانے اور میلے ٹھیلے کے دنوں میں یہاں رونق اور چہل پہل بہت رہتی تھی۔ لوگ اندر

جمع ہوتے، کھاتے پیتے اور ہر طرح کا لطف اُٹھاتے تھے۔ بھول بھلیوں میں کھیلتے، پھنستے اور ہنستے ہنساتے تھے۔ چشمدید روایت یہ ہے کہ اس باؤلی سے پورے شہر الہ آباد کو پانی ملتا تھا۔ سرکار دولت مدار نے سنہ ۱۸۸۰ء میں اس کی صفائی کرائی۔ کنوئیں کے سوتوں سے بہت زیادہ پانی اوپر آگیا۔ ایک بانس کے قریب جب نکال دیا گیا تو بہت موٹے موٹے کڑے مع زبردست زنجیروں کے ہر پہل میں الگ الگ نظر آئے۔ معلوم ہوا سیکڑوں من کا آہنی توا جو تعمیر کے وقت اس میں ڈالا گیا تھا، بجا ہے موجود و محفوظ بلکہ سب کا محافظ باقی ہے۔ تاہم پانی کی طغیانی اور زور کا روکنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ نیچے کا حال کون جان سکتا ہے۔ توے سے اوپر اوپر ہی بیس بائیس ہاتھ پانی چڑھ آیا تھا۔ صفائی کا کام توے تک نہیں پہنچ سکتا تھا، روک دینا پڑا۔ بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑ دیا۔

اندر جانے کے زینے کے نشانات مٹی میں دبے ہوئے اب بھی اپنی ہستی کا ثبوت دے رہے ہیں اس کی جگت بھی بالکل درست کھلی ہوئی ہے۔ دہانہ مٹی سے بھرا ہوا ہشت پہل صاف نظر آتا ہے۔ اسی مناسبت سے اندر کو یک کمرہ بھی ہشت پہل رکھا گیا تھا۔ گولائی بیس اکیس فٹ کے قریب ہوگی۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں واٹر ورکس کا آغاز ہوا۔ میونسپل بورڈ نے "بادگودام" یعنی تالابوں کی مٹی اور ریت وغیرہ کے لئے پختہ اینٹوں کا احاطہ بنوایا، جو خسرو باغ کی پرانی سنگین دیوار کے ادھر بازار کی طرف دور تک چلا جاتا ہے۔ باؤلی کے دروازے پر ایک کچی دیوار عارضی اُٹھائی گئی۔ بارش کے پانی ریلے اور سیل سے وہ ٹھہر نہ سکی۔ اپنی کچی اینٹوں، بالو اور ہر چیز کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔ حکام کھڑے کھڑے دیکھتے تھے اور اپنی ہنگامی معذوری کو خاموشی اور ایک ادائے بے نیازی سے چھپاتے تھے۔ اس کے بعد وہی قصہ وہی حیلہ و حوالہ اور عذر و شکوہ تھا۔ کتے آتے ہیں، جانور گرتے ہیں۔ لوگ پاخانہ بھرتے ہیں۔ انسان مرتے ہیں۔ اس لئے اس کا بند ہو جانا ہی مناسب ہے۔ باؤلی زبانِ حال سے فریاد ہی کرتی رہی کہ

مجھے یوں نہ خاک میں تو ملا، میں اگرچہ ہوں ترا نقشِ پا
ترے جلوے جلوے کی ہے بقا، مرے حق نام بنام سے

مگر میونسپلٹی نے سنہ ۱۸۹۳ء میں بھروا دی۔

---

۵۸ ڈسٹرکٹ گزیٹیر الہ آباد سنہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۶۳۔

کہا جاتا ہے کہ باؤلی کا کھلوا دیا جانا کچھ مشکل نہیں۔ بورڈ نے چھ سات سال ہوئے لوگوں کی خواہش اور زر نالی پر فیصلہ کیا تھا کہ کھلوا دی جائے۔ اور واٹر ورکس کے لیے نئے چاہات بنانے کی بجائے پانی اسی سے لیا جائے۔ چنانچہ صفائی کا ٹھیکہ بھی چھ ہزار روپیہ میں طے ہو گیا تھا۔ مگر مزید کارروائی یا نتیجۂ عمل سے پبلک کو ہنوز آگاہی نصیب نہیں ہوئی۔ شاید وہی دشواریاں مانع آئی ہوں جن کا اندیشہ پیشتر ظاہر کیا جا چکا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ صرف پندرہ روپیہ سالانہ پر یہ زمین سنی بورڈ نے سال بہ سال کے پٹہ پر دے رکھی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے فلسفۂ تناسخ کے مطابق باؤلی نے اپنے سے متصل واٹر ورکس کا چولا بدلا ہے اور عمل ارتقا کے بموجب باؤلی کا پانی جو تحت الثریٰ یا زیر زمیں رواں تھا، آسمان سے باتیں کرنے والے تالابوں کی بلندی پر پہنچ گیا ہے۔ لیکن دیدۂ ظاہر بین سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں کہ اس اُجڑی ہوئی، اُداس بزم کا رنگ واٹر ورکس کا کارخانہ ذرا بھی نہ جما سکا۔ محفلِ عبرت و حسرت کی حشر سامانیاں ہر سو نمایاں ہیں۔ بحالتِ موجودہ خسرو باغ اور اس کے مضافات میں سب سے بے کار، ناہموار و وحشت خیز مقام یہی باؤلی کے پڑوس والا ڈھیر ہے۔ اس کو بے ترتیب جھاڑیوں اور خودرو جنگلی پیڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ اچھا ہوا کہ واٹر ورکس کے حوضوں کے قریب ہونے سے اُدھر کی آمد و رفت روک دی گئی اور حفاظت کے لیے پہرہ رہنے لگا تھا۔ اور اب لوہے کے ستونوں اور کانٹے دار تاروں سے مستقل طور پر محصور کر دینے سے اس طرف کا آنا جانا ہی قطعاً ممنوع و مسدود نیز دشوار ہو گیا ہے۔ یاد رہے

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے　　ناز اتنا نہ کریں ہم کو مٹانے والے

اس ٹریجڈی یا واردات ہوش رُبا، روح فرسا کا نہایت گہرا اثر اہلِ شہر پر اب تک باقی ہے۔ کوئی انسان خواہ کسی فرقہ، ملت یا طبقہ و جماعت کا ہو جس نے اس باؤلی کو دیکھا ہو، اس میں نہانے اور تیرنے کا مزہ پایا ہو، یہاں کی گلبازیوں میں مصروف رہا ہو، یا وہ جو اس کے لطفِ نظارہ و سیر و فرحت

سے محروم رہا ہو، مر پوچھنے والے کو اپنا چوٹ کھایا ہوا دل دکھا دیتا ہے۔ اور بھری ہوئی آواز سے اس کا مرثیہ سُنانے اور ماتم کرنے لگتا ہے۔ بشری فطرت کا اقتضا تھا جس نے مجھے بھی نہایت متاثر کیا۔ تاہم ایک واقعہ نویس کی حیثیت سے میں نے اپنے حدود سے تجاوز نہیں کیا نہ اپنے جذبات کو قابو سے باہر ہونے دیا ہے۔

جانِ وفا شعار کو شکوۂ غم سے کیا غرض　　عذرِ جفا سے کام کیا، عرضِ کرم سے کیا غرض

اس تہ خاک یار و پوش باؤلی کے سلسلہ میں ایک دوسری باؤلی یاد آگئی۔ جو اسی عہد یا متقارب زمانہ کی یادگار ہے اور موضع برہم باد (ابراہیم آباد، مضافات بیانہ، علاقہ بھرت پور) میں فتح پور سیکری کی سڑک پر ایک عالیشان مسجد سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے[1]۔ اس کو مع اس کے وسیع باغ کے سنہ سات جلوس جہانگیری یعنی ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں اُس نامور و عالی نژاد راجپوت شاہزادی نے تعمیر کرایا تھا جس کو ایک بڑے شاہنشاہ (اکبر اعظم) کی ملکہ اور ایک جلیل القدر فرمانروا (جہانگیر) کی ماں ہونے کا فخر حاصل ہے اور جس کو تاریخ راجہ بہاری مل کچھواہہ والی امبیر کی بیٹی[2] اور مریم زمانی کے لقب[3] سے یاد کرتی ہے۔

---

[1] رسالہ مخزن لاہور نمبر ۳ جلد ۱۲ بابتہ مارچ ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۰ نیز۔ تزک جہانگیری (ترجمہ انگریزی) بیورج حصّہ دوم صفحہ ۶۴۔
[2] نوٹ مفصل، مآثر الامرا جلد دوم صفحات ۱۱۰ تا ۱۱۲۔ [3] اصلی نام معلوم نہیں۔ مولوی سید احمد مارہروی نے سیاحت نامہ میں مریم الزمانی لکھتے ہیں لیکن قطعہ کو نقل کرتے وقت سہواً مریم مکانی قلم سے نکل گیا ہے۔ صفحہ ۲۲۔ مریم مکانی۔ حمیدہ بانو، حاجی بیگم مادرِ اکبر نے بعد وفات یہ لقب پایا تھا۔ بیل صاحب کی اورینٹل ڈکشنری صفحہ ۲۷۰ اور ڈاکٹر فوہرر کی آرکیالوجی کل سروے آف انڈیا جلد دوم، صفحات ۱۰۰ و ۹۸ بھی ملاحظہ ہوں۔ اکبر کے عہد میں ایسے لقب یا خطاب زیادہ رائج تھے۔ اُس کی پہلی ملکہ رقیہ بیگم مہد علیا الزمانی تھی۔ حکیم ابوالفتح علامۃ الزمانی اور حکیم علی گیلانی، جالینوس الزمانی بنائے گئے تھے۔

وقار انبالوی سلطانہ مریم زمانی کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔ اور وہ حقیقتاً اس ستائش کی مستحق ہے۔

ترے اوراقِ تاریخ کے صفحات روشن ہیں　　ترے جلووں سے مریمِ ہند کے دن رات روشن ہیں
تری خوش طالعی پر فخر کرتی ہے جہانداری　　عروسِ آسماں کو یاد ہے تیری طرحداری
تری رنگینیوں سے فصلِ گُل ہے مالامال اب تک　　تری رعنائیوں سے حُسنِ فطرت ہے نہال اب تک

اس باؤلی کا نہایت بلند و شاندار سہ منزلہ دروزہ اور فراخ نشست گاہیں پورب کی طرف واقع ہیں۔ اس پر نہایت خوش خط نستعلیق حرفوں میں یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔

بعہدِ شاہِ نور الدین جہانگیر — جہاں شد گلشن از مہ تا بماہی
بحکمِ مادرش مریم زمانی — کزو تابندہ شد نورِ الٰہی
مرتب گشت باغ و بائیں دلکش — ز شرمش خلد را شد چہرہ کاہی
خرد گفت از پئے تاریخ ہجری — سنۂ ہفتِ جلوسِ بادشاہی

یہ قطعۂ تاریخ پاکتابہ ہم کو بے اختیار اپنے خلد آباد (الہ آباد) کے پھاٹک والے قطعہ[1] کی یاد دلاتا ہے جو اسی بحر میں ہے جس کا وزن، جس کا قافیہ حتیٰ کہ بیشتر الفاظ بھی وہی ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ ان دونوں قطعوں کا ناظم ایک ہی تھا، یا اگر دونوں ایک ہی شخص نہ ہوں تو بھی اس میں شک نہیں کہ اس دوسرے تاریخ گو نے اپنے الہ آبادی پیشرو کا نہایت کامیاب، حیرت انگیز و قابل قدر تتبع کیا ہے۔

تری توصیف میں اب تک ہوائیں گیت گاتی ہیں — ترے انوار سے اب تک فضائیں جگمگاتی ہیں
تری رنگیں نوائی سے ہے موسیقی میں جوش اب تک — ترے جاں بخش نغموں کا اثر فردوسِ گوش اب تک
نزاکت آج تک کھاتی ہے تیرے نام پر قسمیں — لطافت اب بھی ہے گویا تری تصویر کے بس میں
تری تصویر سے جاری ہے تمثیلِ رنگ و خواب بھی — ترے دیدار سے، کرتا ہے ہر دل کو سرداب بھی

(صفحہ ۱۷۵) [1] قطعۂ تاریخ یہ ہے۔ بفرمان شہنشاہِ جہانگیر — کہ زیبد ملکش از مہ تا بماہی
بنا شد این سرے گیہاں قدر — [کہ باد آباد خلد آباد شاہی]

(منقول از صفحہ ۱۵ کتاب ہذا)۔ لیکن ڈسٹرکٹ گزیٹیر ۱۹۱۱ء کے صفحات ۲۰۰ و ۲۰۱ پر لکھا ہے کہ خلد آباد کی سرا کے پھاٹک پر جو خسرو باغ کے اصلی پھاٹک کے بالکل مقابل تھا یہ پورا قطعہ لکھا ہوا تھا۔ (صفحہ ۲۰۰ ۔۔۔)۔

مقبرۂ زینتُ النّسا بیگم

اسی کتاب میں (صفحہ ۶۲ پر) ڈاکٹر فوہرر کا یہ قول نقل کر چکا ہوں کہ الہ آباد میں عہدِ مسلمانان کی یادگاریں کم ہیں اور جو ہیں وہ بھی کوئی بڑی دلچسپی کی چیز نہیں[1]۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ اس سے مختلف ہے۔ موصوف کی نظر بہت وسیع و بلند تھی اور معیارِ پسند بلند تر۔ وہ عمارات کی جستجو، دستیابی اور بالآخر انتخاب کے وقت خاص خاص اوصاف، تکلفاتِ تعمیر، وسعتِ عمارت اور سب سے زیادہ شہرت و شان و عظمت پر نگاہ رکھتے تھے۔ ہر ایک چیز اُن کی آنکھ میں کیسے کھُب سکتی تھی۔ تاہم عرض کروں گا۔

حریفِ کاوشِ مژگانِ خونریزش نۂ ناصح ‏ ‏ ‏ ‏ بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

اس گئی گزری حالت میں بھی شہر اور اطرافِ شہر میں قابلِ دید و لائقِ ذکر صنادیدِ کہن کی کمی نہیں۔ الہ آباد کے آباد ہونے سے نام کے شاہ عالم کے قیام یا انگریزوں کے قبضہ کرنے تک، یعنی تقریباً دو سو برس سلطنتِ تیموری اور دولتِ اسلامی کا یہاں دور دورہ رہا ہے۔ بے شبہ مسلمانوں نے اپنے اتنے دنوں کی زندگی کی بہت سی یادگاریں یہاں چھوڑی تھیں۔ شہر کے ایک کنارے سے دوسرے تک کوئی دیکھتا ہوا گزر جائے تو اُس کو عہدِ ماضی کے بیسوں تبرکات ہر سمت جا بجا ملیں گے۔

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک ‏ ‏ ‏ ‏ دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

البتہ ماننا پڑے گا کہ حکومتوں کے تبادلے اور رفتارِ روزگار کی گردشوں نے بہت سے قدیم آثار کو درہم و برہم کر دیا یا نیم ویران بنا رکھا ہے۔

میرے علم میں خسرو باغ کے پھاٹک[2] کے بعد، مسلمانوں کی سب سے پُرانی تعمیر روضہ

---

[1] صنادید قدیمہ اور کتبے (۱۸۹۱ء)، صفحہ ۱۳۰۔ [2] صفحات ۵۵ لغایتہ ۵۷۔ کتاب ہذا۔

تاریخ الہ آباد

مقبرۂ زینت النسا بیگم

(۹) باہر سے

(۱۰) اندر قبر - جالیاں

[illegible] صدیقی
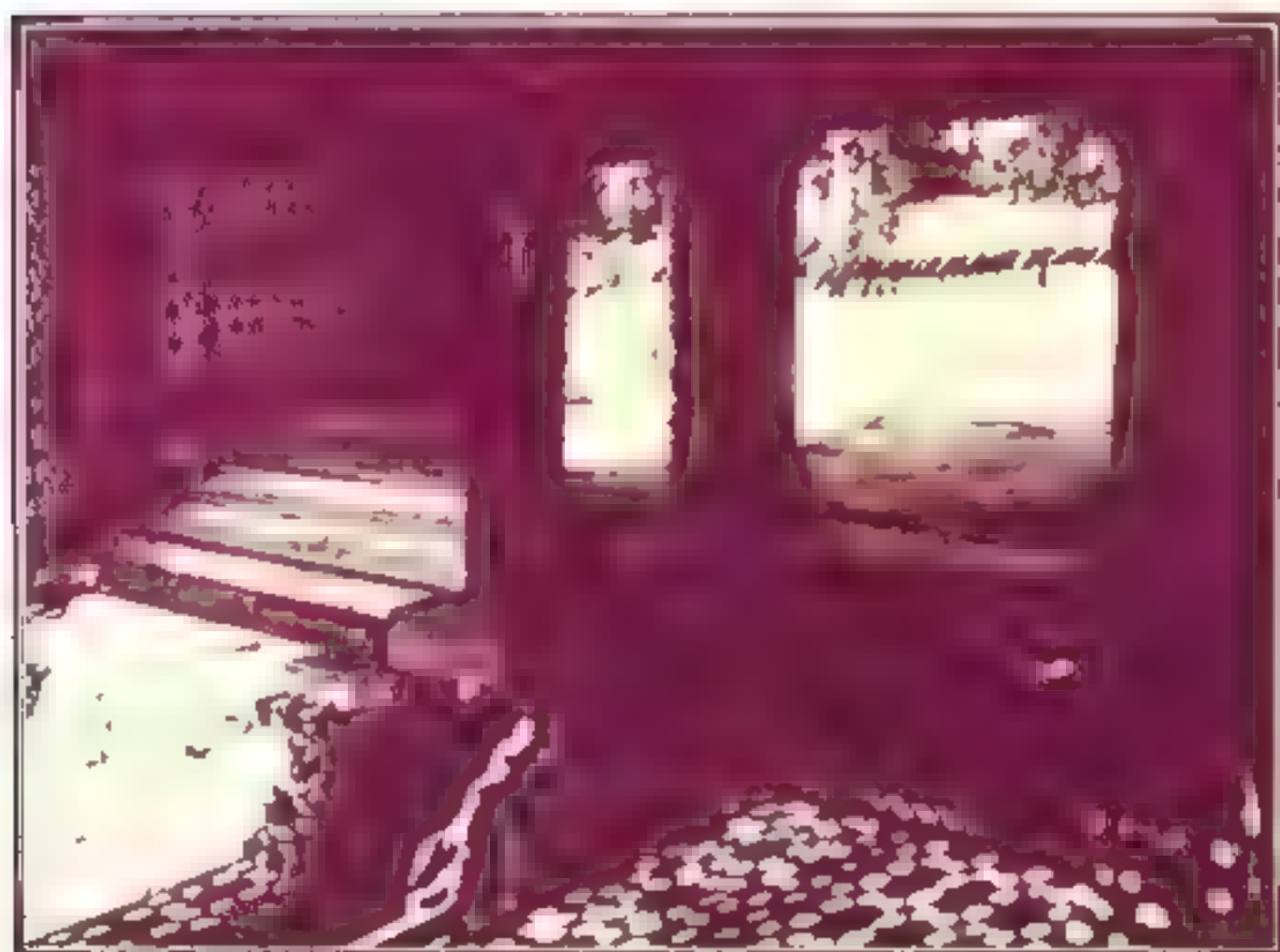
شاہ بیگم ہے۔ جس کا تذکرہ کرچکا ہوں[۱]۔ سب سے آخری یادگار کا حال اب سُن لیجئے کہ یہ بھی ایک عالی مرتبت عورت کی حسین قبر ہے۔ اس زنجیر کی درمیانی کڑیاں ملا دینے کے لئے فرصت، وُسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور توفیقِ ربانی درکار ہے۔ اس کا وقت بھی آنے والا ہے۔ انشاء اللہ۔

زینت النسا ایک ایرانی نژاد بیگم تھی۔ اصفہان کا خاندان تھا۔ ایک بڑے سپوت عالی حوصلہ دلاور فرزند کی ماں۔ جس کا نام مرزا نجف خاں اور خطاب نواب ذوالفقار الدولہ امیر الامراء غالب جنگ تھا[۲]۔ جس نے شجاع الدولہ کی شکست و ہزیمت (۱۷۶۴ء) کے بعد انگریزوں سے مصالحت کرلی تھی۔ اور پہلے تو صوبۂ الہ آباد کا مالکِ جائز تسلیم ہو کر کچھ حصہ پر قبضہ بھی پا گیا تھا، مگر بعد کو دولاکھ پنشن نقد پر قناعت کرنا پڑی تھی۔ وہ ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء) میں شاہ عالم کے ہمرکاب الہ آباد سے دہلی چلا گیا۔ اسی نے جاٹوں سے آگرہ چھینا تھا۔ راجگانِ جے پور وغیرہ کو باج گزار بنایا تھا۔

اسی بیگم کا نامور بھتیجا (ناتی) نواب محمد قلی خاں پسر عزت الدولہ مرزا محسن[۳] نائب صوبہ دار بنگال و بہار دانا بیمہ تھا۔ عالی گوہر شاہ عالم کا وفادار رفیق اور وزارتِ عظمیٰ کا متوقع تھا[۴]۔ ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) سے پٹنہ کا محاصرہ اور انتظام کر رہا تھا۔ وہیں شجاع الدولہ کی تاخت اور الہ آباد پر قبضہ کر لینے اور صوبہ بھر پر متصرف ہو جانے کی خبر ملی۔ ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) میں الہ آباد پہنچا۔ یہاں گرفتار ہوا۔ قید کر کے قلعۂ جلال آباد (مضافاتِ شہر لکھنؤ) کو بھیج دیا گیا۔ ماہِ مبارک رمضان میں بحالتِ تلاوتِ قرآن پاک اس عالم سے رخصت کر دیا گیا۔ قلعہ کے دروازے ایک کچا کنواں تھا۔ نعش اُسی میں ڈال دی گئی۔ بعد کو قبر بنی[۵]۔ شجاع الدولہ کا حقیقی چچازاد بھائی تھا[۶]۔ بلکہ کسی وقت یہ بھی تجویز تھی کہ محمد قلی کو الہ آباد سے بُلا کر اودھ کی مسند پر بٹھا دیا جائے[۷]۔ شجاع الدولہ کا دعوے یہ تھا کہ اُس کے باپ صفدر جنگ نے بطور نیابت محمد قلی کو الہ آباد سپرد کر دیا تھا۔

۱؎ صفحات ۱۲۵ لغایت ۱۴۲۔ ۲؎ متوفی ۱۰ جمادی الآخر ۱۱۹۶ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۷۸۲ء بعمر ۴۶ سال۔

۳؎ مفتاح التواریخ مطبوعہ ۱۸۴۹ء صفحہ ۳۴۰۔ اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری صفحہ ۲۰۲۔ ۴؎ ڈکشنری صفحہ ۱۷۶۔

۵؎ سوانح سلاطینِ اودھ صفحہ ۳۰۔ ۶؎ ایضاً صفحہ ۳۹۔ ۷؎ مفتاح صفحہ ۳۴۰۔ ۸؎ ڈکشنری صفحہ ۹۱۔ ۹؎ سوانح صفحہ ۵۲۔

محمد قلی کو اس سے انکار تھا۔ محمد قلی الہ آباد میں صوبہ دار رہا تھا۔[1] اسکی کثیر املاک یہاں تھیں۔ سید کمال الدین حیدر طباطبائی نے اس کو محمد قلی خانِ شہید لکھا ہے۔[2]

زینت النساء نے ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں انتقال کیا۔ اسی شہر میں دفن ہوئی۔[3] اسی خلفشار اور پس ماندگاں کی دار و گیر اور انتشار و ناداری کے باوجود اس کا نہایت خوبصورت مقبرہ ایک خاص طرز و شان سے تیار کیا گیا۔ احاطہ بہت وسیع تھا۔ گرداگرد پتھر کی دیوار تھی۔ دیوار کے پتھروں پر، ادھر ادھر، نیز خاص عمارت (؟) میں عربی و فارسی کے بہت سے قطعاتِ تاریخ منقوش تھے۔ حسب روایت مسٹر بیل یہاں تین تربتیں (قبریں) تھیں۔ دو پر تاریخ کندہ تھی۔ تیسری سادہ و صاف تھی۔ کچھ لکھا نہیں تھا۔ خود بیگم کا قطعۂ تاریخ یہ تھا۔

چو زینت نسا رفت از دارِ فانی — بفردوس جائے سکونت گرفتہ
بجستیم تاریخِ سالِ وفاتش — خرد گفت جائے بہ جنت گرفتہ ۱۱۲۴

دوسرے مزار (یا قبر) پر۔

ہزار و یک صد و با پنج و ہفتاد — برفت مریم سوئے فردوس دلشاد ۱۱۷۵

فارسی کے اشعار بہ تعدادِ کثیر مع متعدد مادہ ہائے تاریخ کے دیواروں پر باہر کی جانب کندہ تھے۔ سو برس پہلے تک یہ شعر اور مختلف کتبے موجود و مرقوم تھے۔ افسوس ہے کہ بیل صاحب نے سب کو نقل نہیں فرمایا۔ ذیل کی سات بیتیں لکھ کر باقی چھوڑ دی تھیں۔ جن کا آج نہ نشان ہے نہ کہیں یادداشت۔

جبرئیلش ز سرِ صدق و صفا رہبر شد — تاکہ داخل بسرا پردۂ پیغمبر شد
رفت با فاطمۂ بنتِ رسولِ مدنی — گشت ہم صحبت او رست ز دنیائے دنی
روحِ پاکاں ہمہ با طائفۂ حور العین — گشتہ از صدق و صفا خضرِ رہِ خلد بریں
منزلش خلدِ بریں کرد خداوندِ جلیل — خبرم داد ز تاریخِ وفاتش جبریل

---

[1] ڈکشنری، صفحہ ۲۰۲۔ [2] سوانحِ سلاطین، صفحہ ۱۵۔ [3] مفتاح، صفحہ ۵۱۰۔

کز سرِ شعر بکن نقشِ سرِ لوحِ مزار	ولد خلی جنتی از سورۂ والفجر بیار ۱۱۴۲=۱۱۲۳
اندریں ظلمتِ شب خالقِ ستارِ مجید	بضیافت برِ خود زینت نسا را طلبید
ہزار و صد و ہفتاد و چہار ہجرت	رفت از عالمِ فانی بریاضِ جنت ۱۱۷۴

وہ لکھتے ہیں کہ سرِ لوح یعنی لام کے عدد تیس ولد خلی جنتی کے ساتھ جوڑ دئے جائیں تو تاریخِ وفات نکل آئے گی۔ مگر نہ تو (علیہ الرحمٰن) حضرتِ شاعر نے اور نہ بیل صاحب نے لحاظ فرمایا کہ قرآن میں وادخلی جنتی[1] وارد ہوا ہے۔ ولد خلی نہیں۔ صحیح الفاظ کے اعداد صرف ۱۱۲۴ نکلتے ہیں نہ کہ ۱۱۴۳۔

یہ قبرِ پاخاکِ فراموشاں سنگِ سرخ کی شاندار بارہ دری کے اندر موجود ہے، جو گز سوا گز اونچے اور اٹھائیس اٹھائیس گز لمبے چوڑے سنگین چبوترہ پر بنائی گئی تھی۔ چبوترہ سے اس کا فرش نو انچ اونچا ہوگا۔ اس خوبصورت بھری نما عمارت کا ہر ضلع نو نو گز ہے۔ ہر ضلع میں تین تین در ہیں۔ جو نہایت نازک نظر فریب پتھر کی جالیوں سے بند تھے۔ صرف ایک شمال طرف کو بیچ والا آمد و رفت کے لئے کھلا رکھا گیا تھا۔ پتھر کے دوہرے دوہرے (آگے پیچھے) بھاری بھاری مضبوط بارہ پہل کے کھمبوں پر یہ عمارت قائم ہے۔ ان پایوں کی تابیں بھی اُسی مناسبت سے موٹی موٹی زبردست ہیں۔ پُر تکلف و منقش بھی۔ پیالہ دار محرابیں اُس زمانہ کی رائج وضع کے مطابق ہیں، جو آج بھی ویسی ہی اچھی اور پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بوچھار اور دھوپ سے بچانے کے لئے خوب دور تک نکلا ہوا مضبوط مگر سبک چھجا چاروں طرف گھیرے تھا۔ چھت کے پاٹنے میں خاصا تکلف و اہتمام ہوا تھا۔ یعنی ہر چہار جانب سے ستونوں اور محرابوں پر پتھر کے مقوّس و محدّب تختے رکھ کر اس حصۂ بالائی کو اندر سے مربع و مسطح بنالیا اور اوپر سے چونے اور گچ سے بند کر دیا تھا۔ اس سے گنبد یا برج کی ایسی گولائی اور پوری اونچائی تو پیدا نہیں ہونے پائی تھی۔ تاہم مسقف و مشید ہو کر مجموعی کیفیت اندر اور باہر سے یکساں اثر انداز، دل پسند اور

---

[1] سورۃ الفجر، آیۃ ۳۰، پارۂ عم۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۱۸۔

خوش منظر ہو گئی تھی۔

قبر کا چبوترہ (تابوت و تعویذ ملا کر) تین گز لمبا، دو گز چوڑا، ڈیڑھ گز اونچا ہے۔ قبر نہایت مستحکم تھی بارہ دری کے اندر کا فرش بھی خوب مستحکم تھا۔ قبر میں سنگ مرمر کے موٹے موٹے بڑے بڑے تختے جڑے تھے۔ سادہ تھے لیکن شفاف اور جلادار۔ تعویذ ایک ڈال مرمر کا تھا جو سطح و ہموار ہے۔ اس پر نہ تختی کا نشان ہے نہ قلمدان بنا ہے۔ سنگ بالیں پر چراغ دان یا چھوٹا سا طاق ہے۔ بلند تعویذ کے اردگرد، چبوترہ قبر کے مرمریں تختوں میں چوکور سوراخ کچھ کچھ دور پر کھدے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شامیانہ وغیرہ نصب کرنے اور چوبوں کے کام میں آتے تھے۔ میرے خیال میں یہاں چوبیں یا مرمریں کٹہرا لگا ہوگا۔ شاید جیر کٹ کا انتظام بھی رہا ہوگا۔ یہ سوراخ بعد کو کسی دوسرے پتھر سے بند کر دئے گئے ہیں۔

چبوترہ اور بارہ دری کی تجویز اور زمین کی تقسیم اس خوبی و خوش نظری سے کی گئی تھی کہ ہر چیز اور اس کا ہر جزو اور ہر پہلو نو گز کا۔ مقبرہ کا طول و عرض اگر نو نو گز ہے تو اس کے باہر [illegible] کا ہر ایک ٹکڑا اور ہر ٹکڑے کا ہر ضلع نو نو گز کا بن جاتا ہے۔ چبوترہ پر چڑھنے کے لئے چاروں طرفوں میں لمبے چوڑے زینے پانچ پانچ سیڑھیوں کے بنائے گئے تھے جن کے [illegible] جانے والوں کی [illegible] ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔
مقبرہ کی موجودہ حالت یہ ہے کہ [illegible] راستہ سے جا سکے پردہ بند اور تنگ جگہ ہے کی جو اسی قبر کی بدولت اب بھی "بیگم باغ" کہلاتی ہے۔ حالانکہ نہ باغ باقی ہے نہ اس کا وسیع و فراخ احاطہ۔ احاطہ کی دیواروں کا پتہ نہیں۔ سب لمبے چوڑے رقبہ پر مکانات بنگلے یا کسی نہ کسی اور صورت میں یار و اغیار کے تصرف میں ہیں۔ چبوترہ سے ہٹ کر پاؤں رکھنے کو نیچے اتر کر دو دو گز سے زیادہ زمین کسی طرف نہیں چھوٹی ہے۔ ہر سمت محدود و مسدود ہے۔ یہ تنگ حصہ یا جائے مرور بھی گندگی و نجاست سے ناقابل گزر بنتا ہے۔ چبوترہ کے فرش کے پتھر جابجا کھل گئے ہیں۔ اکثر ٹوٹے ہیں کچھ غائب ہیں۔ چبوترہ کے پہلوؤں کی بنیادی دیواریں [illegible] دیواروں پر مستطیل جدولیں اور خوش نما کام تھا۔ یہ پتھر بھی اب ایک دوسرے سے مفارقت کر رہے ہیں۔ چاروں کونوں کے بھاری بھاری پتھر کے ٹکڑوں پر جو سنگ تراشی و نقاشی کی گئی تھی، چھوٹے چھوٹے ملفوف کھمبوں کی شکل میں ہنوز برقرار ہے۔ پتھر کا کٹہرا جو اس فراخ و وسیع چبوترہ کی پوری وسعت پر محیط تھا کہیں اونچا کہیں نیچا۔ اب صرف اسکی نالیاں اور کہیں کہیں سوراخ یا نشان دکھائی پڑ جاتے ہیں۔

بارہ دری کی ستونوں اور محرابوں کے اوپر والے پتھر اور چھجے کے تختے بالکل کھل گئے۔ بہت سے کھل گئے ہیں بعض گر گر ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ اسی طرح گنبد یا چھت کے پتھر ایک دوسرے سے منفصل و جدا ہو رہے ہیں۔ ہشت پہل سنگی منارے جو مقبرہ کے چاروں گوشوں پر ایک وسط میں عین کونے پر اور دو کسی قدر فصل سے ادھر ادھر لگائے گئے تھے اب معدودے چند اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ایک آدھ کے پُر تکلف نقشیں ٹکڑے زمین پر جبہ سائی کر رہے ہیں۔ نیچے سے اوپر اوپر دو دو گز کے قریب اونچی دیوار اُٹھائی گئی تھی اس میں پُر تکلف منقش پتھر زردکاری لگے تھے جس سے عمارت کے سامنے کے بالائی حصہ کا نظارہ اور بھی دلکش ہو گیا تھا۔ یہ اب بھی کم و بیش اصلی حالت میں ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر ہشت پہل کام کنگورا کا تھا۔ پھول پتیاں تھیں۔ اب بھی ہیں۔ چھجے کے سنول پتھر کے ہیں۔ ان میں شامیانہ نصب کرنے، پردے لگانے، رسیاں باندھنے کے لیے چھید موجود ہیں۔ لوہے کے بھاری بھاری کڑے بالفر لگے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لوہا کمیاب اور سونے کی طرح گراں تھا۔ مقبرہ کے اندر اور باہر کچھ ایسی چیزوں کے ٹکڑے جو غالباً کسی اور موقع یا کسی دوسری قبر پر لگے ہوں گے اور کچھ متفرق سامان اور پتھر کے تختے بھی ادھر اُدھر پڑے ہیں۔ بعض پر نفیس کندہ کاری ہے۔ نقش بدنگار ہیں۔ دو دروازوں کو چھوڑ کر باقی کی سب چوڑی اونچی باریک و نازک کام کی جالیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ان کے اجزا بکھر گئے ہیں۔

قبر کا نظارہ سب سے زیادہ رنج دہ اور الم آفریں ہے۔ چونا کئی جگہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ سوراخ اور شگاف ہو گئے ہیں۔ سنگ مرمر کے کئی تختے اکھڑ گئے ہیں۔ کچھ اپنی جگہ پڑے ہیں کچھ ادھر اُدھر منتشر۔ سنگِ بالیں جو سامنے سے سادہ اور پشت کی جانب سے ہشت پہل نادر تراشا گیا تھا معذورانِ شکستہ پا کی طرح سرہانے چت پڑا ہے۔ غرضکہ سارا انتظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ ان سہل الانتقال سریع الانہدام قیمتی اشیا کا کوئی جوہر شناس قدرداں اب تک پیدا نہیں ہوا۔ شاید

طفلانِ شہر بے خبر اند از جنونِ ما — یا این جنون ہنوز سزاوار سنگ نیست؟

اس عمارت کو بنے ہوئے دو سو برس بھی پورے نہیں ہوئے مگر اس کی مجموعی ہیئت اور ظاہری کیفیت اس کو دونی عمر کا بنا کر دکھا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری عمارت نہایت مخدوش، اندیشناک اور سراسر پُر خطر حالت میں ہے۔ قریب انہدام۔ مسٹر بیل! تمہاری گور خنک رہے اور تمہاری کتاب زندہ جس سے اس مقبرہ کی یادگار ہستی پر کچھ دن اور رہ جائے گی۔ ورنہ نہ تو وہ دونوں ترجمے باقی ہیں نہ اُن کے قطعاتِ تاریخ۔ نہ باغ ہے نہ باغ کا احاطہ۔ نہ احاطہ پر کی منقوش تاریخیں[1]۔ رہے نام باقی بس اللہ کا۔

---

[1] مفتاح التواریخ، صفحہ ۵۱۵۔

جامع مسجد

یہ مسجد خسرو باغ سے دور، دریائے جمن کے کنارے، قلعہ کے پاس، پچھم طرف، نوپیدا و نوخاستہ منٹو پارک کے دکھن واقع تھی۔ اس کا ذکر اسی کتاب کے صفحات ۲۱۲ و ۲۲۰ پر کسی دوسرے سلسلہ میں کر چکا ہوں جس سے اس کی مختصر سرگزشت یعنی ابتدائی کیفیت، درمیانی تغیرات و انقلابات اور موجودہ حالت و تباہی کا اندازہ ہوا ہوگا۔ یہ مسجد اس وقت کسی عمارت کی صورت میں باقی نہیں ہے اگرچہ اب تمام ہو چکی تو بھی فی الحال اس کو میری تحقیقات کے محدود دائرہ تحریر سے خارج و باہر رہنا چاہیے تھا۔ ناظرین مرقع اور قاریان کرام عالم تصور میں اس کی تصویر بنا سکتے ہیں۔

۱۲۶۴ھ (۱۸۴۸ء یعنی مفتاح التواریخ کے زمانۂ تالیف) تک مسٹر بیل نے اس کو دیکھا تھا۔ اور اس کا تذکرہ مفتاح میں "جامع مسجد بلدۂ الہ آباد" کے عنوان سے کیا ہے[۱]۔ اور اوریئنٹل بیاگرفی کل ڈکشنری کے اوراق پر بھی اس "کے تھیڈرل ماسک" Cathedral Mosque کی نسبت گل افشانی فرمائی ہے۔[۲]

مسجد کے بانی کا نام ابو طالب مرزا مراد تھا۔ جو اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی[۳] کا پوتا، یمین الدولہ خواجہ ابوالحسن آصف خان[۴] کا بڑا بیٹا اور ان دونوں سے بھی زیادہ مشہور و معروف بیگم نور جہاں کا بھتیجا تھا۔ ہندوستان کی تاریخیں اور دولت تیموریہ کے دفاتر اس کو امیر الامرا عمدۃ الملک خان جہاں بہادر[۵]

---

[۱] صفحہ ۳۴۹، مطبوعہ ۱۲۶۴ھ۔ [۲] صفحہ ۲۵۰۔ [۳] جس کا مفصل حال مآثر الامرا جلد اول صفحات ۱۲۱ لغایت ۱۳۰ میں درج ہے۔ [۴] اقبال نامہ جہانگیری، صفحہ ۲۷۵۔ و۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۳۳۴۔ و۔ بیاگرفی کل ڈکشنری، صفحہ ۵۵۔ و۔ تاریخ معین الآثار، صفحہ ۳۰۔ و۔ تاریخ تاج انگریزی، صفحہ ۲ ملاحظہ ہوں۔ [۵] شاہ جہاں نے خان جہاں بہادر خطاب ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) میں عطا کیا اور شش ہزاری منصب پر ترقی دی تھی۔ منتخب اللباب، جلد اول، صفحہ ۷۵۰۔

نواب شایستہ خاں[1] کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ باپ کے مرنے پر[2] ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں شاہ جہاں نے اس کو منصبِ جلیلۂ وزارت پر مامور و سرفراز کیا تھا جس پر عہدِ اورنگ زیب میں بھی بحال و قائم رہا۔ اس عالی تبار جنرل[3]، منتظم گورنر، دور اندیش مدبّر[4] کی عظیم الشان خدمات، در ملکی و سیاسی یا جنگی کارناموں کے گنانے کا نہ یہاں موقع ہے نہ ضرورت۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز گماشتوں، پرتگالیوں اور مرہٹوں سے اس کو سابقہ پڑا تھا۔ معاملہ و مقابلہ رہا تھا۔ وہی لوگ اس کو اچھے لفظوں میں یاد نہیں کرتے ہیں، نہ ان کے اخلاف وغیرہ ہیں اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں[5]۔

شاید یہ زبان تشنۂ فریاد رہے گی نہ جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی

ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ شایستہ خاں ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) میں الہ آباد کا گورنر تھا۔[6] مجھے اس کے صحیح ماننے میں تامل ہے۔ مُلّا عبدالحمید لاہوری، تعیینِ تاریخ کے ساتھ 'بادشاہ نامہ' میں لکھتے ہیں کہ شایستہ خاں ۱۱ ذی الحجہ ۱۰۳۶ھ (۲۲ فروری ۱۶۲۷ء) کو نظامت صوبۂ بہار سے تبدیل ہو کر صوبہ داری الہ آباد پر بجائے سید عبداللہ خاں بہادر فیروز جنگ کے مامور ہوا تھا[7]۔ اسی طرح خافی خاں کی تحریر سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ شروع جمادی الاولیٰ ۱۰۵۵ھ (وسط جون ۱۶۴۵ء) میں مالوہ بھیجا گیا[8] اور صوبۂ الہ آباد شاہزادۂ بیدار بخت کے سپرد کیا گیا تھا[9]۔

وہ ۱۴ شوال ۱۱۰۵ھ (۳۱ مئی ۱۶۹۴ء) کو ترانوے سال قمری کی عمر میں اس عالم سے رخصت ہوا[10]۔ آگرہ میں جمنا کنارے اپنی بہن ملکۂ جہاں، ارجمند بانو ممتاز زمانی کے شہرۂ آفاق مرقد کی سرزمین

---

[1] ابو طالب کو جہانگیر نے ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷-۲۸ء) میں شایستہ خاں خطاب دیا تھا۔ منتخب اللباب، جلد اوّل، صفحہ ۴۰۰۔ [2] بادشاہ نامہ، حصۂ اول، دورِ دوم، صفحہ ۲۹۶۔ و گنج تاریخ، صفحہ ۲۰۴۔ [3] شاہجہاں نامہ، جلد دوم، صفحہ ۳۴۶۔ [4] ایضاً، جلد دوم، صفحہ ۴۰۵۔ [5] امپیریل ڈکشنری، صفحہ ۲۵۰۔ [6] سابق، جلد ہشتم، صفحہ ۵۰، مطبوعہ ۱۹۰۳ء۔ نیز گزیٹیر جدید، صفحہ ۹۰، مرتبہ ۱۹۱۱ء۔ [7] حصۂ اول، دورِ اول، صفحہ ۲۲۴۔ [8] منتخب اللباب، جلد اوّل، صفحہ ۶۱۰۔ [9] بادشاہ نامہ، حصۂ دوم، صفحہ ۴۳۴۔ [10] اوریئنٹل ڈکشنری، صفحہ ۲۵۰۔ و تحریر الاصلین۔ و گلستانِ مسرت، صفحہ ۹۹، مطبوعہ ۱۲۷۶ھ۔

پر ایک پُر فضا باغ اور نفیس مقبرہ میں پیوند خاک کیا گیا تھا۔ مگر اب وہاں خاک ہی خاک اُڑتی ہے اور نام ہی نام رہ گیا ہے[۱]

شاہ جہانی عہد کی یہ قابلِ نازش یادگار آشوبِ ہندوستان یعنی ۱۸۵۸ء تک قائم تھی۔ نام نہاد پیش بینیوں، دور رسیوں، فوجی مصلحتوں اور جنگی ضرورتوں سے حکومتِ وقت نے گولہ باری اور ڈائنامیٹ بازی فرما کر شہید کرا دیا۔ اس منہدم و مسمار عمارت کے بڑے بڑے مضبوط ٹکڑے اور ٹوٹے ہوئے بُرج و منارے غرقِ آب اب بھی نظر آتے ہیں۔ بعض دروازے بھی کسی قدر بلندی تک نمودار ہیں۔ مسجد کی ہیئتِ مجموعی البتہ مٹ چکی ہے۔ سنگی دیواروں کے برائے نام حاجیا آثار، آب رسانی کے لئے زمین دوز نالیاں، پانی کے بدررو، دریا میں جانے کے لئے سیڑھیاں، تقریباً آدھ میل تک کچھ نہ کچھ موجود ہیں۔ جن سے اس عمارت کی وُسعت و عظمت اور رفعت و شکست کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جاننے والے یہ بھی بتاتے ہیں کہ کبھی یہاں تسبیح خانہ تھا۔ یہ وضو کی جگہ تھی۔ یہاں علماء و صلحا کی فرودگاہیں تھیں، یہاں مشائخ و فقرا کے لئے زاویے، یہاں وارد و صادر کے ٹھہرانے کے ٹھکانے تھے۔ یہ حصہ طالب علموں کے لئے مخصوص تھا۔ اِدھر غسل خانے تھے۔ غرض ہر طبقہ اور ہر فرد کے لئے پوری آسایش اور کامل فراغت کا انتظام و اہتمام تھا۔

ایک کنواں بھی وسیع و مضبوط تھا۔ اُس زمانہ کی تمام ضرورتوں کو بخوبی پورا کرتا ہوگا۔ اب بھی موجود ہے اور اُس کا کتابہ بھی محفوظ۔

تعمیر کا آغاز غالباً ۱۰۵۳ھ (وسط ۱۶۴۳ء) میں ہوا ہوگا۔ ختم ہونے کی نوبت سنہ ۲۰ جلوس یعنی ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں پہنچی۔ قطعۂ تاریخ مسجد کے اندر گنبد کے قریب منقوش تھا۔ اسمیں تیئیس شعر تھے۔ ان میں سے تین شعر تو چونہ گاری کی بدولت مسٹر بیل بھی نہ پڑھ سکے تھے[۲]، نہ کوئی اور اُن کو بتا سکا تھا۔ باقی بیس شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ آخر میں وہ فقرہ بھی ہے جس سے

---

[۱] ڈکشنری صفحہ ۲۵۰۔ [۲] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۶۹۔

نگرانِ تعمیر کا نام معلوم ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کچھ دن بعد اس مسجد کا احوال اور ان اشعار کا بتانے والا یا پتہ دینے والا بھی صفحۂ ہستی پر نہ مل سکے۔

زہے بنائے ہمایوں کہ در الہ آباد — بحکم بادشہِ دین پناہ شد بنیاد
شہے کہ از پئے آرایشِ سریر و کلاہ — چو او زمادرِ ایام ہیچ گاہ نزاد
شہے کہ عام آبائے مسلوئی و سفلی — برادہ دین شرافت چو او نہ آرد یاد
شہِ جہاں کہ بزیرِ نگیں گرفتہ جہاں — چو آفتاب فروزاں ہمیشہ عدل بداد
غبارِ سعیتش می برد نسیم عطا — کسے کہ ناصیۂ صدق را بخاک نہاد
رواج یافتہ دیں در جہاں ازیں مسجد — نکرد خانۂ دیں کس چو بادشہ آباد
کس از شرافت و قدرش نیاورد بشمار — بسطحِ صحنش سقفِ فلک بود ہمزاد
چو خشت ہر بنا ماند بر زمیں معمار — فلک زعرش بپا مدپئے مبارکباد
بلند قدر بنائے کہ بہرِ کسبِ ضیا — بر آستانش مہرِ منیر سر بنہاد
بخلق سنگِ درش عینکِ خدا بینی — زہے صفائیِ دستِ ہنروری استاد
ازیں بنا ید و عالم زباعث و بانی — خداست راضی و سر خدا دکشاد (؟)
بشد زلطفِ الٰہی بایں بنا باعث — ز صدق و سائیِ شایستہ خانِ نیک نہاد
زہے بناؤ زہے باعث و زہے بانی — بہ لطفِ حق ہمہ معمورِ دین و دنیا باد
زچار سوے بنا عفوِ جرم می بارد — زہے شرافتِ بانیؒ و رتبۂ بنیاد
چو دورِ گنبدِ ایں کعبہ دید چشمِ فلک — براہِ حیرت ہمچوں زمیں زپا افتاد
بنہ بسجدہ سر ایں جا کہ فیضِ مسجدِ شاہ — بہ بیں بسنگ چو انساں زبانِ گویا داد
قدم ز سرپئے اتمام ساختی غنی (؟) — چو اہتمام بنامِ من اتفاق افتاد
بہ نورِ دین اندیشہ دلوش تزئین (؟) — نہ ہچو کوہ کن از دستۂ فولاد
بگفت ہاتفِ تاریخ سالِ تعمیرش — بر آستانشِ مہرِ منیر سر بنہاد

۱۰۵۷

ہزار و پنجہ و شش رفتہ بود از ہجرت — کہ دست باز کشید از عمارتش استاد
باتمام مرید فدوی نبایل لله ہو ہوی باتمام رسید۔ فقط

آستان اور مہرِ منیر کے اعداد کے ملانے سے ۱۰۵۰ نکلتے ہیں۔ صحیح سال کے حساب سے ایک بڑھ جاتا ہے۔ اس نقص کے سوا یہ نظم زبان و بیان کی خامیوں سے بھی خالی نہیں پائی جاتی، جن میں سے کچھ نہ کچھ تو کاتبوں اور نقل کرنے والوں کے دستِ فیضِ ونگاہِ کرم کی طرف منسوب و محمول کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اس ہیچ مداں کے نزدیک خود 'آستانِ مہرِ منیر' کسی ایسی رفیع الشان عبادت گاہ کے لئے قابلِ قدر و لایقِ ستایش تاریخ قرار نہیں دی جاسکتی۔ سترھویں شعر سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قطعہ مرزا طاہر غنی[1] کا ہے، جو اُس دور کے ممتاز و نامور شعرا میں تھے۔ لیکن ان کے دیوان میں نہیں ملتا۔ سب سے پرانا نسخہ بھی دیکھ چکا ہوں جو مطبعِ مصطفائی لکھنؤ سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کا نہایت صحیح اور پاکیزہ چھپا ہوا ہے۔ چھاپنے والوں نے اس مجموعہ کی ترتیب و تہذیب میں بڑا اہتمام کیا تھا۔ دیوان کے متعدد قلمی نسخے جمع کرکے سامنے رکھے تھے اور مقابلہ کرکے مکمل و شایع فرمایا تھا۔

ملا غنی کے موجودہ دیوان کو ناقص کون کہہ سکتا ہے، جس کی نسبت مسٹر بیل تحریر فرماتے ہیں کہ محمد علی مرزا ماہر نے ترتیب دیا تھا جو مرزا جعفر معمائی کے متبنّٰی تھے[2]۔ میر حسین دوست سنبھلی راوی ہیں کہ غنی کے اشعار انبار در انبار بلکہ ایک لاکھ تعداد میں تھے، جن میں سے خود ہی چھانٹ کر صرف ایک ہزار رکھے تھے، باقی دریا میں بہا دئے تھے[3]۔ وہی مجموعہ منتخب مرزا صائب کے نذر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نچوڑ میں ہر رطب و یابس یا کم سے کم ایسی تاریخ کی گنجایش کہاں ہوسکتی تھی۔ یہ مسلم ہے کہ ملا صاحب توکین و رنگین تاریخ گو تھے۔ ان کے دیوان میں نیز اُس کے

---

[1] غنی، احمد و نسلاً کشمیری تھے، کشمیر ہی میں رہتے۔ یہ بھی جوان تھے اور ان کی شاعری، شہرت بھی جوان، اٹھارہ سال کی تھی کہ سنہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۹ء) میں ایک عجیب و غریب کیفیت سے وفات پائی۔ 'غنی' تاریخ بے نیاز، اسم بامسمیٰ تھے۔ سروِ آزاد، صفحہ ۱۰۳۔ شمعِ انجمن، صفحہ ۳۴۹۔ بیل کی ڈکشنری، صفحہ ۱۴۲۔ مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۰۹۔ یدِ بیضا قلمی، اوراق ۱۵۴ و ۱۶۸۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۰۹۔ [3] تذکرۂ حسینی، صفحات ۲۲۰ و ۲۲۹۔

باہر ان کی نکالی ہوئیں تاریخیں اچھی اچھی نظر پڑتی ہیں[1] غنی کے اُستاد شیخ محمد محسن فانی تھے۔ وہ اس صوبہ (الہ آباد) میں سالہا سال خدمتِ صدارت پر ممتاز رہے تھے[2] شاہجہاں ان پر بہت مہربان تھا۔ پھر یہ عتاب میں آگئے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ملّا صاحب نے یہ قطعہ اُستاد کی فرمائش وارشاد سے کہا ہو۔

لیکن اگر اس (ستّرہویں) شعر کے پہلے مصرع کی غلطی (بیل صاحب کی ہو یا چھاپنے والوں کی) غلطی مان لی جائے تو یہ قطعہ دو دو جو کس جاتا ہے۔ یعنی "غنی" کی جگہ "فانی" پڑھا جائے۔ مصرع چہارم و شعر کا وزن بھی ٹھیک ہو جاتا ہے اور مادّات بھی صحیح ہو جاتے ہیں۔ "غنی" کا گھر سے نکلنا خواہ کہ از باپ ہو یا ثابت نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے محسن فانی اُس وقت بھی الہ آباد میں موجود [illegible] نام پڑا ہو تو کچھ بعید نہیں۔ فانی کا دیوان مجھے دستیاب نہیں ہوا۔ ورنہ پورا اطمینان ہو جاتا۔ خاصا ضخیم سات ہزار شعر کا بتایا جاتا ہے۔

اگر شاعر کا طباعی اظہارِ نیاز اور شاہانہ عقیدتمندی و وفا کوشی کا جوش نہ سمجھا جائے تو اس قطعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شایستہ خاں نے اس مسجد کی بنیاد از خود نہیں ڈالی تھی بلکہ اس کی تعمیر کے لئے بارگاہ جہاں پناہی سے ایما ہوا تھا۔ اسی لئے شاعر نے کئی جگہ بادشاہ کو باعث اور نواب کو بانیِ تعمیر کے لفظ سے یاد کیا ہے۔

مہتمم تعمیر "خلیل اللہ موسوی" کا حال مجھے کسی کتاب میں نہیں ملا۔ عمدۃ الملک خلیل اللہ

---

[1] گلستانِ مسرت ملقب بہ حدائق المعانی، مطبوعہ ۱۲۷۸ھ، مطبع [illegible] لکھنؤ، صفحہ ۲۰۲۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر نامور فرانسیسی مستشرق شیفر CH. SHEFER نے اپنی کتاب Chrestomathie Persane کے حصہ دوم Tome Second مطبوعہ پیرس، ۱۸۸۵ء میں صفحہ ۲۵۰ پر کیا ہے اور جس سے بذیل "۱۲ اشعار مخطوطہ" بعض تاریخیں نقل فرمائی ہیں۔ (صفحات ۲۰۳ وغیرہ)۔ [2] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۱۱ [illegible]، اورینٹل ڈکشنری، صفحہ ۱۹۳۔

خانِ شاہجہانی[۱] کے حالات پڑھنے کے بعد احتمال ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور بڑے شخص ہوں گے۔ یا شاید 'گنج تاریخ' والے میر خلیل اللہ خاں ولد میر میران نعمت اللہ خاں[۲] ہی ہوں۔ جن کو یہ عروج و مرتبہ اور شش ہزاری منصب بعد کو نصیب ہوا ہو۔ ⊙

ایک حقیقت شناس حق اندیش نے سچ کہا تھا۔

یادِ من در بسِ من فاتحہ خوانم باقی است — گرچہ فانی شدہ ام نام و نشانم باقی است

مسجد باقی نہیں لیکن عوام الناس میں اس کی یاد' اس کے نام سے منسوب گھاٹ کی وجہ سے باقی ہے اور باقی رہے گی۔ جس کا مختصر ساذکر گزیٹر نویسوں نے بھی کیا ہے۔ ریلوں کے نکلنے سے پیشتر مال تجارت کے لانے لے جانے کا کاروبار زیادہ تر نہروں اور دریاؤں کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ ساٹھ برس ہوئے محکمۂ زراعت و تجارت کے قائم ہونے پر اس صوبہ کی (جو اس وقت ممالکِ مغربی و شمالی واودھ سے موسوم تھا) بحری درآمد و برآمد کے بارہ میں تحقیقات کرائی گئی تھی۔ ۱۸۷۸ء کے متعلق مسٹر (بعد ازاں سر) جے بی فلر J. B. Fuller اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ مذکور کی مفصل و مکمل رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے کہ الہ آباد خاص میں جن کے معتبر تین ہیں۔ ایک بلوا گھاٹ۔ دوسرا گوگھاٹ۔ تیسرا جامع مسجد کا۔ اس جامع مسجد والے گھاٹ سے وابستہ چالیس کشتیاں تھیں اور سب سے زیادہ مال یعنی سوا دو لاکھ من سالانہ یہیں اترتا تھا۔[۳] اس کی تائید میں پرانے پرانے گزیٹروں اور رپورٹوں کا حوالہ بھی دیا تھا۔ گھاٹ کی کیفیت و ترقی اور نام کی شہرت ہنوز بدستور ہے بلکہ روز افزوں۔

اس نام کی دوسری یادگار میونسپلٹی کی چونگی چوکی ہے۔ اس کی گرم بازاری و رونق بھی برقرار ہے۔

'مسجد کا ہے چراغ بجھایا نہ جائے گا' ظاہری حیثیت سے مسجد رخصت ہو چکی۔

---

[۱] اوریئنٹل بیاگرفی کل ڈکشنری' صفحہ ۱۴۳۔ [۲] گنج تاریخ یا تاریخ سروری' صفحہ ۲۰۳۔ [۳] ڈسٹرکٹ گزیٹر سابق' صفحہ ۱۱۱' جلد ہشتم' مطبوعہ ۱۸۸۴ء۔ ⊙ تحقیق مابعد۔ میر خلیل تخاطب بہ خانِ زماں' یمین الدولہ آصف خاں کا داماد تھا۔ بہر فن کامل۔ عہد عالمگیر میں پنج ہزاری منصب پر ممتاز اور مالوہ کا گورنر ہو گیا تھا۔ مآثر الامراء و ڈکشنری' صفحہ ۱۲۹۔

نیستی کا سیلاب اُس کے پیکرِ خاکی کو یکسر بہالے گیا، اُس کا ذرّہ ذرّہ تباہی و بربادی کے ہاتھ سے فنا کی نذر ہو رہا ہے۔ لیکن یہاں کی فضائے بسیط میں تسبیح و تہلیل کی صدائیں عالمِ بالا سے گونجی ہوئی اب بھی آجاتیں اور فردوسِ گوش ہوتی ہیں۔ انوارِ الٰہی کی تابش، رحمتِ نامتناہی کی بارش دیکھنے والی آنکھوں کو سرد و خنک رکھتی ہے۔ بے شبہ یہ پرتوے، یہ تجلیاں، یہ تابانیاں اہل اللہ اور اہل دل کے لئے مخصوص ہیں جو روحانی لذّتوں اور پاکیزگیوں سے مالامال ہیں۔ ہم ایسے بے بصر بندگانِ دُنیا کا ان لطافتوں اور نظافتوں میں حصّہ کہاں۔

خستۂ عجزیم و از ما جز گنہ مقبول نیست　　　تکیہ دارد بر شکستِ توبہ استغفار ما

قلعہ

شائستہ خاں کی بے قرار روح کی بے چینی اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب وہ اپنی مسجد کے ویرانہ کے قریب ہی اکبر اعظم کے عظیم الشان قلعہ کو بھی بگڑی اور بگاڑی ہوئی حالت میں پاتی اور اکبر کی روح کو تنگ و غضب میں دیکھتی ہے۔ یہ وہی قلعہ ہے جو شہنشاہ کی ذاتی تجویز و ہدایت سے بنا تھا[1]۔ جس کی بنیاد ڈالنے کے لئے جہاں پناہ کو چار مہینے یہاں ٹھہرنا پڑا تھا[2]۔ جس کی تعمیر و تیاری شاہزادہ ولی عہد مرزا سلیم کی نگرانی میں ہوئی۔ جس کے اہتمام و تکمیل میں شجاعت شعار سعید خاں، مخلص خاں، راجہ ٹوڈرمل، رائے بھارتھ دیوان اور پیاگ داس بخشی نے خون پانی ایک کر دیا تھا[3]۔ جس کی مختصر ابتدائی تاریخ یہ ہے کہ اکبر ۹۸۱ھ ۱۵۷۳ء میں پٹنہ کی مہم پر جا رہا تھا اس مقام (پریاگ) پر پہنچا تو حکم دیا کہ (۱) ایک حصار عظیم الشان قلعہ آگرہ کے نقشہ پر تعمیر ہو۔ اور بنیاد زیادہ ہو کہ چار قلعوں میں تقسیم ہو۔ ہر قلعہ میں محل، مکانات، بالاخانے، خوشنما طرزوں سے مرتب ہوں۔ پہلا قلعہ وہاں ہو جہاں ٹھیک دونوں دریاؤں کی قربت ہے۔ بارہ دری، بارہ خانہ باغ ہوں۔ ہر باغ میں کئی کئی مکانات دلکشا۔ یہ خاص دولت خانۂ بادشاہی۔ (۲) میں بیگمات اور شاہزادے۔ (۳) اقربائے سلطانی۔ ملازم اور اہل خدمت۔ خاص و عام۔ ہنرمندان ہوشمند نے اس کے نقشوں کی تراشیں پیدا کرنے میں ذہن رسا کے کارنامے دکھلائے۔ اور ساتھ ہی ایک کوس طولانی، چالیس گز عریض، چار گز بلند، بند مستحکم باندھ کر عمارتیں تیار کر دیں[4]۔ چالیس برس میں عمارت کا کام ختم ہوا تھا[5]۔ یہ پوری عبارت منشی الملک الاسبحان رائے بٹالوی کی خلاصۃ التواریخ[6] سے ماخوذ بلا حرف بہ حرف ترجمہ ہے۔ ... ایسے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۱۹۵۔ [2] ہنیٹ صاحب کی تاریخ ہندوستان جلد پنجم صفحہ ۳۲۷۔ [3] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۶۶۔ [4] مفتاح التواریخ صفحہ ۹۶۔ [5] دربار اکبری صفحات ۲۲ و ۲۳۔ [6] قلمی، موجودہ کتاب خانہ صمدن، ورق ۱۴۱۔

اسی قلعہ کے تیار ہو جانے پر شاہی مورخ منشی محمد کاظم بن محمد امین نے عالمگیر نامہ میں لکھا تھا کہ "قلعۂ الٰہ آباد در متانت و حصانت شہرۂ ایام است" [۱]۔ خافی خاں نے تحریر کیا تھا کہ "قلعۂ الٰہ آباد باگردون ابد بنیاد ہم اساس است" [۲]۔ میر غلام حسین خان طباطبائی نے لکھا تھا "قلعۂ سنگین آنجا (الٰہ آباد) باکاخ و ایوانہائے دیگر بسعی اکبر بادشاہ افراختہ بود" [۳]۔ مسٹر بیل نے بتایا تھا "در متانت و استحکام نظیرے ندارد" [۴]۔

گردش روزگار سے وہ قلعہ اُن بے درد و ناقدر یا نا اہل ہاتھوں میں پہنچا جنھوں نے اپنے قبض و تصرف کے آغاز ہی سے اُس کو ستیاناس کر دیا اور مسخ و بدنما بنا ڈالا۔ فوجی آئین و قوانین کی داروگیر نیز سرکاری رازوں کے افشا کی مأخذہ گیری و مواخذہ کا اندیشہ ہے۔ پوری تفصیل یا تطویل کے ساتھ لکھنے سے قلم رکتا ہے۔ اس لئے چند معتمدین حکومت ہی کی تحریرات کو مختصر نقل کر دینا قرین مصلحت سمجھتا ہوں۔

سب سے پہلے ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں کرنیل کیڈ (کیٹ) نے اس پر ہاتھ صاف کیا۔ اندر قلعہ کے مکانات گرا کر باقی چیزوں، عمارتوں اور قلعہ کی دیواروں کی صورت و ہیئت یکسر بدل دی۔ مسٹر بیل نے اسی پر داد تحسین دی تھی "راست این است کہ پیش ازیں لائق بزم بود حالا قابل رزم است" [۵]۔ کپتان (بعدہ جنرل) گاڈفرے چارلس منڈی شروع فروری ۱۸۲۸ء میں الٰہ آباد آئے تھے قلعہ بھی گئے تھے۔ اس کو نہایت وسیع و مستحکم بتاتے ہیں۔ دونوں دریاؤں کی کشتیاں اور کشتی راں یہاں سے نظر پڑتے تھے۔ لکھتے ہیں "اکبر نے اس نئے شہر کی بنیاد ۱۵۸۱ء میں ڈالی تھی۔ اس کے نابکار اخلاف کے ہاتھوں سے نکل کر قلعہ انگریزوں کے پنجہ میں ۱۷۶۵ء میں آیا۔۔۔۔ یہیں پر شاہ عالم بادشاہ دہلی سے لارڈ کلایو نے بشرط حفاظت صوبۂ بنگالہ کا قبضۂ قانونی حاصل کیا تھا۔ اس اہم حصار کی قلعہ بندیوں میں کمپنی نے زر کثیر صرف کر دیا۔ اس کو فوجی ذخائر کا ایک بہت بڑا ڈپو بنایا ہے" [۶]۔

مسٹر اسمتھ اور اُن کے ہم قلم رفقا نے ۱۸۷۲ء میں کیفیت یہ بتائی تھی "قلعہ تو اب بھی قائم و برقرار

---

[۱] مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۸ء، صفحہ ۱۲۵۔ [۲] منتخب اللباب، حصہ اول، صفحہ ۱۲۲۔ [۳] سیر المتاخرین، جلد اول، صفحہ ۲۰۔
[۴] مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۹۶۔ [۵] مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۹۶۔ [۶] سفرنامہ، صفحہ ۲۵۲۔

ہے لیکن اس کی خوبصورتی و خوشنمائی رخصت کر دی گئی ہے۔ بقول مسٹر ایچ جی کین زمانہ حال کی تقنین وقلعہ بندی نظر آتی ہے۔ برج و منارے کانٹ چھانٹ دے گئے ہیں۔ اونچی اونچی پتھر کی دیواریں جو خشکی کی جانب تھیں ان کے اوپر گھانس دار فصیلیں قائم کی گئیں اور بھرے بھرے ڈھالو پشتوں سے ڈھانک دی گئی ہیں۔ قلعہ فوجی اغراض کے لئے مستعمل ہے اس لئے حسب قواعد و آئین اس کی تفصیلات نہیں دی جا سکتیں۔[1]

لفٹننٹ کرنیل ایچ آ نیویل کو گزیٹیر جدید میں اقرار کرنا پڑا تھا کہ "یہ قلعہ جب اکبر نے تعمیر کرایا تھا تو آگرہ اور دہلی کے قلعوں کی شان و نمود کو مات کرتا تھا۔ مگر بدقسمتی کہنا چاہئے یا اتفاق وقت کہ اس کی گزشتہ عظمت و شان کے آثار اب کچھ بھی باقی نہیں ہیں...... انگریزوں نے جب اس پر قبضہ کیا تو کوشش کی کہ اس قلعہ کو عصر حاضرہ کا ایک حصن حصین بنا دیں۔ اور اس کی اصلاح و استحکام ووبوں Vauban کے طرز تعمیر و قلعہ بندی پر کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۳۸ء میں یا اس کے قریب ان اصلاحات اور ترمیموں کی تکمیل ہوئی۔ قلعہ کی خوشنمائی و خوبصورتی اور حسن تعمیر کا خون کر دیا گیا۔ برج و منارے کانٹ چھانٹ کر صاف کر دئے گئے...... دریا کے رخ صرف اسی قدر عنایت ہوئی کہ مغلوں کی دیواریں اور فصیلیں دور کر دی گئیں۔ قلعہ کی شان و لطف نظارہ میں بڑا فرق آ گیا۔ جمنا دروازہ بند کر دیا گیا۔ صدر دروازے کی اوپر والی منزلیں گرا دی گئیں...... لارڈ ایلن برا کے نام سے منسوب کر کے بڑی بڑی بارکیں قلعہ کے اندر تعمیر کر دی گئیں...... گورنران الہ آباد کا پرانا محل تبدیل کر کے سلاح خانہ کر دیا گیا۔ بیچ والی عمارت جو مغلیہ تعمیرات اور بود و باش کے مکانات کا نفیس ترین اور عمدہ سے عمدہ نمونہ کہی جا سکتی تھی اس پر بھی عہد جارج کے معمولی طرز کا لیس چڑھا دیا گیا۔ بعد کو لارڈ کرزن کی توجہ و نظر التفات سے یہ عمارت اپنی اصلی حالت پر لائی گئی اور پلاسٹر ہٹا دیا گیا ہے۔ لیکن شاہی محلسرا ہنوز محکمہ ارڈننس کے تصرف میں ہے۔ اس میں سلاح خانہ قائم ہے اس میں مزید رد و بدل اغراض فوجی"

بقول اکبر گردہ راہ کہاں سے کہاں پہنچے۔ خسرو باغ میں بہاروں کا لطف اٹھایا گل افشانیاں دیکھیں۔ شائستہ خانی مسجد کے کھنڈروں پر آنسو بہائے۔ ناصیہ فرسائی کی۔ دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اب قلعہ کی زبوں حالی کا ماتم ہے اور اشک ریزیاں۔

ان نوحہ خوانیوں سے اکتا گئی طبیعت　　پھولوں کی ڈالیوں میں تو سوز خواں یہ کب تک

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر سابق مطبوعہ ۱۸۸۴ء صفحہ ۱۷۵، ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید مطبوعہ ۱۹۱۱ء صفحہ ۲۰۹۔

ہوئے بستان

حال (نومبر ۱۹۳۷ء) میں ایک بہاری اہل قلم حافظ سید عبدالرؤف فاضل اونک آبادی نے نواب داؤد خاں پسر بھیکن خاں قریشی کے حالات کی ضمن میں کسی پرانی بیاض کے حوالے سے لکھا تھا کہ اُنھوں نے الٰہ آباد کی صوبہ داری کے زمانہ میں الٰہ آباد کو گنگا کے سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک نہایت مضبوط، مستحکم پشتہ تیار کرایا تھا اور شہر کے باہر ایک بلند سطح پر خلد آباد کے نام سے ایک نئی آبادی بسائی، اور ایک سرائے، مسجد اور کنواں پختہ تعمیر کرایا تھا۔[1] بادی النظر میں ان دعاوی کی وقعت و حقیقت کسی طبل بلند بانگ کی آواز سے زیادہ ثابت نہیں ہوتی تھی۔ میں ان کو صحیح ماننے سے معذور تھا۔

مرغِ دلِ من نغمۂ داؤد نداند　　آزاد کنیدش کہ نہ مرغِ قفس است ایں

اس لئے میں نے راقمِ مضمون اور نوابِ مرحوم کے اخلاف سے اُس حصۂ بیاض کی نقل کی درخواست کی تاکہ اُس کی مدد و رہبری سے تحقیق و تلاش میں سہولت ہو اور ان چیزوں کی حالتِ موجودہ اور آثارِ باقیہ کا اندازہ کیا جا سکے۔ حافظ صاحب نے عنایت فرمائی شکرگزار ہوں۔ عبارت یہ ہے:۔

"صوبہ داری الٰہ آباد بتغیری میر خاں مقرر شدہ بود۔ چوں در وقتے خاں مذکور سیلے بافراط آمدہ بود کہ تمام شہر را غارت کردہ رفت۔ و ایشاں را بعتاب تمام طلب حضور فرمودند۔ از انکہ در وقت غارت ہر کہ زرے بوکیل ناظم می داد او را در قلعہ می گرفتند و غربا را بعمارت می دادند چوں صوبہ الٰہ آباد متعلق نواب آمد۔ اول پشتۂ محکم برائے محافظت شہر و از آسیب سیلے دریا بستہ۔ و طرح آبادی نو کہ بداں سیل عقرنہ رسانند بنیاد نہادند۔ و بہ خلد آباد موسوم کردند۔ و از بزرگ و دبے نوب ہر یک سراہائے برائے مسافرین ترتیب دادند۔ الحال سرائے احمد خاں مشہور است۔ و ایشاں پسر سوخان خاناں برادر خورد نواب ممدوح بودند"۔[2]

اس بیاضِ فارسی کا عنوان ہے "مؤلفہ نواب حمید خاں نبیرۂ نواب ممدوح ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۳ء"۔

---

[1] رسالہ معارف، نمبرہ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۷ء، جلد ۴۰، صفحہ ۳۹۲-۳۹۳۔ [2] یہ نقل ہے۔ انشا و املا کی صحت کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔

مؤلف تاریخ داؤدیہ نے بھی یہی تفصیلات اسی بیاض سے لے کر اپنے یہاں درج کی ہیں۔[1]

(ترجمہ)۔ نواب داؤد خاں صوبہ داری الٰہ آباد پر بجائے میر خاں کے مقرر ہوئے تھے۔ خان مذکور کے وقت میں بڑا بھاری سیلاب آیا تھا جس سے تمام شہر غارت ہوگیا تھا۔ اس لئے اُن پر بڑا عتاب ہوا اور وہ حضور میں بلائے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ سیلاب کے وقت جو کوئی ناظم کے سو کل کو روپیہ دے دیتا تھا اس کو قلعہ میں لے لیتے تھے۔ غریب غربا غارت و تباہ ہوتے ۔ جب صوبۂ الٰہ آباد نواب کے متعلق ہوا تو پہلے مضبوط پشتہ حفاظتِ شہر اور سیلاب سے بچانے کے لئے باندھا اور ایک نئی آبادی کی بنیاد ڈالی کہ اُسے سیلاب کا نقصان نہ پہنچے۔ اس کا نام خلد آباد رکھا۔ نواب کے بھتیجوں میں سے ہر ایک نے مسافروں کے لئے سرائیں بنوائیں۔ احمد خاں کی سرا اب تک مشہور ہے۔ یہ تیسرے بیٹے خان خاناں کے تھے، جو نواب ممدوح کے چھوٹے بھائی تھے۔"[2]

بیاض کی تحریر واقعیت اور تسلسل واقعات و صحت موقع سے بظاہر خالی، اور سُنی سنائی بلکہ کہی ہوئی باتوں سے مجھے مختلف نظر آئی۔ جاننے والوں کو خلد آباد کے قریب دریا شہر کے اس طرف ہونے پر ہنسی آتی تھی۔ فاضل مقالہ نویس کی تحریر اور اس عبارت میں اختلاف بھی نمایاں تھا۔ اس میں نہ گنگا کا نام لیا گیا ہے نہ شہر کے باہر بلند سطح پر سے خلد آباد کا موقع بتایا ہے۔ نہ نواب کی توجہ سے کسی سرا یا مسجد یا چاہ پختہ بنائے جانے کا ذکر ہے۔ بظاہر ان کے متعلق بحث کرنا فضول تھا تاہم مجھے گوارا نہ ہوا کہ پشتہ اور سرائے متذکرہ کے متعلق تفتیش و تلاش نہ کی جائے۔

یہ مسلم ہے کہ داؤد خاں عہد عالمگیر کا ایک کارگزار و دلاور پنج ہزاری امیر تھا۔ منشی الملک مستعد خان محمد ساقی[3] اور مسٹر بیل[4] کی تحریرات سے پایا جاتا ہے کہ وہ ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں میر خاں معزول کی جگہ

---

[1] مطبوعہ ۱۳۲۸ھ آموختہ مولوی سید محمد ناصر بلگرامی بحوالہ حافظ صاحب۔ [2] اسی آرٹیکل (صفحہ ۲۸۸) معارف سے پایا جاتا ہے کہ احمد خاں، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) میں الٰہ آباد کی نائب صوبہ داری کے لئے نامزد ہوئے تھے۔ اس کے بعد عظیم آباد کی صوبہ داری پر مامور ہوگئے تھے۔ یہ خلف جیون خاں پسر حمید خاں ولد داؤد خاں تھے لیکن بیاض والی عبارت کے ختم پر احمد خاں کو خان خاناں کا بیٹا بتایا ہے اور خان خاناں کو داؤد خاں کا چھوٹا بھائی۔ ظاہر ہے یہ کوئی دوسرے احمد خاں ہوں گے۔ معلوم نہیں کہ ان کا تعلق بھی الٰہ آباد سے کچھ رہا تھا یا نہیں۔ رہا تھا تو کس حیثیت سے۔ [3] عالمگیر نامہ مطبوعہ آگرہ ۱۲۹۰ھ صفحہ ۵۲ و مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء، صفحہ ۱۱۰۔ ماثر عالمگیری۔ [4] اورینٹل بیاگرافی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۰۰۔

برہان پور (خاندیس) سے تبدیل ہو کر گورنری الہ آباد پر آیا تھا۔ مگر اس کے قیام کی مدت اور یہاں سے منتقل ہو جانے کا سال کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ اس زمانہ میں پانچ سات برس کے اندر اندر یکے بعد دیگرے کئی صوبہ دار الہ آباد بھیجے اور جلد جلد ہٹائے گئے تھے۔ قیاس چاہتا ہے کہ داؤد خاں کا قیام تھوڑے ہی دن رہا ہوگا۔

بقول رڈیارڈ کپلنگ میں بھی کہوں گا کہ الہ آباد کو وہ لوگ جان ہی نہیں سکتے جو صرف الہ آباد کو جانتے ہیں۔ یہ باہر کی خبر تھی۔ اس سے نامور۔ مندرجہ مقالہ متذکرہ کی نسبت میں نے احتیاط و کاوش سے تفتیش و تلاش کی تو ایک حد تک صحیح پایا۔ اس کتاب کے آئندہ حصہ میں جب بعد پیمائش و مساحت دریا کے یا شہر کے باندھوں کا ذکر کرکے گاؤ گنگا کے متدعویہ پشتہ کے بارہ میں گزارش کیا جائے گا۔ پرانی تاریخوں سے تو اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے دونوں دریاؤں کے ملنے کی جگہ پر ایک مضبوط قلعہ کی بنیاد ڈالی تھی اور نیا شہر آباد کرکے الہ باس نام رکھا اور ایک مستحکم بند تعمیر کرایا تھا۔ جو طول میں کوس بھر، عرض میں چالیس گز اور بلندی میں چار گز تھا۔ یہ عمارتیں اٹھائیسویں سالِ جلوس میں مکمل ہوئی تھیں۔ "منشی سبحان رائے کھتری[1] اور میر غلام حسین خان طباطبائی[2] الہ آباد کے بسائے جانے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں"..... بجائے اتصال ہر دو دریا قلعہ محکم اساس نہاد، شہرے بتازگی احداث فرمودہ الہ باس نام گذاشت۔ و بندے مستحکم در طول یک کروہ[1] و عرض چہل گز و ارتفاع چار درعہ مقرر گشت۔ و ایں عمارت در سال بست و ہشتم جلوس اکبر باتمام رسید[2]۔ یہی الفاظ مولوی بدایونی کے ہیں۔ [illegible] الہ آباد و تعمیر قلعہ و تکمیل عمارت کی تفصیل کے لئے ابو الفضل علامی کا اکبر نامہ ملاحظہ طلب ہے۔

اہل شہر بوجہ کے سبب تکلف و غلط فہمی سے کہنے لگے۔ سرسری نظر [illegible] خلد آباد کے نام سے کسی دنیٰ بستی کا آباد کیا جانا [illegible] تو دوسری طرف بڑی بھاری [illegible] کی تعمیر کو داؤد خاں سے منسوب سمجھ لینا فاش بلکہ فاحش غلطی ہے۔ خلد آباد اور بڑی سرا دونوں داؤد خاں کے الہ آباد آنے سے اسی نوے برس بیشتر عرصۂ عالم میں قدم رکھ چکے تھے۔ قطعۂ تاریخ جو جہانگیر کے عہد سے یادگار ہے یا تھا (صفحات ۲۷۲ و ۲۷۷) شاہد ناطق ہے۔

بفرمان شہنشاہ جہانگیر کہ زید ملکش از مہ تا بماہی

---

[1] کروہ۔ ایک کوس۔ جو دو ہزار گز مسافت زمین سے مراد ہے۔ گز دو ذراع کا ہوتا ہے اور درعہ [illegible] گز سوا گرہ کا ہوتا ہے۔
[2] سیر المتاخرین [illegible] مطبوعہ نولکشور [illegible]

بناشد ایں سرائے آسماں قدر　　کہ باد آباد خلد آبادِ شاہی [1]

اس میں سرا اور خلد آباد دونوں کا نام اور دونوں کا ذکرِ تعمیر موجود ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی پُرانی تحریرات بھی ملتی ہیں۔ الٰہ آباد کے مشہور پیرِ طریقت اور ہندوستان کے مقبول و عارف ولی اللہ حضرت شیخ محب اللہؒ نے اپنے ایک عزیز دوست و مخدوم کو لکھا تھا "چندروز است کہ فقیر را گونہ وحشت رو دادہ بود بنا بر آں در شہر آرا باغ قرار گرفتہ است کہ اگر وحشت فقیر در ساعتے مرتفع شد چنانکہ می دانند کہ ہمہ را معذور باید داشت..... لیکن چوں در اینجا آرام دید و تن آسانی یافتہ و بے جمیعتی ایں بے فکر در اذہان آشنایاں مقرر و مسلم است آں قرار را برقرار داشت و از تن آسانی فرار نمودہ در ہفتہ یک دو شب در خانہ نیز می باشد و احیاناً سیرِ باغِ خلد آباد نیز می کند۔ و یک دو شب در آنجا نیز می گزراند....." [2] شیخ نے ۹ رجب ۱۰۵۸ھ ہجری (۲۲ جولائی ۱۶۴۸ء) کو رحلت فرمائی تھی [3] اور یہ زمانہ داؤد خاں کے آنے سے بہت پہلے تھا۔

رہی سرا، میر شیر علی افسوس، مؤلف آرائشِ محفل کے زمانہ تک شہر الٰہ آباد میں بارہ سرائیں اور بارہ دائرے تھے [4]۔ صحیح یہ ہے کہ خلد آباد والی سرا سے اسی طرف قریب، (مگر مخالف سمت پر) شہر میں نواب نے بھی ایک سرا یا آبادی کی بنیاد ڈالی تھی۔ پتھر گلی کے ایک گوشہ میں ایک جگہ اب تک سرائے داؤد خاں یا سرائے داؤد کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ اس وقت وہاں کوئی عمارت سرا کی شکل نہیں رکھتی۔ بود و باش کے معمولی مکانات نئے پُرانے بنے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کی روایت بھی یہی ہے کہ نام کے سوا یہاں سرا دیکھی نہیں گئی۔ کبھی یہاں چند خام کوٹھریاں سرا کے طور پر تھیں جو مدت ہوئی ویران ہو گئیں۔ ان پر مکان بن گئے۔ دو پرانے پختہ کنوئیں بھی اسی رقبہ کے اندر تھے جو اب گھروں میں آگئے ہیں۔

ایک پُرانی مسجد بھی باقی ہے۔ مسقف اور معمولی۔ نہ سنگی ہے نہ اس پر کوئی سنگ کتابہ۔ اس سے عالی ہمت نواب کی بلند حوصلگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ سال ڈیڑھ سال کی نظامتِ الٰہ آباد میں نواب اس سے زیادہ کیا یادگاریں چھوڑ سکتے تھے۔ سرائے داؤد خاں اب ایک مختصر سا محلہ ہے جیسا کہ شہر کے بعض اور محلے سرا کے لفظ سے مشہور اور کسی سابق گورنر کے نام سے منسوب پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سرائے میر خاں، سرائے [illegible]

[1] گزیٹیر سابق، صفحہ ۱۹۶۔ [2] مجموعۂ المکتوبات قلمی ضخیم۔ موجودہ کتاب خانہ خانقاہ حضرت شیخ۔ [3] مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۵۵۔ و ... اور بیل، بیاگرافی کل ڈکشنری، صفحہ ۱۹۲۔ [4] صفحہ ۱۲۰۔ و حیاتِ جلیل، حصہ دوم، صفحہ ۲۱، نوٹ ۲۔ [5] گزیٹیر سابق ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۶۹۔

معذرت

وَالْعُذْرُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ - پردیسی لکھنے والا اپنی خدمت انجام دے کر قلم رکھ چکا۔ اپنی پریشان خیالیوں اور کوتاہیوں کا اُس کو احساس ہے اور دل سے تاسف۔ اس نے شہر اور خسرو باغ کے متعلق ہر چیز کے تفحص و تجسس اور تحقیق و تدقیق، بحث و تمحیص میں حتی الوسع پوری کوشش و جانکاہی سے کام لیا ہے۔ جہاں تک کامیاب ہوا قدر شناس دوستوں کا اقبال ہے اور نگاہِ کرم۔ جس حد تک ناکام رہا اس کو اپنی بے بضاعتی اور حرمان نصیبی کے سوا کیا تعبیر کر سکتا ہے۔ راقم سطور ایک طرف اپنی مزمن بیماریوں اور جسمانی شکایات سے معذور تھا، دوسری طرف "جلد اول" کی محدود ضخامت و تنگدامانی سے مجبور۔ بایں ہم تاریخی اطلاعات کے لئے جہاں تک بن پڑا چھان بین کی۔ اوراقِ کتاب میں گنجائش نکالی اور جتنا لکھنا ضروری سمجھا حوالۂ قلم کر دیا۔ زندگی نے وفا کی اور ناتندرستی نے مہلت دی تو یہ کمی وخامی بھی کبھی نہ کبھی پوری ہو جائے گی اور جو کچھ اور معلوم ہو سکے گا، آئندہ جلد وں "تذکرۂ سلطان خسرو" میں گزارش کر دوں گا۔ آرزو ہے کہ وہ دونوں چیزیں اس نقشِ اول سے بہتر صورت میں، مکمل معلومات کے ساتھ پیش ہوں۔ مگر اس وقت اس کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

ایران کے جنگی شاعر فردوسی طوسی نے اپنے کارنامہ کے پورا ہو جانے پر شیخی سے نہیں بلکہ لفظی رجائز کے طور پر فرمایا تھا۔

چنیں نامدارانِ گردن کشاں	کہ دادم یکایک ازایشاں نشاں
ہمہ مردہ از روزگارِ دراز	شد از گفتِ من نامِ شاں زندہ باز
چو عیسیٰ من ایں مردگان تمام	سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

فقیرِ عاجز نے بھی بہت سے گڑے مردے اُکھاڑے ہیں اور تاریخ الٰہ آباد کی طفیل بہت سے نامور گمناموں کو اپنی جنبشِ قلم سے زندہ اور اُن کی یاد کو تازہ کر دیا ہے، وہ جن کو دُنیا بھول چکی اور بھلا چکی تھی۔ والغرض والاعبارات۔ پھر بھی احتمال ہے کہ میں نے بہت سے شہری بھائیوں اور آبادی عزیزوں کو

لے اس پر نہ مجھے فخر ہے نہ نازش ہے

مایوس و ناامید کر دیا ہوگا جو یہ توقع رکھتے ہوں گے کہ ان کے اسلاف کا تذکرہ ان بے حقیقت صفحوں پر کسی نہ کسی پیرایہ میں ضرور آئے گا۔ اور وہ چھوٹی بڑی باتیں جو کچھ عرصہ سے کسی شخص خاص یا خاندان و جماعت کے ساتھ منسوب و مشہور ہو گئی ہیں، اس شکستہ قلم کی مدد سے تختۂ کاغذ پر ثبت ہو جائیں گی۔ ایسے حضرات سے میرا روئے سخن اور عذر یہ ہے کہ اپنے امکان بھر اس سیہ نامہ نے ذاتیات و شخصیات، ہنگامی مناقشات، مقامی اختلافات اور متنازع فیہ روایات و معاملات کو قلمبند کرنے سے احتراز کیا ہے۔ رطب و یابس کو احتیاط سے چھانٹ اور لغویات سے اجتناب مدِ نظر رکھا ہے۔ صرف وہی باتیں سپردِ قلم کی ہیں جن کی کسی تحریر یا کم سے کم متواتر روایات سے تصدیق ہوتی تھی۔

افسوس ہے کہ الٰہ آباد ایسا بڑا اور پرانا بیت العلم جس کی موجودہ شہرت اور تابناک عمر چار سو برس سے کم نہ ہوگی جس کو اپنے اور اپنے کارناموں کے متعلق بہت سے دفتر مرتب و مدون رکھنا چاہیے تھے ایک تاریخ بھی قابل لحاظ پیش نہیں کر سکتا۔ کوئی مستقل کتاب دکھاتا تو درکنار، وہ پرانی تحریرات یا اردو فارسی کے کاغذات جن کو قصوں اور افسانوں ہی میں کوئی نمودار عنصر نہیں رکھتا ہے۔ مجھے مان لینا چاہیے کہ یہ محض میری بدنصیبی و نااہلیت تھی کہ بہت سی تاریخوں کی ورق گردانی کے بعد بھی شہر و اہل شہر کے بارہ میں کوئی کارآمد بلکہ بیکار بات بھی بعض سے اخذ نہ کر سکا۔ بے شبہ ان میں کہیں کہیں گورنروں کے نام ملتے ہیں۔ ایسی فوجداروں، قلعہ کے محافظوں سے بعض اوقات صوبہ داروں کی معزولی و تبدیلی کا بھی پتہ دیا جاتا ہے۔ مگر بے ربط و غیر مسلسل۔ سلطنت کے حریف دعوے داروں اور باپ بیٹوں کے مقابلہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو الٰہ آباد میں بعض صورتوں یا لڑائی سازشوں اور بغاوتوں کے سلسلہ میں وارد ہوئے تھے۔ الٰہ آباد کبھی جونپور اور اودھ میں شامل تھا۔ ڈھونڈنے والے کو ادھر بھی جانا اور مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ شہر کے حالات، اس کی عمرانیت، اس کی ترقی و عروج، رونق و تغیرات کے ذکر سے ان سب کے اوراق یکسر کورے ملتے ہیں۔ مکاتب و مدارس کی بنا اور علوم و فنون کی اشاعت کے بارہ میں قطعاً سکوت و خاموشی ہے۔ نہ یہاں مجالسِ درس و موعظت نظر آتی ہیں نہ طالبانِ علم و ادب کا ہجوم ہے۔ نہ صاحبانِ فضل و کمال کا اجتماع پایا جاتا ہے نہ اربابِ ارادت و ذوق کا ازدحام ہے۔ نہ استفادہ کی وہ نشستیں ہیں نہ افادہ و افاضہ کی تدبیریں۔ یہ صورت ہماری فارسی تاریخوں کی ہے۔ اسی سبب سے کرنل ٹیلر نے یہ رائے زنی فرمائی تھی کہ مسلمانوں کی عملداری کے زمانہ میں کڑے یا الٰہ آباد کی سرزمین نے کسی مشہور مصنف کو پیدا نہ کیا۔[1] میں بھی کہوں گا کہ یہ خیال صحیح ہے۔ بعض مشائخ و فقرا کو

---

[1] [illegible] صفحہ [illegible]

چھوڑ کر کسی نامور انشا پرداز، ممتاز فلسفی یا مورخ یا کسی اور شعبۂ علم و فن کے متبحر فرد کا نام الٰہ آبادی حضرات کی افراد میں نہیں ملتا ہے۔ بعض اہل الرائے یا اہل قلم کے نام جو بعد کو ملتے ہیں دولت برطانیہ کی بدولت ہیں۔

ہاں پریاگ بھی جو ہندوستانی تقدیس و پاکیزگی اور ہندوؤں کی ہزارہا برس کی عظیم الشان تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہے (دیکھئے بتایا جاتا ہے کہ ایک پریاگ مہاتم Prayag Mahatmya کے سوا کوئی ملکی ادبی سرمایہ یا کوئی پرانی سند اپنی عظمت و جلالت کی نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بجائے خود یہ ہی ایک بہت بڑی چیز اور بہت قدیم تالیف ہے۔ اور جو Matsya Purana "متسیہ پران" کے جزو جلیل ہونے کا خود دعویدار ہے۔[1]

رہا یورپین سیاحوں سے جو کچھ میں نے لیا ہے، شاید اس پر خود انھیں حضرات کو اطمینان نہ ہوگا۔ مجھ ایسے مشکوک مزاج کو کہاں تک اعتماد ہو سکتا تھا۔ تاہم ضرورت تھی اور میرا فرض کہ میں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور بقول شیخ شیراز "تمتع ز ہر گوشۂ یافتم" پر عمل کیا ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ ادب و انشا کے شائق اس دفتر پریشان میں اپنے ذوق لطیف کی چیز کم پائیں گے۔ اس کا بڑا سبب خود میری بے کمالی و بے استعدادی ہے۔ دوسرے تاریخ کے قلمرو سے ادب و انشا کا جولان گاہ "قدمے فاصلہ دارد" نہیں، بلکہ بون بعید[2] رکھتا ہے۔ جو ایک مسلّم علمی مسئلہ اور متعارف حقیقت ہے۔ تیسرے، میرے مایۂ نازش فاضل شاگرد کا ارشاد جو عملاً میرا استاد و آموزگار تھا۔ ڈیوہرسٹ مرحوم نے میری حقیر تالیف "حیات جلیل" پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ میں تبصرہ فرماتے ہوئے جہاں کتاب اور مؤلف کتاب اس کے خاندان حتیٰ کہ وطن کی بے حد و نہایت تحسین و ستائش فرمائی تھی، وہاں میرے طرز انشا پر مجھے ان الفاظ میں متنبہ کیا تھا "صرف وہی حضرات جو اردو کی کامل و مکمل معلومات کے علاوہ عربی و فارسی دونوں پر قدرت رکھتے ہوں اس کتاب کو کسی آسانی و روانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے۔ قلق ہے کہ ایسے اشخاص خود ہندوستان ہی میں کم ہوتے جاتے ہیں" آخر میں "وہ تھوڑے سے اہل علم جو سمجھ اور ہم آہنگی کے ساتھ اس کو پڑھنے کی قابلیت رکھتے ہوں اس سے مسرت و تعلیم دونوں حاصل کریں گے"۔[3]

اب کتاب کا اختتام ہے اور لکھنے والے کی انجام پر نظر۔

اجل سُلا دے گی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر
نہ ہم رہیں گے نہ تم رہو گے نہ آہ یہ داستاں رہے گی

---

[1] ڈسٹرکٹ گزیٹیر جدید صفحہ ۱۰۱۔ [2] دوری دراز۔ [3] لندن اکتوبر ۱۹۲۹ء۔

فہرستِ دوم

انڈیکس باحرف وار

الف

(ب)

پ

(ط)

ٹ

چ

ح

خ

د

ڈ

ز

س

ش

(ش)

ع

ق

ک

گ

ل

م

ی

تقیہ بقیہ

عبداللطیف کاتب (الٰہ آبادی)

فہرستِ سوم

ضروری حاشیے اور تاریخی اطلاعیں

۳۱۰۰

کتاب ملنے کا پتہ :-

(۱) کتابستان ۔ الہ آباد۔

(۲) سید ابن احمد رضوی ۔رئیس۔ قصبہ صمدن، ضلع فرخ آباد۔

(۳) سید اولاد احمد صمدنی ۔ دائرہ شاہ رفیع الزمان، یحیٰی پور، الہ آباد۔

(۴) الہ آباد کے کتب فروش ۔